شعلے

ایم اے راحت

ایم اے راحت کے قلم سے ایک اور شہ پارہ

شعلے

شعلے

ایم اے راحت

سلطانہ ایک بے بس اور کمزور لڑکی، جسے پاکستان کی قیمت اپنی عصمت سے ادا کرنا پڑی اور جس کی کوکھ میں بلوائیوں کی درندگی کی نشانی پروان چڑھ رہی تھی۔

رابعہ وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ شرفاء میں رہ سکے اس نے ایثار کی قیمت کچھ ایسے انداز میں چکائی کہ زمانہ دنگ رہ گیا۔

شاہجہانی ایک نیک و پارسا عورت جو اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ پاکستان پہنچی تو اس نے اپنے رسوا کن ماضی کو ہمیشہ کے لئے بھلا کر سلطانہ کو اپنی ممتا بھری آغوش میں سمیٹ لیا پر شرافت کی زندگی اسے راس نہ آئی اور اس کا ماضی ہر موڑ پر اس کا منہ چڑاتا رہا۔

شرافت وہ اپنا بازو کٹوا کر پاکستان پہنچا مگر معذوری بھی اس کے حوصلوں کو پست نہ کر سکی۔

مہر النساء وہ سہاگ کی افشاں اپنی مانگ میں بھرے ایک ایسے جیون ساتھی کی منتظر تھی جسے اب کبھی لوٹ کر نہیں آنا تھا۔

قربت شاہ ایک نیک ولی، جو دنیا سے گذر جانے کے باوجود اللہ کے بندوں کے لئے خیر کا موجب بنا رہا۔

عارض وہ اپنی زندگی کے سب سے کڑے جذباتی امتحان سے گذر رہا تھا۔

قمرو ایک اوباش اور کم عقل نوجوان، جس نے شاہجہانی بیگم کی زندگی کو اتنا تلخ بنا دیا کہ اسے سوچنا پڑا کیا پاکستان اسی لئے بنایا گیا تھا؟

نوشہ میاں بازار حسن کا کمینہ خصلت دلال، جس نے شاہجہانی بیگم اور اس کی بیٹیوں کی پاکیزہ زندگی کو جہنم بنا ڈالا۔

شمسو ایک نکھٹو اور بدتمیز بیٹا، جس کے لئے قربت شاہ کے خزانے کا حصول زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا۔

ایک معصوم اور شریف زادی کی دردناک کہانی، جس نے زمانے کے شرفاء سے منہ موڑ کر بازار حسن کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ بازار حسن کو خیرباد کہنے والی عورت کی کہانی، جو نیکی اور پارسائی کی زندگی کے حصول کے لئے تڑپتی رہی۔ آنسوؤں میں گندھی ہوئی اور خون سے تر بتر ایک دل ہلا دینے داستان۔

شُعلے

ایم اے راحت

ہولناک تاریک رات کے سناٹے فضا پر مسلط تھے۔ تا حدِ نگاہ تھوہر کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جو رات کی تاریکی میں بد ہیت سایوں کی مانند نظر آ رہی تھیں لیکن تاریکی کے باوجود ان جھاڑیوں کی شناخت کی جاسکتی تھی۔ البتہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جو دھبے نظر آ رہے تھے وہ کچھ اجنبی تھے ایسے ہی ایک بڑے دھبے کے نیچے کوئی شے کلبلائی اور پھر ایک کمزور سی نسوانی آواز ابھری۔

''نصیبو.........شمشاد.........پنکھا.........کیوں.........بند.........کر دیا؟ گرمی.........گرمی.........نصیبو' آہ.........آواز ایک خوف بھری چیخ میں تبدیل ہوگئی۔

سڈول مقید بازو جو خون میں ڈوب کر سرخ ہو گئے تھے۔ تیزی سے بدن کا وزن ہٹانے لگے اور پھر ایک اور دردناک چیخ فضا کے سناٹوں میں لہرائی۔ وہ اٹھی دوڑی اور پھر ایک ایسے بدن کی ٹانگوں میں الجھ کر گر پڑی جس کا سر اس کے شانوں پر موجود نہ تھا۔ جس شے پر وہ گری تھی وہ بھی ایک انسانی بدن ہی تھا جس کے دونوں بازو موجود نہیں تھے۔ اجنبی سیاہ دھبے ایسے ہی جسموں کے انبار تھے جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک بکھرے ہوئے تھے اور ریل کی پٹری کی دو لکیریں دو سیاہ ناگنوں کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھیں۔ جیسے ان ناگنوں نے بے شمار جیتے جاگتے انسانوں کو چٹ کر لیا ہو۔

اس کی عمر اٹھارہ انیس سال کے قریب ہوگی۔ خدوخال سے تو کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن بدن کی ساخت بتاتی تھی کہ جوانی ٹوٹ کر آئی ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ تقدیر خون سے سرخ ہوگئی۔

انسانی جسموں کے انبار تھے جو دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ کسے کسے دیکھ کر چیختی۔ چنانچہ ہمت کر کے پھر اٹھی اور بکھری ہوئی لاشوں سے بچ بچ کر گزرنے لگی۔ قدم آگے بڑھ رہے تھے ہوائیں یادداشت کے دریچوں کو کھول رہی تھیں اور اسے سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا اور جو کچھ یاد آ رہا تھا اسے یاد کر کے ایک آواز اس کے حلق سے آزاد ہونے لگی تھی۔ شاید رونے کی آواز واپس آنے والی یادداشت اسے آنسوؤں کے سوا کیا دے سکتی تھی۔

اس کا نام سلطانہ تھا۔ باپ کا نام شہریار خان' باپ کا پیشہ کاروبار' بھائی ایک چھوٹی بہن ماں' خوب صورت بڑا سا حویلی نما گھر' نوکر چاکر' سب کی لاڈلی' سب کی آنکھوں کا تارا۔ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے اور پھر دفعتاً ایک زلزلہ' ایک بھونچال جس میں' آہیں کراہیں' ست سری اکال' جے ہند مارو' ختم کردو' جے بھوانی.......... دونوں کڑیل بھائیوں کی موت۔

آہ میری کمر ٹوٹ گئی۔ آہ میرے بیٹے مارے گئے۔ اب میں یہ بوجھ کیسے سنبھالوں گا۔ شہریار خان نے کہا تھا۔

''بھاگو دوڑو' ہندو آ گئے۔ بھاگو' ایک اور ریلا۔ ایک اور ہنگامہ' تاریکی اور خون آشام تلواریں' بہنوئیوں کی آواز' ماما کی چیخ' چھوٹی بہن کی دردناک چیخ' پھر شہریار خان کے سینے سے ابلتا ہوا خون۔

''سپرد خدا' سپرد خدا' آخری الفاظ اور اب وہ بے سہارا تھی۔ سارا خونی کھیل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ پھر منظر بدلا' ایک اور شیطانی آواز۔

''اوئے جگ دیپے کہاں سے ملی۔''

''کھیت میں پڑی تھی۔''

''واہ گرو دی سونہہ' رس گلہ ہے۔''

''اوئے تو پیٹ بھر کے کھا رس گلے۔ آج تیری دعوت۔''

''بھاؤ ویرو جگد پے اکیلی دعوت نہیں کھاتا۔''

بھیڑیوں کی یلغار ان کی غراہٹیں ان کے نوکیلے دانتوں کی خراشیں' نوکیلے ناخنوں کی چبھن' وحشت و بربریت کا ایک اور دور' کچھ اور آوازیں۔

''اوئے ماں دے نگو۔ یہاں مر رہے ہو ادھر سالے موسوں کا ایک قافلہ نکلا جا رہا ہے۔ اوئے چھیتی کرواوئے۔''

''جے بھوانی' جے ہند۔ ست سری اکال' ہاہا کار چیخیں کراہیں' بھاگو دوڑو۔''

''مسلمان ہے۔''

''ہاں۔''

''کلمہ پڑھ''

''اشهد ان لا اله الا اللّٰه وا اشهد و ان محمد الرسول اللّٰه۔''

''عاشق میاں چادر اوڑھا دو۔ بے چاری کو' پاکستان جا رہی ہو بیٹی؟''

''ہاں پاکستان ...... پاکستان ...... زندہ باد۔'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

''خدا کی نعمت سے منہ نہ موڑو بیٹی۔ یہ لو کھا لو زندہ رہنے کے لیے خوراک ضروری ہے۔''

''اللہ کیسی کیسی شہزادیاں دربدر ہوگئیں۔ ماں باپ کہاں ہیں بیٹی؟''

''پاکستان ...... پاکستان چلے گئے۔'' اس کے حلق سے چیخ نکل گئی اور وہ جی بھر کر روئی۔ ریل چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی۔

''اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ضرور مل جائیں گے۔ ہم کل صبح تک پاکستان پہنچ جائیں گے۔ اب فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ لو تھوڑے سے ستو کھا لو تمہیں اللہ کی قسم۔''

نہ جانے کون مہربان ہستی تھی۔ اس نے ستو حلق میں ٹھونس لیے۔ پانی کے دو گھونٹ پیے اور پھر اس مہربان آغوش میں سو گئی۔ رات کا کوئی پہر تھا۔ ریل رک گئی۔ سخت حبس ہو رہا تھا۔

''الٰہی خیر۔ جل تو جلال تو۔ اللہ مدد مولا مشکل کشا۔''

"جے بھوانی' جے ہندن' ہائے ہائے' بچاؤ' اللہ اکبر' جل تو جلال تو۔ وہ خود ریل سے نہیں اتری تھی کسی نے دھکا دے دیا تھا۔ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہوش آیا۔ گرمی لگ رہی تھی۔ انسانی جسم اس پر انبار تھے۔ ذہن اپنی دنیا اپنے گھر میں تھا اور اس نے نصیبو اور شمشاد کو آواز دے ڈالی تھی کہ انہوں نے پنکھا کیوں بند کر دیا۔ گرمی اس کی کمزوری تھی' بجلی چلی جاتی تو چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتی۔

سب کچھ یاد آ گیا تھا اور اس کے حلق سے رونے کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ قدم بے اختیار اٹھ رہے تھے۔ ریل مردہ انسانوں کو چھوڑ کر جا چکی تھی اور اب ہولناک رات کے مہیب سناٹے میں لاتعداد اعضا بریدہ انسانوں کے درمیان وہ تنہا زندہ تھی۔ نہ جانے کب تک چلتی رہی اور پھر ہواؤں میں پانی کی نمی محسوس ہونے لگی۔ "پانی آہ پانی۔" اس کے منہ سے نکلا اور وہ اس ندی کے کنارے پہنچ گئی۔ زمین پر اوندھی لیٹ گئی اور پانی پینے لگی۔ نہ جانے وہ کتنا پانی پی گئی تھی۔ ایک بار پھر اس پر غشی طاری ہوگئی۔ وہ ندی کے کنارے پڑی رہی۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اسے ہوش آ گیا۔ کچھ لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ہوش آ گیا۔"

"الحمدللہ۔ خود کو سنبھالو بیٹی۔ اٹھو تھوڑا سا سفر باقی ہے۔ ہمت کرو خدا بہتر کرے گا۔"

کسی نے سہارا دیا وہ کھڑی ہوگئی۔ بہت سے لوگ تھے۔ کون تھے' کہاں جا رہے تھے کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ چٹیل بے آب و گیا میدانوں میں سفر جاری رہا۔ سوکھی روٹیاں اور ایسی ہی چیزیں جو زندگی کو آگے بڑھا رہی تھیں۔ پانی کے چند گھونٹ اور بس۔ پھر پاکستان زندہ باد کی آوازیں' سربسجود پیشانیاں' ایک انوکھی سرزمین کی مٹی کی خوشبو جو اپنی اپنی لگ رہی تھی۔ وہ پاکستان آ گئی تھی۔

لٹے پٹے قافلے۔ سب کی کہانیاں دلدوز سب کے چہرے غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے۔ ہمارا خاندان تیس افراد پر مشتمل تھا۔ اب صرف میں زندہ ہوں۔ میرے بھائی' میرے ماں باپ' میری بہن سب یک آواز تھے اسے ان کے درمیان بڑی ڈھارس ملی تھی۔ کوئی تو اس سے مختلف نہیں تھا۔ سب کی ایک ہی کہانی تھی۔ سب زخم خوردہ تھے۔ سب ایک دوسرے کو صبر کی

تلقین کر رہے تھے۔ وہ ان سب کے غموں کا تجربہ کر رہی تھی۔ اس پر تنہا ہی یہ پتا نہیں پڑی تھی۔ تقدیر نے سب کے ساتھ ایک جیسے کھیل کھیلے تھے لاتعداد بے سہارا لڑکیاں کیمپوں میں ماری ماری پھر رہی تھیں اور ان میں سے کسی کی کیفیت اس سے مختلف نہیں تھی۔ ایک درمیانے بدن کی خاتون نے اس سے پوچھا۔

"بیٹی تمہارے ساتھ کوئی ہے؟"

"خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" اس نے حلیمی سے جواب دیا۔

"فکر مت کرو میرے پاس آ جاؤ۔ اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھنا' میری دو بیٹیاں اور ہیں آؤ تمہیں ان سے ملاؤں۔" تب وہ نور جہاں اور ممتاز سے ملی دونوں کے چہروں پر خوف چسپاں تھا۔ آنکھیں ویرانیوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ معمر خاتون کا نام شاہ جہاں تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"سلطانہ۔"

"ماں باپ۔"

"سب میری آنکھوں کے سامنے شہید ہوگئے۔ بہن' دو بھائی' ماں اور باپ' سب کو میری آنکھوں کے سامنے مار ڈالا گیا۔ اب مجھے کسی کا انتظار نہیں ہے کہ وہ آ جائے گا تو میرے سر پر ہاتھ رکھے گا۔" اس کی آواز سسکی بن گئی اور شاہ جہاں نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔

"یہ نور جہاں اور ممتاز میری بیٹیاں ہیں اور آج سے میری دو نہیں تین بیٹیاں ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے گا تو میں اس سے یہی کہوں گی کہ میری تین بیٹیاں ہیں۔"

اس نے نڈھال آنکھوں سے اس سہارے کو دیکھا۔ ڈوبنے والے کو تو تنکے کا سہارا ہی کافی ہوتا ہے۔ شاہ جہاں تو بہت بڑی چیز تھی۔ اس نے اپنے بازو شاہ جہاں کی گردن میں حمائل کر دیئے اور دل کھول کر روئی تاکہ دل کا سارا غبار دھل جائے لیکن یادیں کب دامن چھوڑتی ہیں جن سے بچپن سے جوانی تک کا ساتھ رہا ہو...... ہاں صبر جسے کہتے ہیں وہ ایک مجبوری ہے جب انسان کچھ نہیں کر پاتا تو صبر کر لیتا ہے۔ شاہ جہاں نے اسے خود میں سمیٹ

لیا۔ ممتاز اور نور جہاں بہت اچھی مزاج کی مالک تھیں۔

''سلطانہ کبھی کسی سے یہ نہ کہنا کہ تم ہماری بہن نہیں ہو۔'' نور جہاں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

اس نے ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر سچے دل سے ان میں شامل ہوگئی۔

کیمپوں کی زندگی میں جو ہنگامہ خیزیاں تھیں وہ سب کی نگاہوں سے گزرتی رہیں لیکن شاہ جہاں نے کسی طرح بیگم ارباب سے رابطہ قائم کر لیا پھر ایک گاڑی آئی اور ان چاروں کو لے کر چل دی۔ کسی نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا تھا گاڑی ایک پرانے طرز کی مضبوط اور کشادہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوگئی اور یہاں بیگم ارباب نے مسکراتے ہوئے شاہ جہاں کا استقبال کیا اور تینوں لڑکیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرے پھر وہ انہیں اندر لے گئیں۔ یہ بیگم ارباب کیا تھیں اور شاہ جہاں سے ان کا رابطہ کیسے قائم ہوا۔ سلطانہ کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا تھا۔ لیکن بیگم ارباب کی شخصیت اسے بہت پسند آئی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس بلند و بالا قد و قامت کی مالک۔ سرخ چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، عمر چالیس سال کے لگ بھگ بہت ہی نرم مزاج اور خوش خلق خاتون تھیں۔

''بھئی شاہ جہاں ویسے تو تم میرے سر آنکھوں پر، اتنی بڑی کوٹھی ہے جہاں دل چاہے رہو لیکن میرا اور تمہارا ساتھ اب صرف مہمانوں کا اور میزبانوں کا سا نہیں ہے، تمہیں یہیں نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ میں نے تمہارے لیے انیکسی صاف کرا دی ہے اور وہاں تم انتہائی آرام سے رہ سکتی ہو۔ چنانچہ پہلے میرے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاؤ اس کے بعد میں تمہیں اور تمہاری بیٹیوں کو انیکسی میں منتقل کر دوں گی۔''

یہ سب نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ سلطانہ کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ بیگم ارباب نے ان لوگوں کے لیے فوراً ہی نئے کپڑوں کا بندوبست کیا جو نئے تو نہیں تھے لیکن اتنے عمدہ تھے کہ با آسانی استعمال کیے جاسکیں۔ فی الحال انہی کپڑوں پر گزر بسر کی گئی۔ نہانے کے لیے کئی غسل خانے موجود تھے جن میں بیگم ارباب نے ان سب کو تقسیم کر دیا۔ اس وقت کسی سوال کی گنجائش نہیں تھی لیکن ذہنوں میں لاتعداد سوال تھے پھر دوپہر کا کھانا بھی بے حد پر تکلف رہا اور اس کے بعد بیگم

ارباب انہیں ایک خوبصورت انیکسی میں پہنچا گئیں جہاں تین کمرے تھے۔ غسل خانہ تھا، باورچی خانہ تھا، غرض ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں جن کا اس عالم ہوش ربا میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاہ جہاں نے نماز شکرانہ پڑھی اور پھر کہنے لگیں۔

''خداوند عالم ہر شخص کے لیے سہارے پیدا کرتا ہے۔ ہمیں بیگم ارباب کا سہارا نصیب ہوگیا ہے میں کس زبان سے اپنے رب کا شکر ادا کروں۔ جس نے اس افراتفری کے عالم میں ہمیں سر چھپانے کا یہ ٹھکانہ دے دیا۔ دیکھو بیٹی تم تینوں ہی سے کہہ رہی ہوں کسی کا حق نمک ادا کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ بیگم ارباب نے ہمیں جس حیثیت سے بھی سہارا دیا ہو ہمارا رواں رواں ان کا احسان مند رہنا چاہیے۔ اس کوٹھی کے تمام امور میں ہم لوگ اپنی ذمے داریاں پوری کریں گے اور تم لوگوں کو اب واقعات اور حالات بھلا کر صرف اس بات کا اہل ثابت کرنا ہے کہ تم نمک حلال ہو۔''

اس بات کو تینوں نے گروہ میں باندھ لیا اور اس کے بعد مصروف عمل ہوگئیں۔ کسی مسئلے میں اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ انیکسی میں گھسے رہنا بھی انہوں نے پسند نہیں کیا تھا کہ میزبان کو کہیں یہ احساس نہ ہو جائے کہ آنے والے صرف خود کو مہمان سمجھ رہے ہیں۔ جھاڑ پونچھ صفائی ستھرائی ہر چیز کی دیکھ بھال۔ بیگم ارباب کے ہاں ایک ادھیڑ عمر ملازم تھا اور ایک عورت بھی لیکن ان تینوں لڑکیوں نے یہ نہ سوچا کہ کسے کیا کرنا ہے۔

سلطانہ بھی انہی کے ساتھ مصروف رہتی تھی پھر بعد میں بیگم ارباب کے بارے میں تفصیلات معلوم ہوگئیں۔ ایک دولت مند بیوہ تھیں۔ ارباب صاحب کا انتقال نو سال پہلے ہوا تھا۔ اولاد ہوئی نہیں تھی۔ کاروبار اچھا خاصا تھا۔ بیگم ارباب تنہا زندگی گزار رہی تھیں اور اس عالم میں انہوں نے کسی کیمپ سے کچھ لوگوں کو حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور کیمپ کے دورے کے دوران ان کی ملاقات شاہ جہاں سے ہوگئی تھی۔ شاہ جہاں نے انہیں متاثر کیا تھا اور اپنی تینوں بیٹیوں کا حوالہ بھی دے دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں بیگم ارباب نے شاہ جہاں کو پیش کش کر دی کہ وہ اگر چاہے تو اپنی بیٹیوں کے ساتھ ان کے ہاں پناہ لے سکتی ہے۔ یہ تھی بیگم ارباب کی داستان، سلطانہ شاہ جہاں کی بیٹی کی حیثیت سے بیگم ارباب کے گھر پہنچ گئی تھی اور یہاں اس نے

اپنے آپ کو غموں کے انبار سے آزاد کر کے مصروف کر لیا تھا۔ ذہن کے دریچوں کو سختی سے بند کر لینا ہی مناسب تھا۔ کیونکہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اور یہ اندازہ لگا چکی تھی کہ تقدیر نے جو کچھ سونپا ہے اب اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے کہانی تو بہت لمبی تھی۔ اس کی زندگی کی داستان میں بہت سے کردار تھے لیکن جو نہ رہے ان کی کہانیاں بیان کرنا بھی تو مناسب نہیں ہوتا' چنانچہ اس ماحول میں اس سہارے کو زندگی کی سب سے قیمتی شے تصور کر کے اس نے بھی نور جہاں اور ممتاز کے ساتھ اپنے عمل سے بیگم ارباب کو خوش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور عموماً انہیں بیگم ارباب کی دعائیں ملتی رہتی تھیں۔ بیگم ارباب فطری طور پر بہت نیک خاتون تھیں اور اکثر ان کے ہاں ہفتے میں ایک بار دیگیں وغیرہ پکتیں اور سارا کھانا مہاجر کیمپوں میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان لٹے پٹے بے خانماؤں کے لیے جو کچھ کر سکتی تھیں کرتی تھیں اور اس سلسلے میں انہوں نے دل کے دروازے کھول دیئے تھے۔ ارباب صاحب کا کاروبار یہاں تقسیم سے بہت پہلے جما ہوا تھا اور خوب چل رہا تھا۔ اس لیے روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ ہنگاموں اور تقسیم کے باعث سارے ہی کاروبار چونکہ ٹھپ ہو گئے تھے لیکن بیگم صاحبہ اس سے بالکل متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں اب بھی بے شمار عزیز تھے۔ لیکن ان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی اکثر کیمپوں کے دورے کرتی رہتی تھیں کہ شاید کوئی عزیز ہی مل جائے لیکن اب تک کسی کا پتا نہیں چلا تھا۔

بہر حال خدا سے آس لگائے ہوئے تھیں۔ انہیں کوششوں میں شاہ جہاں مل گئی تھیں اور بیگم ارباب کو کچھ ایسی بھائی تھیں کہ وہ انہیں یہاں لے آئی تھیں۔ پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ بیگم صاحبہ کا انتخاب غلط نہیں تھا۔ شاہ جہاں بہت ہی مہذب اور نرم خو خاتون تھیں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

کاروباری معاملات میں بھی تھوڑی بہت توجہ صرف کرنا ہی پڑتی تھی۔ عارضی طور پر کاروبار بند تھا لیکن کوششیں ہو رہی تھیں کہ وہ پھر سے شروع ہو جائے اور اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش اس کام میں بھی صرف کرنی پڑتی تھی۔ واقعی شاہ جہاں بیگم کے آ جانے کی وجہ سے بیگم ارباب کو بہت سے مسائل سے نجات مل گئی تھی پھر ایک دن اپنے کمرے میں بیٹھی حساب کتاب کے رجسٹر دیکھ رہی تھیں کہ کسی کام سے سلطانہ ادھر آ نکلی۔ بیگم ارباب نے اسے دیکھا تو

مسکراتی ہوئی بولیں۔

''آؤ سلطانہ کوئی کام ہے مجھ سے؟''

''جی نہیں، کوئی خاص کام نہیں میں ایسے ہی نکل آئی تھی۔ کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''تھوڑی بہت الجھنیں ابھی تک میرے سر ہیں حالانکہ جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھے ان الجھنوں سے بھی نجات دلا دے لیکن بعض کام خود ہی کرنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ ٹیڑھے میڑھے رجسٹر ہمیشہ ہی میرے لیے دردِ سر رہے ہیں۔''

''کیا کام ہے میں دیکھ سکتی ہوں؟''

''لو دیکھ لو۔ دو اور دو چار کا چکر ہے۔ یہ کچھ رسیدیں ہیں کچھ اندراجات ہیں یہ بینکوں کا حساب ہے اور ایسی ہی چند چیزیں۔''

سلطانہ نے وہ رجسٹر ان کے سامنے سے ہٹا لیے اور خود ان پر جھک گئی پھر وہ تمام رجسٹروں کا جائزہ لیتی رہی۔

''یہ کام تو میں آسانی سے کر سکتی ہوں۔'' سلطانہ نے کہا۔

''تم یہ سب کر لو گی؟'' بیگم ارباب نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو جو چور کی سزا سو میری۔''

''ارے ارے نہیں' بھئی تم جیسی پیاری بچی کو میں سزا دے سکتی ہوں کر کے دکھاؤ۔ خدا کی قسم اگر تم یہ کر لو تو میری بہت ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور میں تو تمہیں اپنی سیکریٹری رکھ لوں گی۔''

''تو پھر میں آج سے آپ کی سیکرٹری۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا ہے کر کے دکھاتی ہوں آپ مجھے دو گھنٹے کی اجازت دے دیں۔''

بیگم ارباب اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ دل میں خیال آیا تھا کہ نہ جانے ماضی میں کیا رہا ہو ورنہ کاروباری معاملے کو سمجھ لینا اتنا آسان تو نہیں۔ انہوں نے تمام کاغذات اور رجسٹر وغیرہ سلطانہ کے حوالے کر دیئے اور وہ انہیں لے کر انیکسی میں آ گئی۔ بہترین مشغلہ تھا اور یہ مشغلہ اسے باپ کی طرف سے منتقل ہوا تھا۔ شہر یار صاحب بھی کاروباری تھے اور سلطانہ

ان کے کاروباری امور میں ہمیشہ ان کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی اور شہریار کہا کرتے تھے کہ سلطانہ میٹرا بیٹا ہوتی تو میرا کاروبار کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ اس وقت یہ عمل کام آیا تھا۔ سلطانہ انیکسی کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ان رجسٹروں پر جھک گئی اور پھر اس وقت تک اس نے سر نہ اٹھایا جب تک اس تمام رسیدوں کے اندراجات بینکوں کا کام اور تمام چیزیں درج نہ کرلیں۔ اس دوران ممتاز اور نورجہاں اس کے پاس نہیں آئی تھیں۔ اندازہ لگالیا تھا۔ انہوں نے کہ سلطانہ کوئی کام کر رہی ہے پھر ان کاموں سے فارغ ہوئی تو سامنے ہی شاہ جہاں بیگم نظر آئیں اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

''بیٹی کچھ چائے وغیرہ پیو گی؟''

''نہیں امی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔''

''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''بیگم صاحبہ کے کچھ دفتری کام تھے اس سلسلے میں پریشان تھیں میں لے آئی۔''

''اچھا تو تم یہ سب بھی کرلیتی ہو۔''

''جی امی تھوڑا بہت اگر ان کا یہ کام میں نمٹادوں تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔''

''خدا انہیں خوش رکھے اگر لکھنے پڑھنے کے معاملات ہوا کریں تو تم سنبھال لیا کرو باقی کام یہ کرلیا کریں گی۔''

''جی بہتر امی۔'' سلطانہ نے خوشی سے کہا اور تمام رجسٹر لے کر بیگم ارباب کے پاس پہنچ گئی۔ وہ آنکھیں بند کیے ایک صوفے پر دراز تھیں۔ سلطان کو دیکھ کر چونکیں اور اس کی بغل میں دبے رجسٹر دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''کیوں الجھ گئی کہیں؟''

''نہیں بیگم صاحبہ کام ختم کرلیا ہے میں نے۔''

''دکھاؤ ذرا۔'' بیگم ارباب نے کہا اور سلطانہ نے ایک ایک رجسٹر کھول کر رسیدوں کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دیئے۔ بیگم ارباب رجسٹروں پر جھک گئی تھیں۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا پھر انہوں نے فرط مسرت سے سلطانہ کو گلے لگالیا۔

''یوں لگتا ہے خدا نے ساری نعمتیں ایک ساتھ ہی میرے پاس بھیج دیں۔ تو تم بھی بڑی کاروباری ماہر ہو یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا؟''

''ابو سے۔'' سلطانہ کی آواز میں آزردگی آگئی اور بیگم ارباب اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں پھر بولیں۔

''نورجہاں اور ممتاز نے بھی کچھ پڑھا ہے یا تم ہی......''

''نہیں وہ دونوں نہیں پڑھ سکیں۔'' سلطانہ کو تھوڑی دیر قبل ہی کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے تھے جو شاہ جہاں نے کہے تھے۔ ورنہ شاید وہ الجھ جاتی بہر طور اس سلسلے میں بیگم ارباب نے مزید چھان بین نہیں کی تھی اور مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم نے یہ سارے کام درست انداز میں کرلیے تو پھر تم ہماری سیکریٹری۔''

''تو پھر میرا تقرر ہوگیا۔'' سلطانہ خوشی سے بولی۔

''فوراً ہوگیا اب اس سلسلے میں یہ سوال مت کرنا مجھ سے کہ میں تمہیں معاوضہ کیا دوں گی۔''

''معاوضے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ آپ نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ ہماری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے ورنہ تقدیر میں کہاں کہاں کی ٹھوکریں لکھی ہوتیں۔'' سلطانہ نے نمناک لہجے میں کہا۔

بیگم ارباب اس کا شانہ تھپتھپانے لگیں۔ وقت اسی انداز سے گزرتا رہا اور پھر تقریباً دو ماہ ہوگئے۔

اس روز بیگم ارباب کے ہاں کچھ مہمان آئے تھے۔ ان کے لیے خصوصی طور پر انتظامات کرائے گئے تھے اور بیگم ارباب ان کی آمد سے بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ آنے والوں میں ایک معمر شخص تھے جن کے بال ان کے چہرے اور عمر کی مناسبت سے کچھ زیادہ سفید تھے۔ ایک خوش شکل خاتون تھیں جو قدرے فربہی کی جانب مائل تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی تھی اور ایک خوبصورت نوجوان یہ چھوٹا سا خاندان کافی خوش حال معلوم ہو رہا تھا۔ بیگم ارباب نے

بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا تھا۔

''خدا کا احسان ہے انور بھائی کہ کسی اپنے کی شکل دیکھنا تو نصیب ہوئی' میری تو آنکھیں ترس رہی تھیں کہ کوئی اپنا آئے۔ آج آپ لوگوں کو یہاں دیکھ کر کتنی خوش ہوں بیان سے باہر ہے۔'' بیگم ارباب نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

''تنویر یوں سمجھ لو خدا کا حکم تھا کہ بہتر حالت میں پہنچ گئے۔ کچھ ایسے ساتھی مل گئے جو صاحب اختیار تھے۔ چنانچہ خدا کے فضل سے کوئی دقت نہ ہوئی اور بذریعہ ہوائی جہاز ہم یہاں تک آ گئے۔''

''انور بھائی' اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے آپ کو بخیریت پہنچا دیا۔ یہاں تو جو کچھ دیکھنے کو مل رہا ہے وہ اتنا دردناک ہے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔'' بیگم ارباب نے کہا۔ بڑا پر مسرت سماں بن گیا تھا۔

سلطانہ کسی کام سے جھجکتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور بے اختیارانہ انداز میں مہمانوں کو سلام کر ڈالا۔ مہمانوں کی آمد کا اسے بھی علم تھا۔ سلام کرتے ہوئے اس کی نگاہیں انور صاحب پر پڑیں اور وہ پتھر کی مانند ساکت رہ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید ہیجان کے آثار نظر آنے لگے اور اسی وقت انور صاحب کے ساتھ موجود معمر خاتون کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

''ارے میری سلطانہ۔'' اور اس آواز پر انور حسین بھی چونک پڑے۔ لڑکی بھی ان کا ساتھی نوجوان بھی۔ بیگم ارباب حیران رہ گئی تھیں۔ انہوں نے سلطانہ کا چہرہ دیکھا پھر انور حسین کا اور ان کے چہرے پر ایک معنی خیز کیفیت پھیل گئی۔ بیگم مہتاب انور حسین بے اختیارانہ انداز میں اٹھیں اور انہوں نے آگے بڑھ کر سلطانہ کو گلے سے لگا لیا۔ سلطانہ کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ بلکتی ہوئی مہتاب بیگم سے لپٹ گئی۔ سب لوگ متحیرانہ نگاہوں سے یہ عجیب منظر دیکھ رہے تھے اور بیگم ارباب تصویر حیرت بنی کھڑی تھی۔

شرافت حسین کی کہانی بھی ان لاکھوں بے خانماؤں کی کہانیوں سے مختلف نہیں تھی جو سرزمین پاکستان کے نام کو چومتے ہوئے وطن پہنچے تھے۔ یہ اس زمین کی کشش تھی کہ صدیوں کا دیس چھوڑتے ہوئے کوئی دکھ نہیں ہوا تھا اور وطن میں قدم رکھ کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو گئے ہوں۔ پیار کے جذبوں کے اس سفر میں کیا کھویا کیا پایا یہ ایک طویل اور غم ناک داستان ہے۔ اس بارے میں بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جب سفر کا آغاز کیا تھا تو پورا خاندان ساتھ تھا۔ باپ' ماں' دو بھائی' ایک بہن اور جب وطن میں قدم رکھا تو تنہا تھے اور ایک بازو سے محروم ہو چکے تھے۔ راستے میں بچھڑ جانے والوں کے غم سے سینہ فگار تھا لیکن یہاں ملنے والے دوسرے لوگوں کی کہانیوں نے یہ تسلی تو دی تھی کہ بچھڑنے والے بھٹک نہیں رہے بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے شہید ہو چکے ہیں۔ وہ خود کیوں زندہ رہ گئے تھے یہ نہیں جانتے تھے موت انہیں چھوتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی اور وہ حسرت سے اسے تکتے رہ گئے تھے کہ یہ کیا ستم ظریفی ہے۔ سب کے ساتھ ہی چلے جاتے تو کیا برا تھا۔ لیکن اللہ کا حکم اللہ کا قانون۔

کیمپ میں انہیں رابعہ خاتون ملیں۔ ان کی طرح تنہا' بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں خوف منجمد' گلاب کی پتیاں مرجھائی ہوئی' سفید چمکتا رنگ' پیلاہٹ کا شکار' لباس کی بوسیدگی بے کسی کی مظہر' جگہ جگہ سے کھل جانے والے بدن کو ڈھانپنے کی ناکام کوششوں میں معروف' شرافت حسین کو ہسپتال سے چادر ملی تھی جس میں ان کا کٹا ہوا بازو چھپا رہتا تھا۔ انہوں نے چادر اتار کر رابعہ خاتون پر ڈال دی۔

''نہیں مجھے' مجھے نہیں چاہیے' واپس لے لو یہ واپس لے لو۔ خدا کے لیے واپس لے لو۔ یہ میرا پاکستان ہے۔ یہ ہمارا پاکستان ہے۔''

''تمہارا لباس پھٹا ہوا ہے۔'' شرافت حسین نے کہا۔

''خدا کے لیے نہیں' یہ لے لو تمہیں خدا کا واسطہ میں اس کے بدلے تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔''

''میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا۔''

''کیا!'' رابعہ بیگم جیسے حیران ہو گئیں۔

شرافت حسین آگے بڑھ گئے تھے۔ جب وہ دور نکل کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو

رابعہ بیگم نے پوری چادر بدن کے گرد لپیٹ لی۔

کئی دن کے بعد اسی کیمپ میں جب ڈاکٹر شرافت حسین کے کٹے ہوئے بازو کی مرہم پٹی کر رہا تھا تو اس نے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے یہ زخم کسی کپڑے سے ڈھک لو خراب ہو رہا ہے۔''

''جی۔'' وہ آگے بڑھ گئے۔ دوا کی شیشی اور گولیوں کی پڑیاں لے کر آگے بڑھے تھے کہ رابعہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

''یہ چادر لے لیجیے۔ بازو پر ڈال لیجیے۔ شرافت حسین چونک کر پلٹے۔

''ارے تم' کیا بے وقوفی ہے چادر اوڑھ لو۔''

''مجھے دوسرے کپڑے مل گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے آپ سے زخم ڈھکنے کے لیے کہا ہے آپ یہ چادر لے لیجیے۔''

تب تھوڑی سی تکلیف اور کرو اسے میرے بازو ل پر ڈال دو۔''

رات کو بخار اور تیز ہو گیا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے پانی کا نلکا بہت دور تھا۔ پیاس کی شدت بڑھ گئی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ کسی نے پاؤں پکڑ کر ہلایا۔

''سو رہے ہیں؟'' ایک شیریں آواز ابھری اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں دھندلی ہو رہی تھیں۔ دماغ میں بھی سنسناہٹ تھی۔ تاہم انہوں نے خود کو سنبھالا۔

''کون ہے؟'' وہ بوجھل آواز میں بولے۔

''یہ چائے۔'' آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی شرافت حسین کو سہارا دینے کی کوشش کی گئی۔ وہ اٹھے تو گرم چائے کا پیالہ ہاتھ میں آ گیا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھ سے پیالہ پکڑ لیا۔

''تھوڑی سی ڈبل روٹی بھی کھا لیں۔ یہ نقصان نہیں دے گی۔''

شرافت حسین کے حواس جاگنے لگے۔ پھر انہوں نے رابعہ بیگم کو دیکھا۔ ''اچھا تم ہو۔''

''تھوڑی سی ڈبل روٹی لے لیں۔'' رابعہ بیگم نے کہا۔

''اچھا' بہت شکریہ۔'' انہوں نے دوسرا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی اور ان کے حلق سے کراہیں نکل گئیں۔ اسی وقت ڈبل روٹی کا ٹکڑا چائے میں ڈبویا ہوا ان کے ہونٹوں سے آ لگا اور انہوں نے منہ کھول دیا۔ چند لقمے اسی طرح ان کے حلق سے اترے اور پھر انہوں نے چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لے کر پیالہ خالی کر دی۔

''دوا کہاں ہے آپ کی اب دوا لے لیں۔''

''اوہ ہاں دوا۔''

''یا اگر چاہیں تو میں آپ کو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔ رات آپ کی حالت کافی خراب تھی۔'' رابعہ بیگم نے کہا۔

شرافت حسین خاموش ہو گئے۔ ان پر ایک عجیب اثر ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے تھے البتہ ان کی آنکھوں سے دو آنسو ضرور ٹپکے تھے۔ انہیں دوا کھلائی گئی اور ان کے سر کے نیچے تکیے کے طور پر ایک اینٹ رکھ دی گئی۔ شرافت حسین پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ بدن میں جیسے کسی نے گرم گرم کیلیں ٹھونکنا شروع کر دی ہوں پھر یہ غنودگی گہری ہو گئی اور اس کے بعد انہیں ہوش نہ رہا۔ عالم بے ہوشی میں بھی وہ شاید خواب دیکھتے رہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی ناک کے نتھنوں میں نلکیاں لگی ہوئی ہیں اور وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہیں پھر انہوں نے قریب کھڑی ہوئی رابعہ بیگم کو دیکھا۔ دوسرا خواب انہوں نے پھر دیکھا۔ رابعہ بیگم چمچے سے انہیں پانی پلا رہی تھیں۔

پھر وہ یکلخت بیدار ہو گئے اور حیرت زدہ نگاہوں سے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ کیمپ نہیں تھا بلکہ ہسپتال وارڈ تھا تمام ہی بستر بھرے ہوئے تھے اور ان پر بیمار موجود تھے۔ بیشتر ایسے تھے جن کا کوئی تیماردار نہیں تھا لیکن رابعہ بیگم شرافت حسین کے پاس تھیں۔ بازو کے زخم میں بھی اب کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی چیز کم ہو گئی ہے۔ کمی کا احساس تو نہیں مٹا سکتے تھے لیکن تکلیف کی وہ شدت جسے انہوں نے ہر عالم میں برداشت کیا تھا اب ناپید ہو گئی تھی۔ انہوں نے حیرت زدہ نظروں سے رابعہ بیگم کو دیکھتے ہوئے

کہا۔

''میں یہاں کیسے آ گیا؟''

''اس دن آپ کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹروں سے بات کی تو انہوں نے آپ کا معائنہ کرنے کے بعد آپ کو ہسپتال بھجوا دیا۔''

''اس دن؟ کیا مطلب؟ کیا میں کئی دن سے ہسپتال میں ہوں؟''

جواب میں رابعہ بیگم کے خشک ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ دودھ جیسا سفید کتابی چہرہ کسی پھول کی طرح کملایا ہوا' آنکھوں کے گرد سرمئی حلقے' بالوں میں اٹی ہوئی مٹی کی تہیں' میلا کچیلا لباس' لیکن وفا کی تصویر' ایثار و قربانی کا ایک بے مثال مجموعہ' ان کے سامنے تھا۔ خشک ہونٹوں کی مسکراہٹ چند لمحات کے بعد معدوم ہو گئی۔

''سترھواں دن ہے آپ کو یہاں داخل ہوئے۔''

''اور تم.........تم؟''

جواب میں رابعہ بیگم کی سوالیہ نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئی تھیں۔

''جی کیا کہہ رہے تھے آپ؟'' نغمگیں آواز ابھری۔

''تم.......تم......میرا مطلب ہے سترہ دن سے یہاں ہو؟''

''جی ہاں' آپ کی تیمارداری کر رہی تھی۔ لیکن خدا کے لیے اب رونا نہ شروع کر دیں۔ اس دن آپ نہ جانے کیوں رونے لگے تھے اور اس کے بعد آپ کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔''

''نہیں' اب میں رونا نہیں چاہتا لیکن تم نے' تم نے......'' شرافت حسین نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بہتر تو یہ ہے کہ آپ آرام کریں۔ کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟ بھوک تو نہیں لگ رہی آپ کو؟''

''نہیں۔'' شرافت حسین گلا صاف کر کے بولے اور ایک بار پھر ان کی نگاہیں رابعہ بیگم کی جانب اٹھ گئیں۔

''میں تمہیں اس ایثار اور قربانی کے صلے میں کیا دے سکوں گا؟''

''جن حالات میں ہم لوگ جی رہے ہیں۔ کیا ان میں صلے کا تصور ضروری ہے؟''

رابعہ بیگم کے سوال نے انہیں چونکا دیا۔ ماضی کی ہواؤں کا زوردار تھپیڑ پھر سے انہیں چھوتا ہوا گزر گیا۔ اپنوں کا تو اب صرف تصور ہی باقی رہ گیا تھا۔ حقیقتاً یہ غیر لڑکی اگر ان کے لیے کچھ نہ کرتی تو زیادہ سے زیادہ لوگوں میں یہ چہ مہ گوئیاں ہوتیں کہ ایک بے چارہ اور مر گیا۔ رابعہ نے درحقیقت ان کی زندگی بچائی تھی۔

''لگتا ہے سارے زخم رفتہ رفتہ بھر رہے ہیں۔'' شرافت حسین نے بازو کی جانب دیکھا اور رابعہ کی گردن جھک گئی۔

''تمہارا تو نام بھی نہیں معلوم مجھے۔''

''پورا نام رابعہ بیگم ہے۔''

''میرا نام شرافت حسین ہے۔'' ایک درخواست کروں تم سے۔ تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو میں تمہاری تیمارداری میں لگ جاؤں۔'' شرافت حسین نے یہ کہہ کر چاروں طرف نظر دوڑائی تو ان کو احساس ہوا کہ یہ مردانہ وارڈ ہے وہ آرام کیسے کر سکتی ہیں۔

''آپ میری طرف سے فکرمند نہ ہوں۔ میں مضبوط اعصاب کی مالک ہوں اور پھر اب چند روز کی بات ہے۔ ویسے بھی میں کمر سیدھی کر ہی لیتی ہوں۔''

''رابعہ اگر تم چاہتی ہو کہ میں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں تو اس کے لیے تمہیں میری ایک بات ماننا ہو گی۔''

''جی۔'' رابعہ بیگم نے پوچھا۔

''تم اطراف کے ماحول کو بھول کر بس خاموشی سے یہ چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔''

رابعہ بیگم نے ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر وہی مدھم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

رابعہ بیگم بینچ پر سونے کے بجائے ایک خالی جگہ زمین پر چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ شرافت حسین نے انہیں شب بخیر کہا تھا اور اس کے بعد سوچوں کے دائرے پھیلتے اور سکڑتے

رہے۔شرافت حسین کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا طوفان گزرتے رہے تھے۔

ہسپتال میں باقی تین دن رابعہ بیگم کی رفاقت میں گزرے تھے اور شرافت حسین نے خاص طور سے یہ خیال رکھا تھا کہ ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلنے پائے جو رابعہ بیگم کے لیے باعث دل شکنی بن جائے۔ابھی ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ انہیں اس پناہ گاہ سے نکالا جائے گا لیکن ہوش آنے کے چوتھے دن صبح کو ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا۔انہوں نے شرافت حسین کے زخم کو دیکھا اور پھر ان میں سے ایک ڈاکٹر نے کہا۔

''آپ اب بالکل ٹھیک ہیں جناب' چنانچہ آپ کو ہسپتال سے رخصت کیا جاتا ہے۔ آپ کے بازو کا زخم بالکل درست ہو چکا ہے۔ہم یقیناً آپ کو یہاں کچھ دن اور رہنے دیتے لیکن ہسپتال میں ابھی بستروں کی تعداد بہت کم ہے۔باہر برآمدے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ بہتر یہ ہوگا کہ اب آپ اپنے لیے کوئی دوسری جگہ تلاش کر لیں۔''

''ڈاکٹر کے یہ مختصر الفاظ کیسے جان لیوا تھے۔دونوں کا دل جانتا تھا۔شرافت حسین نے صبر وسکون کے ساتھ یہ الفاظ سنے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

'''بہتر ڈاکٹر صاحب ظاہر ہے یہاں یہ بستر ابھی دوسروں کے لیے ضروری ہے۔ بہت بہت شکریہ۔''

ڈاکٹر صاحب نے انہیں کچھ دوائیں لکھ کر دے دیں اور شرافت حسین وہ پرچہ اپنی جیب میں رکھ کر وہاں سے نکل آئے۔رابعہ بیگم ان کے ساتھ تھیں۔ہسپتال کے باہر کی دنیا ایک ویرانے کی مانند تھی۔جس میں ان کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔شرافت حسین وحشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔اس شہر میں جس کی زمین ان کے لیے مقدس تھی۔ان کی اپنی پناہ گاہ کہاں ہو سکتی ہے؟رابعہ بیگم بھی رک رک کر آگے بڑھ رہی تھیں۔راستے معلوم نہیں تھے۔کچھ عمارتیں فاصلے فاصلے سے نظر آ رہی تھیں اور ان کے درمیان چلتے پھرتے لوگ دکھائی دے جاتے تھے۔ہسپتال کی طرف لائے جانے والوں کی تعداد البتہ کافی تھی۔شرافت حسین رابعہ بیگم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے دونوں ہی خاموش تھے۔کوئی کسی سے کیا کہتا؟ کافی دیر تک وہ چلتے رہے اور پھر ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر رک گئے۔

''آؤ رابعہ بیٹھ جاتے ہیں تھوڑی دیر۔''

رابعہ بیگم نے ان سے انحراف نہ کیا اور شرافت حسین ان کے ساتھ درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔نہ جانے ان کے دل پر کیا بیت رہی تھی۔نہ جانے زبان پر کیا کیا الفاظ تھے؟ لیکن ایک دوسرے کے جذبات کا پاس کیا جا رہا تھا۔

''اب آپ کہاں جائیں گے؟''

''صرف میں؟ تم نے یہ سوال اس انداز میں کیوں کیا؟''

''میں آپ پر مسلط تو نہیں ہو سکتی۔آپ ویسے ہی طویل بیماری سے اٹھے ہیں۔میرا بوجھ' میرے تحفظ کا احساس آپ کے ذہن پر گراں گزرے گا۔''

''نہیں رابعہ بس اتنی سی بات ہے یا کوئی اور بات بھی ہے تمہارے ذہن میں۔''

''نہیں ظاہر ہے......میں......''

''ہاں میں سمجھتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔یہی ناں کہ تم ظاہر ہے میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔میرے اور تمہارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''یہ ایک سچائی ہے۔'' رابعہ بیگم ٹھوس لہجے میں بولیں۔

''بلاشبہ ہم اس سچائی کو خلوص دل سے تسلیم کرتے ہیں لیکن رابعہ دو بے سہارا انسان اگر ایک ہی راستے پر چلتے ہوئے خلوص کے رشتوں میں منسلک ہو جائیں تو انہیں بالکل اجنبی تو نہیں کہا جا سکتا۔تم اگر اپنی زندگی کے لیے کوئی بہتر سہارا تلاش کر لو تو میں تمہیں روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن کم از کم اس وقت تک تو ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیے۔جب تک اس کی گنجائش ہے۔''

رابعہ بیگم نے ایک نگاہ شرافت حسین کو دیکھا اور پھر گردن خم کر دی۔

''میں کہیں جا تو نہیں رہی۔''

''ہاں اور جانے کا نام بھی نہیں لینا۔جب تک کہ مجھے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ جہاں تم جاؤ گی وہ جگہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

رابعہ نے اس کے بعد کچھ نہ کہا اور وہ دونوں درخت کے نیچے بیٹھے رہے۔شرافت

حسین کا ذہن اب بہت سی سوچوں کا شکار تھا۔ ظاہر ہے فوری طور پر کوئی ایسی جگہ تلاش نہیں کر سکتے تھے جو سر چھپانے کا ٹھکانہ بن سکے۔ ابھی تو انہیں اس شہر کے بارے میں بھی نہیں معلوم تھا۔ حالات کیا چل رہے ہیں؟ صورت حال کیا ہے؟ پناہ گزیں کیمپوں میں وقت گزارنا الگ بات تھی اور شہری زندگی میں داخل ہو کر اپنے لیے کوئی مقام تلاش کرنا ایک مشکل مرحلہ۔ بالآخر انہوں نے یہی طے کیا کہ ابھی کسی پناہ گزیں کیمپ کا ہی رخ کرتے ہیں۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے انہوں نے رابعہ پر اپنا مقصد ظاہر کیا۔ رابعہ بھی بے چاری اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

پناہ گزیں کیمپوں کی تلاش میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی جگہ جگہ ایسے کیمپ لگے ہوئے تھے اور ان کیمپوں میں دلدوز مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ نہ جانے کتنے بھٹک رہے تھے۔ ہر ایک کو اس طرح کے سہارے تو نہیں مل جاتے۔ بہر طور کیمپ کے ایک حصے میں جا کر وہ فروکش ہو گئے۔ جو جگہ انہوں نے منتخب کی وہ ذرا کچھ بہتر تھی اور یہاں تھوڑی سی ایسی قدرتی آڑ موجود تھی کہ وہ اسے اپنا ٹھکانا کہہ سکتے۔ شرافت حسین نے کہا۔

''رابعہ تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بے شک میں جانتا ہوں کہ یہ صرف انسانی رشتوں کی بنیاد پر ہی ہے لیکن اس بنیاد پر میری ایک درخواست اور مان لو۔ جب تک کہ ہمیں سر چھپانے کا کوئی اور ٹھکانہ نہ مل جائے' تم یہاں سے کہیں جانا نہیں اگر تمہیں جانا ہو اور تم اس بات کے لیے مجبور ہو جاؤ کہ میرا ساتھ چھوڑ دو تو مجھے بتا کر چلی جانا۔ میں تمہیں روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔''

''نہیں شرافت صاحب میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔''

شرافت حسین نے رابعہ کو وہیں چھوڑا اور وہاں سے چل پڑے۔ انہیں کسی باعزت روزی کی تلاش تھی۔ اس شہر اجنبی میں وہ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے۔ البتہ انہوں نے کیمپ کا راستہ ذہن میں محفوظ رکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے کیا کہیں؟ بلاشبہ لاتعداد ہمدرد چہرے ان کی نگاہوں کے سامنے تھے لیکن کسی سے کچھ کہنے کی جرأت انہیں نہ ہو سکی۔ شام ہونے کو تھی اور اس کے بعد ضروریات زندگی سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ شرافت حسین بے

کسی کا شکار تھے اور پھر جب جھٹپٹا ہونے لگا تو انہیں رابعہ یاد آئی۔ انہوں نے سوچا کہ خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں ہے۔ کیمپوں میں بے شک کھانے پینے کی چیزیں مل جائیں گی۔ لیکن وہ تو بڑے عزم سے نکلے تھے۔ شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس بات پر کہ واپس جا کر کیمپ میں خیرات کا کھانا طلب کریں لیکن اس کے علاوہ چارہ کار بھی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک فیصلہ کیا اور ایک اور کیمپ میں پہنچ گئے۔ یہاں کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ بہت سے مخیر حضرات کھانے کے سامان کے انبار کے ساتھ کیمپوں میں پہنچ جاتے تھے اور اس کے بعد بلاتخصیص ہر شخص کی حاجت پوری کرتے تھے۔ چنانچہ شرافت حسین کو بھی دو افراد کا کھانا باآسانی مل گیا اور وہ اسے اپنے لباس میں چھپائے اس کیمپ میں پہنچ گئے جہاں رابعہ کو چھوڑ آئے تھے۔ رابعہ اپنی جگہ موجود تھیں اور صبر و سکون کے ساتھ شرافت حسین کا انتظار کر رہی تھیں۔

شرافت حسین کے دل میں مسرت کی لہریں بیدار ہو گئیں۔ انہوں نے کھانے کی اشیاء رابعہ کے سامنے رکھ دیں اور دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ رابعہ نے کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ وہ یہ کھانا کہاں سے لائے؟ وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ایک بے کس اور بے سہارا انسان جو بیس دن کے بعد ہسپتال سے نکلا ہے بھلا کہاں سے اتنی جلدی محنت مزدوری کر کے روزی کما لائے گا۔ بہر طور یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے کھانا اسی ممنونیت کے ساتھ کھایا۔ جیسے شرافت حسین اپنی کمائی سے یہ سب کچھ لائے ہوں۔

تاریک رات آ گئی اور ان دونوں نے اپنے لیے سونے کی جگہ بنالی۔ جگہ ہی کیا۔ کھردری زمین' اینٹوں کا تکیہ اور بس۔ رابعہ بیگم ان سے کچھ فاصلے پر لیٹ گئی تھیں۔ اطراف میں وہی کربناک کراہیں بکھری ہوئی تھیں۔ سسکیوں کی آوازیں' رونے کی آوازیں' کہیں بچوں کا شور' کہیں کچھ اور لیکن اب تو انہیں کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ ان حالات کو برداشت کرتے ہوئے۔ یہ بیس دن البتہ ہسپتال میں کسی قدر پرسکون گزر رہے تھے لیکن یہاں وہی دلدوز مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ شرافت حسین کے دل میں شدید آرزو تھی کہ رابعہ بیگم کو ان دلدوز مناظر سے دور لے جائیں دونوں ہی جاگ رہے تھے لیکن دونوں ہی سونے کا اظہار کر رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد شرافت حسین بولے۔

''رابعہ بیگم سو نہیں رہیں تو کچھ بات کروں۔''

''میں بھی باتیں ہی کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔''

''ہاں' ضرور۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

رابعہ بیگم تھوڑی دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتی رہیں۔ پھر ان کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ''ایک گھر تھا میرا۔ بھرا پرا گھر' ابا جی تھے' اماں تھیں' بہن بھائی تھے۔ ابا جی بستی کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور بستی والے ان کی عزت کرتے تھے لیکن پھر انسان درندہ بن گیا' عزت کرنے والے نفرتوں کا شکار ہو گئے۔ جہاں کچھ دن پہلے میاں جی میاں جی پکارا جاتا تھا میرے ابا کو وہاں اب ہمیں اپنی عزت اور زندگی بچانا مشکل ہو گئی تھی۔ حالات کو محسوس کر کے ابا جی نے فیصلہ کیا کہ بستی چھوڑ دی جائے اور ہم اپنے قافلے والوں کو جمع کر کے وہاں سے چل پڑے۔ چند اور گھرانوں نے ہمارا ساتھ دیا تھا اور یوں ہم راتوں رات اپنے گھروں سے بے سروسامانی کی کیفیت میں نکل کھڑے ہوئے۔ فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ ایک دوسری بستی میں پہنچ جائیں جہاں ہمارے اور دوسرے بہت سے رشتے دار موجود تھے لیکن راستے میں ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی اور ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ میرے ساتھ میرے پڑوس کی اور راستے میں مل جانے والی کئی نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ہمیں ان غنڈوں نے اٹھا لیا اور اس کے بعد ہم یہ بھول گئے کہ ہمارے اپنے کہاں ہیں؟ ہم پر اذیتوں کے پہاڑ توڑ دیئے گئے۔ میں شرافت حسین صاحب میں خاص طور سے آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں...... میں...... میں رابعہ بیگم کی آواز رندھ گئی۔

شرافت حسین سرد نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''نہ جانے کتنے ہوس پرستوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنی رہی میں۔ میں ایک بے جان وجود کی مانند تھی۔ جس کا جی چاہتا تھا میرے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتا اور پھر میں انتہائی نڈھال اور بری حالت میں ایک قافلے والوں کو ملی جو پاکستان آ رہا تھا۔ اس وقت مجھ جیسی بے سہارا لڑکیوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ مسلمان جہاں بھی مجھ جیسی کسی لڑکی کو پاتے تھے انسانی اور مذہبی رشتوں کی بنیاد پر اسے اپنے ساتھ لے لیا کرتے تھے۔ بس یونہی...... یونہی میں پاکستان

کی سرزمین تک پہنچ گئی اور اپنی یہ زندہ لاش گھسیٹتی ہوئی آخر کار اس کیمپ تک...... شرافت صاحب اس کے بعد زندگی میں جو کچھ رہ سکتا ہے وہی میری زندگی میں ہے اور میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ مجھے مرنے کا انتظار کرنا چاہیے۔'' رابعہ بیگم کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

شرافت خاموشی سے یہ داستان سن رہے تھے جب رابعہ بیگم کی سسکیاں کچھ مدھم پڑ گئیں تو انہوں نے کہا۔

''رابعہ بیگم میرا بھی ایک ایسا ہی گھر تھا جس کا حوالہ تم نے دیا۔ کس کس کی کہانیاں سنو گی؟ ہر شخص ایک ہی کہانی سنائے گا لیکن میں ایک بات جانتا ہوں۔ ہمیں قدرت یہاں تک لے آئی ہے تو اس نے ہمارے بارے میں ضرور فیصلہ کیا ہوگا۔ ہم جب اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے تو پھر زندگی کے معاملات میں دخل اندازی کیوں کریں؟ زندگی جب تک ہے اسے گزارنا ہوگا۔ موت تو بہر طور ایک دن آئے گی ہی۔ میں ایک ساتھی کی حیثیت سے تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ موت کے بارے میں مت سوچو۔ اپنے ذہن میں مثبت سوچوں کو جگہ دو اسی طرح ہم اپنے ذہنی کرب کو شکست دے سکتے ہیں۔''

رابعہ بیگم آنسوؤں بھری نگاہیں اٹھا کر شرافت حسین کو دیکھنے لگیں۔

''میں معافی چاہتی ہوں۔ شرافت صاحب یہ کہانی کوئی نئی کہانی نہیں ہے' جس سے سنیں گے آپ کو یہی کہانی سنائے گا۔ میرا مقصد کچھ اور ہی تھا۔''

''کیا؟''

''میں...... نے...... میں نے بس ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ اس وقت جب آپ نے اپنی چادر سے میرے بدن کو ڈھانپا تھا۔ جب کہ آپ کو اس کی ضرورت تھی اگر آپ دوبارہ میرے سامنے نہ آتے تو شاید مجھے یہ احسان یاد بھی نہ رہتا لیکن دوبارہ میں نے آپ کو اس وقت دیکھا جب ڈاکٹر آپ سے آپ کے بازو کا زخم چھپانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ آپ نے اپنے زخم پر سے چادر ہٹا کر میرے بدن کو ڈھک دیا تھا۔ شرافت صاحب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ اس کے صلے میں مجھے کیا دینا پڑے گا؟ یہ میرا تجربہ تھا کہ انسان اب انسان نہیں رہے کسی سے کچھ مانگا جائے تو اسے کچھ دینا بھی پڑتا ہے اور یہاں اس پاک سر

زمین پر میں آپ کو اس چادر کے بدلے وہ نہیں دے سکتی تھی جو ایک روٹی کے بدلے میں نے انسانوں کو دیا ہے۔ بس یہ ایک جذبہ تھا جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں آپ کی تیمارداری کروں۔ یہی ایک جذبہ تھا شرافت صاحب جو مجھے بیماری کی حالت میں آپ کے ساتھ ہسپتال تک لے گیا اور وہاں میں نے یہ بیس دن آپ کے ساتھ گزارے لیکن اب آپ کی حالت بہتر ہے میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ پر مسلط رہوں۔''

شرافت حسین گہری نگاہوں سے رابعہ بیگم کا جائزہ لیتے رہے تھے پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں رابعہ تم ٹھیک کہتی ہو واقعی اس وقت کوئی اجنبی کسی اجنبی کا بوجھ سنبھالنے کے قابل نہیں۔ لیکن میں تمہاری وجہ سے پریشان نہیں ہوں رابعہ کچھ وقت تو دو مجھے۔ کچھ وقت تو دو۔''

''میں کہاں جا رہی ہوں۔ ابھی نہیں کیمپوں میں گزارا کرنا پڑے گا اور تقدیر کے دوسرے فیصلوں کا انتظار کرنا ہوگا لیکن بس میں نے آپ کے سامنے تمام سچائیاں اگل دی ہیں۔ آپ جو بھی فیصلہ کریں گے میں اس سے انحراف نہیں کروں گی۔''

شرافت حسین خاموش رہے اور پھر یہ خاموشی تھوڑی دیر بعد گہرے سناٹے اور گہری سانسوں میں تبدیل ہوگئی۔ دوسری صبح معمولات زندگی ہمیشہ کی مانند جاری ہوگئے تھے۔ شرافت حسین اٹھ کر کہیں چلے گئے یہ معاہدہ تو ان کے درمیان طے ہوگیا تھا کہ جب تک وہ اپنے لیے کوئی بہتر جگہ تلاش نہ کرلیں رابعہ بیگم یہاں سے جانے کی کوشش نہیں کریں گی۔ رات کی باتوں کا اثر رابعہ بیگم پر تھا۔ سورج چڑھے کافی دیر گزر چکی تھی۔ شرافت حسین واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک معمر شخص بھی تھے اور ان معمر شخص کے پیچھے چند افراد بھی آرہے تھے۔ پھر اس سے قبل کہ رابعہ کچھ پوچھتی۔ شرافت حسین نے آگے بڑھ کر رابعہ بیگم کا دوپٹہ ان کے سر پر ذرا آگے تک کھینچ دیا اور اپنے ساتھ آنے والے معمر شخص سے بولے۔

''مولوی صاحب یہ ہیں رابعہ بیگم۔''

رابعہ بیگم کچھ نہیں سمجھ پائی تھیں۔ مولوی صاحب ان کے سامنے بیٹھے۔

''بیٹی رابعہ بیگم شرافت حسین ولد فراست حسین نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ میں تمہارا نکاح ان کے ساتھ پڑھا دوں۔ پہلے میں تم سے اجازت چاہتا ہوں اور اس کے بعد خدا کے مبارک نام کے ساتھ میں تم کو رشتہ ازدواج میں منسلک کردوں گا۔''

رابعہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شرافت حسین نے جھک کر آہستہ سے کہا۔

''رابعہ تم نے کہا تھا کہ ان حالات کے بعد میں جو فیصلہ کروں گا تمہیں اس سے انحراف نہیں ہوگا۔ میرے اس فیصلے کو قبول کرکے مجھے عزت بخشو رابعہ میں تم سے پہلی اور آخری درخواست کر رہا ہوں۔''

رابعہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس نے مولوی صاحب کے دوبارہ پوچھنے پر اثبات میں سر ہلا کر نگاہیں جھکا دیں۔ بس ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے بسم اللہ کہہ کر رسم نکاح کا آغاز کردیا۔ مولوی صاحب اس فریضے سے فارغ ہوکر انہیں دعائیں دیتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شرافت حسین مولوی صاحب کو چھوڑنے چلے گئے تھے اور رابعہ بیگم پتھر کی طرح ساکت و جامد بیٹھی سوچ رہی تھیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ چند ہی لمحوں میں ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہوگئی تھیں۔ وہ ہو گیا تھا جس کا گمان بھی نہ تھا۔

◇◇◇

مہتاب بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور انور حسین بھی آبدیدہ ہوگئے تھے۔ دونوں بیٹے اور بیٹی بھی قریب آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ نوجوان لڑکے کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بہر طور یہ رقت انگیز منظر دیر تک جاری رہا اور اس کے بعد مہتاب بیگم نے بیگم ارباب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تنویر آپا یہ سلطانہ تمہیں کہاں سے مل گئی؟ تم کیسے جانتی ہو اسے۔''

''آپ لوگ اس جذباتی کیفیت سے نکل آئیں تو میں اس موضوع پر آپ سے بات کروں۔'' بیگم ارباب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ یہ صورت حال ان کی سمجھ میں بالکل

نہیں آئی تھی۔ انور حسین ان کے دور کے سسرالی عزیز تھے۔ بیگم مہتاب سے بھی بس ایک آدھ بار ہی ملاقات ہوئی تھی لیکن ان حالات میں ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تو یہ فاصلے بالکل مختصر ہو گئے اور سب اس پیار سے ملے جیسے سب قریبی عزیز ہوں۔ لیکن سلطانہ کا مسئلہ ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ دوسری طرف انور حسین سلطانہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے صوفے کی جانب بڑھ گئے اور اسے اپنے نزدیک بٹھاتے ہوئے بولے۔

''سلطانہ' شہریار کہاں ہے؟ ارے ہاں تنویر باجی آپ بتائیں کیا بھائی شہریار بھی آپ کے ساتھ ہیں؟''

''کون شہریار؟''

''کیا مطلب؟ آپ شہریار کو نہیں جانتیں؟ سلطانہ تم بتاؤ شہریار کہاں ہیں؟'' اور سلطانہ کی آنکھوں سے آنسو امڈنے لگے۔ اس نے ایک بار پھر اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا تھا۔

''انا للہ...... انا اللہ سلطانہ خدا کے لیے سچ بتاؤ کیا شہریار......''

سلطانہ نے سسکیوں کے درمیان اپنے خاندان کے اجڑنے کی کہانی سنائی اور بتایا کہ اب ان میں سے کوئی زندہ نہیں ہے۔ بیگم ارباب متعجبانہ انداز میں یہ سب کچھ سن رہی تھیں۔ انور حسین کافی دیر سکتے کے سے عالم میں رہے۔ مہتاب بیگم نے دل گیر ہو کر سلطانہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

بیگم ارباب خاموشی سے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہیں اور پھر بولیں۔ ''میں سلطانہ کو اس حیثیت سے بالکل نہیں جانتی کہ اس کا تعلق ہمارے خاندان سے ہے لیکن شہریار بھائی مجھے یاد آ رہے ہیں۔ ایک بار جب ماموں افتخار حج پر جا رہے تھے تو شہریار بھائی انہیں چھوڑنے کے لیے یہاں تک آئے تھے۔ کیا یہ تذکرہ انہیں شہریار بھائی کا ہے؟''

''ہاں تنویر باجی انہی کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ عارض کا رشتہ بچپن ہی سے سلطانہ سے طے تھا۔ منگنی کر دی تھی ہم نے ان کی اس وقت جب سلطانہ سال کی اور عارض دس سال کا تھا۔ لیکن حالات ایسے بگڑے کہ افراتفری میں کسی کو کسی کی خبر ہی نہ رہی۔ آہ تقریباً تین سال پہلے

شہریار بھائی سے ملاقات ہوئی تھی میں انہی کے گھر ٹھہرا تھا اور ایک کاروباری سلسلے میں ان کے شہر گیا تھا لیکن کیا معلوم تھا کہ آخری ملاقات ہے۔''

''دنیا ہی بدل گئی آہ کس قدر رنج ہوا ہے مجھے۔'' انور حسین صاحب کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

بیگم ارباب خاموشی سے گردن ہلاتی رہی تھیں۔

''مگر تم اس بچی کو کیسے لے آئیں؟ تنویر آپا؟'' مہتاب بیگم نے سوال کیا۔

''بس! خدا کو اسے یہاں پہنچانا تھا۔ مجھے مل گئی مگر میں نہیں جانتی تھی کہ یہ اپنا ہی خون ہے۔'' بیگم ارباب نے اعلیٰ ظرفی سے کہا۔ یہ بات ان کے لیے مسلسل باعث حیرت تھی کہ اگر یہ کسی اور خاندان کی بچی ہے تو پھر شاہ جہاں کون ہے؟ ان کی بیٹیاں کون ہیں؟ اس کا ان سے کیا تعلق ہے؟ یہ بات انور حسین یا مہتاب بیگم سے پوچھنے کی بجائے بہتر تھا کہ سلطانہ ہی سے معلوم کی جائے لیکن سلطانہ نے یہ مشکل خود ہی حل کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سنبھل گئی تھی۔ تب اس نے بتایا کہ شاہ جہاں بیگم تو بس ایک کیمپ میں اسے ملی تھی اور بے یار و مددگار دیکھ کر انہوں نے اسے سہارا دیا تھا اور الجھنوں سے بچنے کے لیے مشورہ دیا تھا کہ اپنے آپ کو ان کی بیٹی ہی ظاہر کرے۔ ورنہ کہیں کچھ الجھن نہ درپیش آ جائے۔ اس بات پر بیگم ارباب کہنے لگیں۔

''میں نے تو شاہ جہاں بیگم کا تذکرہ نہیں کیا تھا اس تصور کے ساتھ کہ سلطانہ ہی سے پوچھوں کہ وہ کون ہے؟ لیکن یہ کوئی چھپانے کی بات نہیں۔ یہ تو اس عورت کی عظمت ہے کہ اس نے ایک غیر خون کو اپنے خون میں شامل کر لیا۔ میں آپ کو شاہ جہاں اور اس کی دونوں بیٹیوں سے بھی ملاتی ہوں۔ ویسے حقیقت یہ ہے انور بھائی کہ میرے دل میں بارہا یہ خیال آتا تھا کہ یہ بچی ان دو بچیوں سے میل نہیں کھاتی مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اپنا ہی خون ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد شاہ جہاں اور اس کی دونوں بیٹیوں کو بھی بلوا لیا گیا انور حسین نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا تھا۔ شاہ جہاں تو یہ سن کر ہکا بکا رہ گئی کہ سلطانہ کے عزیز و اقارب مل گئے اور خود بیگم ارباب اس کی رشتہ دار ہوتی ہیں۔ اس کے دل میں ایک ہول سا ہو گیا تھا کہ کہیں

اب سلطانہ اس سے جدا نہ ہو جائے اور یہ ہول آخر درست ثابت ہوا۔ انور حسین نے بیگم ارباب سے کہا۔

''ہم سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ عارض کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی ہے ہم اس قول کو نبھائیں گے۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ حالانکہ سلطانہ میری ضرورت بن چکی ہے لیکن خدا نے آپ لوگوں کو بھیجا ہے تو اب بھلا میں اسے روکنے کا کیا حق رکھتی ہوں؟ ہاں اگر تھوڑا بہت حق ہے تو شاہ جہاں بیگم کا ہے جنہوں نے ان دنوں میں یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ سلطانہ ان کی اولاد نہیں ہے۔'' شاہ جہاں بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ انہوں نے سلطانہ کو سینے سے لپٹا لیا اور خاصی دل گرفتہ ہو گئیں۔

عارض کے اور اس کے درمیان کبھی کوئی ایسی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ جس میں ان جذبات کی جھلک ہوتی۔ عارض خود بھی ایک سرد سا نوجوان تھا۔ ان لوگوں کا سہارا سلطانہ کو بہت غنیمت محسوس ہو رہا تھا۔ بلاشبہ ان چند ہی دنوں میں شاہ جہاں نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور ایک حقیقی ماں کی سی محبت دی تھی یہی کیفیت ممتاز اور نور جہاں کی تھی اور پھر سب سے بڑی محبت خاتون بیگم ارباب تھیں۔ جنہوں نے اسے اپنی سیکریٹری بنا کر اس کا دل بہلا دیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اب اسے ایک پائیدار سہارا حاصل ہو رہا تھا تو وہ انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔ انور حسین، بیگم ارباب کے ہاں دعوت پر آئے تھے لیکن یہاں سے سلطانہ کو لے چلے تھے۔ آخر کار سلطانہ انور حسین کے خوب صورت مکان میں پہنچ گئی۔ انور حسین بہت چالاک آدمی تھے۔ انہوں نے ان حالات کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا تھا اور ذہانت سے کام لے کر ایسی کارروائیاں کی تھیں کہ یہاں آنے کے بعد بھی انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ عمدہ مکان انہوں نے پہلے سے منتخب کر لیا تھا اور اس سلسلے میں وہیں بیٹھ کر کارروائیاں کر ڈالی تھیں۔ چنانچہ اس مکان کا مکیں ہندوستان منتقل ہو گیا تھا اور اپنا سب کچھ انور حسین صاحب کو قانونی طور پر دے گیا تھا۔ سلطانہ نے اس خوب صورت کوٹھی کو دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔ بڑے ہی دل گردے کی لڑکی تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اس ماحول کو قبول کر لیا تھا۔

عارض زیادہ تر گھر سے باہر رہتا۔ فرزانہ خود پسند تھی اور کبھی اس سے کھلی ملی نہیں تھی۔ بیگم مہتاب البتہ کبھی کبھی اس کی مزاج پرسی کر لیا کرتی تھیں۔ انور حسین بیرونی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کل صورت حال تھی اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وقت بہت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ سلطانہ بیرونی دنیا سے کٹی ہوئی تھی۔ باہر کیا ہو رہا ہے؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا پھر ایک دن مہتاب بیگم نے اپنے شوہر انور حسین سے کہا۔

''کچھ محسوس کیا آپ نے؟''

''کیا؟''

''عارض، سلطانہ کی طرف راغب نہیں معلوم ہوتا۔ حالانکہ دونوں ہی یہ بات جانتے ہیں کہ ان کی زندگی ایک دوسرے سے منسلک ہے۔ لیکن میں نے کبھی عارض کو سلطانہ سے باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' انور حسین گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ کئی بار میں نے بھی اس انداز میں سوچا ہے۔''

''ایک بار عارض سے پوچھ لو۔ اس کی زندگی کا معاملہ ہے۔''

جواباً وہ گردن ہلا کر رہ گئے تھے پھر ایک دن انہوں نے عارض سے پوچھ لیا۔

''بات دراصل یہ ہے امی کہ یہ مذاق نہ مجھے پہلے پسند تھا اور نہ اب پسند ہے۔ میں شادی کے سلسلے میں اول تو ابھی سوچ ہی نہیں سکتا دوسری بات یہ کہ ایک ایسی غمزدہ لڑکی جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے میری پوری زندگی پر مسلط ہو جائے گی۔ میں یہ پسند نہیں کرتا۔''

''تو ہم بھی تمہیں مجبور نہیں کریں گے عارض۔'' مہتاب بیگم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

یہ سلطانہ کی تقدیر کا آخری فیصلہ تھا۔

انور حسین اور مہتاب بیگم کا رویہ سلطانہ کے ساتھ بہت ہی واجبی سا ہو گیا۔ اس پر اب کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ بس سامنے آ گئی تو بات کر لی گئی۔ ضروریات البتہ ابھی تک پوری کی جا رہی تھیں۔ پھر ایک دن اس وقت غضب ہو گیا جب سلطانہ کی طبیعت اچانک

بگڑ گئی۔اس کی حالت کافی خراب ہوگئی تھی۔سخت وحشت کے عالم میں وہ مہتاب بیگم کے پاس پہنچی اوراس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پھوپھی جان! میرا سر چکرا رہا ہے۔شدید چکر آ رہا ہے۔صبح سے تین بار الٹیاں ہو چکی ہیں۔عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے میری' یوں لگتا ہے جیسے دل کوئی اندر سے کاٹ رہا ہو۔''

''کیا کھالیا تھا کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں کھالی جس نے نقصان دیا ہو'' اتفاق سے انور حسین بھی اسی وقت آ گئے۔انہوں نے سلطانہ کی حالت غیر دیکھی تو اس بارے میں معلومات کرنے لگے۔بہرطور انسانی رشتے ختم نہیں ہوئے تھے۔چنانچہ فوراً ہی ڈاکٹر کو بلالیا گیا۔ڈاکٹر نے پوری طرح معائنہ کیا اور پھر کچھ دوائیں لکھ کر دے دیں لیکن اس نے جو انکشاف کیا تھا وہ انور حسین اور مہتاب بیگم کے لیے ایک ہولناک دھماکے سے کم نہ تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے' وہ حاملہ ہے۔طبیعت بہتر ہو جائے گی۔تشویش نہ کیجئے۔ڈاکٹر تو فیس لے کر چلتا بنا مگر مہتاب بیگم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''ہائے میرے اللہ' یہ سب کیا ہے؟''

''اللہ بہتر جانے؟'' انور حسین نے کہا۔

''یہ لڑکی تو قیامت کی ہے۔اس کا تو خواب میں بھی گمان نہیں تھا۔ارے کہیں مصیبت ہمارے ہی گلے نہ پڑ جائے گھر میں جوان بچہ ہے' کہنے والوں کی زبان کون روک سکتا ہے؟اسے کہتے ہیں نیکی برباد گناہ لازم' کام تو نیکی کا کیا تھا یہ سوچ کر کہ اپنا ہی خون ہے' اپنی بچی ہے مگر بچی یہ گل کھلائے گی۔یہ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔میں کہتی ہوں انور حسین اپنی عزت بچانے کی کوشش کرو یہ تو مصیبت بن گئی ہمارے سر۔''

اتفاق سے یہ ساری باتیں سلطانہ نے بھی سن لیں۔اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔اس نے ششدر نگاہوں سے اپنے وجود کو دیکھا اور ان لوگوں کی باتوں پر غور کرنے لگی۔اسے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اور پھر رفتہ رفتہ اسے ماضی کے کچھ ہولناک واقعات یاد آنے لگے۔وہ ہوشربا وقت جب وہ زندگی کا بدترین سفر کر رہی تھی۔وحشتوں اور دیوانگیوں کے عالم میں اس کا وجود ایک کٹی پتنگ کی مانند رہ گیا تھا اور اس کٹی ہوئی پتنگ کو نہ

جانے کتنے افراد نے لوٹا تھا۔وہ اپنی اس کیفیت کا تجزیہ کرنے لگی۔ان برباد لمحات کا پھل اس کے پہلو میں موجود تھا۔آہ اس میں میرا قصور تو نہیں ہے۔میں ان لوگوں کی ہمدردیاں اچانک کیوں کھو بیٹھی؟

ابو یہی تو کہا کرتے تھے کہ اگر زندگی کا آخری سانس تک نیکیوں کی اچھائیوں کی طرف بڑھانے میں صرف ہو تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زندگی کا پورا پورا قرض اتارا ہے۔موت کو گلے لگا لینا تو سب سے آسان کام ہے لیکن جینے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔میں مروں گی نہیں جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس میں میرا اپنا کوئی دخل نہیں تھا۔مجھ جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں ایسے حادثات کا شکار ہوئی ہوں گی اور دنیا ظاہر ہے اب ان بے چاریوں کے لیے نہایت کٹھن جگہ بن کر رہ جائے گی۔نہیں وہ بے قصور ہیں۔انہیں بے قصوری کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔بہت کچھ سوچا اس نے اس کے اندر ایک نیا عزم بیدار ہوتا جا رہا تھا۔اس کے بدن میں نئی توانائیاں جنم لے رہی تھیں اور ان قوتوں نے اس کے مزاج میں نہ جانے کیا تبدیلیاں پیدا کر دیں۔اس کی کیفیت جس حد تک خراب ہوگئی تھی۔اب اسی حد تک وہ بہتر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ ایک نئے عزم کے ساتھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔سامنے سے اسے عارض آتے ہوئے نظر آئے تو وہ اس طرف چل دی۔

''میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔'' سلطانہ نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' عارض نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

''اگر کہیں بیٹھ کر بات ہو جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔'' سلطانہ نے کہا۔

''تو بیٹھ جاتے ہیں۔'' عارض نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ایک طرف اشارہ کر کے چل پڑا۔وہ عارض کے ساتھ ساتھ چل پڑی تھی۔اسے خود اپنی جرأت پر حیرت تھی۔اس کے ذہن پر کسی قسم کے تردد کی پرچھائیں نہیں تھی۔یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر ایک نیا وجود ابھر آیا ہو۔نہ جانے وہ کون سے جذبے تھے جس نے اسے فولاد کی سی قوت مہیا کی تھی۔عارض اسے لیے ہوئے ایک گوشے میں جا بیٹھا اس کے انداز میں اب بھی کوئی پذیرائی نہیں

تھی۔

''عارض! آپ کو معلوم ہے کہ بچپن میں میری منگنی آپ سے کر دی گئی تھی۔ اس وقت نہ میں سمجھدار تھی نہ آپ' اب ان حالات سے گزرنے کے بعد جو آپ کے علم میں آ چکے ہیں۔''

''سلطانہ! سچ بات یہ ہے کہ اس موضوع پر میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا اور شاید آپ کو بھی اندازہ ہو کہ میرے اور آپ کے درمیان کبھی بے تکلفی نہیں ہو پائی۔ موجودہ حالات میں اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت دکھی ہیں اور آپ کو ہماری ضرورت ہے لیکن یہ ضرورت ایک رشتے اور دوسرے انسانی بندھنوں کے تحت پوری ہو سکتی ہے۔ میرے ذہن میں کبھی آپ اس حیثیت سے نہیں آئیں جو میرے والدین نے سوچی ہے۔ میں خود بھی آپ سے کسی وقت گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ آپ خود بتائیے کہ آپ نے کبھی میرے بارے میں اس انداز میں سوچا ہے؟''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔''

''وری گڈ یہ بات میرے لیے باعث مسرت ہے۔''

''اس کے علاوہ عارض میری زندگی سے ایک اور تاریکی وابستہ ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھ کر یہ بتایا ہے کہ میں ...... میں ......سلطانہ ہچکچاتی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔''ماں بننے والی ہوں۔ عارض یہ بات پھوپھی جان اور پھوپا میاں کو بھی ڈاکٹر کی زبانی معلوم ہو چکی ہے۔ میں وہاں سے چلنے کے بعد جب میرے ماں اور باپ کا قتل کر دیا گیا تھا۔ میرے دونوں بھائی مارے گئے' بہن ماری گئی تو نیم دیوانگی کی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی اور اسی دیوانگی کے عالم میں میں نے یہاں تک کا سفر کیا۔ راستے میں مجھے بہت سے وحشیوں نے بھنبھوڑا اور غالباً جو بات آج ڈاکٹر نے بتائی ہے وہ اسی وقت کی یادگار ہے۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے لیکن اب یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ عارض میں نے پھوپی جان اور پھوپھا میاں کی زبانی بہت سی باتیں سنی ہیں۔ وہ مجھے یہاں لا کر شرمندہ ہیں اور تشویش کا شکار ہیں۔ میں تم سے گفتگو کرنے کے بعد کافی حد تک مطمئن ہو گئی ہوں لیکن ایک بات ذہن میں

رکھنا قصور میرا نہیں ہے اور مجھ جیسی بے شمار لڑکیاں جوان حادثات سے گزر کر یہاں تک آئی ہیں وہ بھی میری طرح بے قصور ہیں۔ ایک مرد ہونے کی حیثیت سے ایک انسان ہونے کی حیثیت سے تم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ایسی لڑکیوں کو گناہ گار مت سمجھنا۔ میں یقینی طور پر تمہاری زندگی میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کروں گی لیکن کبھی کوئی ایسی لڑکی اگر تم تک پہنچے اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہو تو اس سے گریز نہ کرنا ورنہ صورت حال بہت خطرناک ہو جائے گی۔''

عارض متعجبانہ انداز میں سلطانہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک حیران سا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔''اگر یہ بات ہے سلطانہ تو پھر میں کسی اور کا انتظار کیوں کروں؟ جو قرض مجھے مستقبل میں پورا کرنا ہے اس کی ابتداء یہیں سے کیوں نہ کر دوں؟'' عارض کے ان الفاظ پر سلطانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ دیکھتی رہی پھر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے عارض کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیے۔

''کیا تم یہ جذبے رکھتے ہو عارض؟''

''شاید آج سے پہلے میں نے اس بارے میں بھول کر بھی غور نہ کیا تھا لیکن تمہارے ان الفاظ نے سلطانہ مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انسانی کمزوریاں بعض اوقات انسان کو دوسروں کی نگاہوں سے گرا دیتی ہیں لیکن اس میں ان کا قصور تو نہیں ہوتا۔ تم بالکل اطمینان رکھو سلطانہ میں آج کے بعد اپنا نظریہ تبدیل کر رہا ہوں اور میں نہ ہی اس وقت تمہارے ماں' باپ اور بہن بھائی کی موت کی وجہ سے متاثر ہوں بلکہ ایک حقیقی انسانی مسئلہ میری نگاہوں کے سامنے آیا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس میں اپنا حصہ حاصل کر لوں۔''

''عارض تم گریٹ ہو اگر واقعی زندگی میں کچھ خوش نصیبیاں شامل ہوتیں اور تم جیسے انسان سے واسطہ پڑتا تو میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی لیکن یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ اب ممکن نہیں ہے عارض' اور نہ ہی مناسب تم نے میرے مسلک سے اتفاق کیا یوں سمجھو جو بات میرے ذہن میں آئی اس میں میرے پہلے شریک تم ہو اور میں اس شریک کو موت تک نہ بھول سکوں گی۔ تم نے ایک چیز کو سمجھا۔ سوچا اور انصاف کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔''

''سلطانہ پلیز' اب ساری باتیں ختم کر دو۔ میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں اور شاید

میرے دل میں تمہارے لیے کچھ جذبات بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ان حالات کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ایک منفرد شخصیت ہو اور مجھے تمہاری انفرادیت پسند ہے۔“

”تو پھر آؤ عارض سچے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھی بن جائیں۔“

”ساتھی ہی نہیں‘ بلکہ زندگی بھر کے ساتھی۔“

”نہیں عارض یہاں مجھے تم سے اختلاف ہو جائے گا۔ براہ کرم اس سلسلے میں ضد مت کرو۔“

”تم سمجھتی کیوں نہیں سلطانہ۔کون ہے جو میری مانند سوچ کر تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنائے گا؟ کون ہوگا جو تمہارے وجود کی حقیقتوں کو جان کر ظرف کا مظاہرہ کرے گا؟ ہم پہلے ہی مرحلے پر المیوں کو کیوں جنم دیں؟“

”نہیں تم اطمینان رکھو المیے جنم نہیں لیں گے بلکہ اس تپش سے اس آگ سے جو شخصیت تشکیل پائے گی وہ زیادہ موثر اور زیادہ کارآمد ہوگی۔“

عارض گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر بولا۔”خیر تم اس وقت ذرا جذباتی ہو رہی ہو۔کچھ دیر آرام کرلو۔ہم بعد میں فیصلہ کرلیں گے۔“

عارض میرے بہت اچھے ساتھی بہت اچھے دوست۔ میں اب یہاں آرام نہیں کروں گی۔ پھوپی جان اور پھوپا میاں کو کرب کا شکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے لیے۔تم بہ ظاہر میرا ساتھ نہیں دو گے لیکن ایک بات میرے اور تمہارے درمیان طے ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مکمل رابطہ رکھیں گے۔“

”مگر تم جاؤ گی کہاں؟“

”ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائی ہوں۔ مجھے بیگم ارباب کے ہاں سے لایا گیا تھا وہاں تین ایسی ہستیاں موجود ہیں جو میرے خیال میں ہر نظریئے سے ہٹ کر میرا ساتھ دیں گی اور پھر عارض ابھی مجھے زندگی کے بہت سے کٹھن مرحلوں سے گزرنا ہے۔میں ان مرحلوں سے گزرنے کے لیے ایک پناہ گاہ تلاش کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ مجھے وہ پناہ گاہ مل جائے گی تم میرے راستے مت روکنا۔یہی ایک سچے ساتھی کی پہچان ہے۔“

عارض پریشان نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔بس عجیب وغریب کیفیات کا شکار ہو گیا تھا وہ‘ پھر اس نے کہا۔

”امی اور ابو کا اس بارے میں کیا نظریہ ہے؟“

”وہی جو ہونا چاہیے تھا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے عارض۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اب تک مجھ سے اجنبیت برتی لیکن چند ہی لمحات میں تم مجھ سے کتنے قریب آ گئے۔ میں تمہاری اس قربت کو کبھی فراموش نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے سلطانہ اگر تم نے یہ فیصلہ کرلیا ہے تو میں تمہارے راستے روکنا مناسب نہیں سمجھتا۔“ عارض نے جواب دیا‘ پھر بولا۔

”کب جانا چاہتی ہو تم وہاں؟“

”بس اب انتظار کس بات کا؟“

”کیا لے جاؤ گی یہاں سے۔سامان کا لے جانا وقت کی بات نہیں ہوگی؟“

”نہیں‘ اس میں کوئی چیز میری اپنی نہیں ہے۔ جو احسانات مجھ پر پھوپی جان اور پھوپا میاں نے کیے تھے بس وہ کافی ہیں۔ مستقبل تو بہت طویل ہوتا ہے۔ چند چیزیں لے جانے سے کوئی کام تو نہیں بنتا۔تم بس براہ کرم باہر پہنچ جاؤ میں تھوڑی دیر کے بعد آ رہی ہوں۔“ سلطانہ نے کہا اور عارض نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ سلطانہ کی ہدایت کے مطابق بیرونی دروازے کی جانب چل پڑا تھا۔

انور حسین یا مہتاب بیگم کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ پروگرام کے مطابق عارض اسے بیگم ارباب کے گھر کے پاس چھوڑ گیا تھا۔

سلطانہ انیکسی کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔نور جہاں کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔اس نے سب سے پہلے سلطانہ کے قدموں کی چاپ سنی۔ پلٹی‘ دیکھا اور پھر مسرت سے کھل گئی۔اٹھی اور سلطانہ سے لپٹ گئی۔

”ہائے سلطانہ تو تو ایسی غائب ہوئی کہ خواب ہی بن گئی۔ہم لوگ تو بس راتوں کو خوابوں میں تجھے دیکھ لیا کرتے تھے۔اتنے دن کے بعد ملنے آئی ہے۔“ نور جہاں اس سے لپٹی

ہوئی کہہ رہی تھی۔

سلطانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔ ''بھئی تم لوگوں کو کہاں بھول سکی۔ کہاں ہیں امی اور ممتاز؟''

''دوسرے کمرے میں ہیں مگر پہلے مجھ سے باتیں کرو۔ نئی جگہ کیسی ہے؟ میں نے تو بڑی خوشیاں منائیں۔ یہ جان کر کہ چلو تمہارا تو ایک ٹھکانہ ہو گیا اور بڑی اچھی بات ہے۔ ہم سب بہت خوش ہیں کہ تم ایک اچھے گھر میں چلی گئیں اور اب وہاں کی بہو بن جاؤ گی۔''

نور جہاں نے کہا اور اس کے لہجے میں ایک حسرت سی بیدار ہو گئی۔

سلطانہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے ذہن میں کچھ خاکے ابھرے تھے۔ تعجب کی بات تھی جس گھرانے سے اس کا تعلق تھا وہ ایک خوش حال گھرانہ تھا۔ بے شک شہریار خان نے اسے اچھی تعلیم دلائی تھی اور زمانے سے پوری طرح روشناس کرایا تھا لیکن پھر بھی بہت سے ایسے معاملے تھے جن میں ابھی اس کی عمر ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ لیکن نہ جانے اس واقعے کے بعد اس کے اندر کون سی پراسرار قوتیں بیدار ہو گئی تھیں کہ وہ ایک لمحے میں انسانی کیفیات سمجھ لیتی تھی۔ نور جہاں کے لہجے کی حسرت کو اس نے محسوس کیا اور اس کی گردن ہلنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔

''آؤ امی کے پاس چلتے ہیں۔''

شاہ جہاں اور ممتاز بھی اسے دیکھ کر دیوانی ہو گئیں۔ شاہ جہاں نے آگے بڑھ کر اس کا سر سینے میں بھینچ لیا اور دیر تک اسے سینے سے لگائے کھڑی رہی پھر اس کا چہرہ سامنے کر کے نمناک آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیسی رہی بیٹی وہاں؟''

''بہت اچھی امی بالکل ٹھیک ہوں۔''

''خدا تمہیں ہمیشہ بری نگاہوں سے محفوظ رکھے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایک سہارا دے دیا۔''

''نہیں امی مجھے وہ سہارا پسند نہیں آیا۔''

سلطانہ نے آہستہ سے کہا اور شاہ جہاں کے ساتھ ساتھ ممتاز اور نور جہاں بھی چونک پڑیں۔

''کیا مطلب .... کیا بات ہے؟'' شاہ جہاں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں وہاں نہیں رہ سکی اور وہاں سے چلی آئی۔''

''ان لوگوں کو بتائے بغیر؟''

''ہاں امی' ظاہر ہے وہ بہت اچھے لوگ تھے انہوں نے بڑی محبت سے مجھے اپنے ساتھ رکھا لیکن بس حالات نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا کہ میں ان کے ساتھ رہ سکتی۔''

''کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی؟''

''یونہی سمجھ لیں۔ ہوئی تو ہے کچھ بات۔ آپ کا خیال ہے' اندر کیوں نہ چلیں؟ بیگم ارباب کے سامنے گفتگو کر لیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات آپ سے اور کرنی ہے۔''

''کیا؟''

''امی حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ جگہ ہم سے چھن جائے یا میری وجہ سے یہ جگہ آپ سے چھن جائے۔ میں دراصل آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر ہمیں یہاں سے ہٹنا پڑے تو کیا آپ اس سلسلے میں میرا ساتھ دیں گی؟''

''مم .... مگر کیوں .... آخر کیوں؟''

''ہو سکتا ہے بیگم ارباب مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند نہ کریں۔ آپ کی ذات سے تو انہیں کوئی اختلاف نہ ہو گا لیکن میرے لیے اس کے امکانات سو فیصدی موجود ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے یہیں بتا دیجئے بے تکلفی سے تاکہ میں بات کی ابتدا اسی انداز میں کروں۔''

''تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ وہ گھر تو نے چھوڑ دیا اور اب اس بات کے امکانات ہیں کہ بیگم ارباب بھی تجھے اپنے گھر سے ہٹا دیں ایسی صورت میں تیرا ساتھ دوں گی یا نہیں؟'' شاہ جہاں نے سوال کیا۔

''ہاں امی بس۔ یہ دنیا ہے اور حالات اس وقت اس کی اجازت نہیں دیتے کوئی انسان اپنی ذات کے لیے خطرہ مول لے سکے۔''

شاہ جہان سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"بیٹی میں تیری ماں نہیں ہوں اور یہاں آنے سے پہلے ہمیں اس بات کی امید نہیں تھی کہ ہمیں کوئی ایسی جگہ مل جائے گی۔ میں نے کیمپ میں تجھے اپنی بیٹی بنایا تھا اب یہ تقدیر کی بات ہے کہ ہمیں سر چھپانے کا یہ ٹھکانہ ملا' مجھے بیٹی عزیز ہے ایسے ٹھکانے تو اللہ تعالیٰ خود بناتا ہے۔ اس نے ہمیں یہ ٹھکانہ دیا تھا۔ یہاں سے اگر نکلنا پڑا تو وہی کوئی دوسرا ٹھکانہ بھی دے دے گا۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ سب سے بڑی چیز ہے۔ انسانوں کا دست نگر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا فیصلہ ہے اگر تو ایسے حالات کا شکار ہوئی اور یہاں نہ رہی۔ تو پھر ہم لوگ بھی یہاں نہیں رہیں گے۔ وہ الگ بات تھی کہ تجھے تیرے عزیز مل گئے تھے اور عزیز بھی ایسے جن کے بارے میں بیگم ارباب سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ تیرے سسرال والے ہیں اور تجھے بیارہ کر وہیں جانا ہے۔ میں ظاہر ہے اس مسئلے میں کیا بولتی؟ لیکن اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آ گئی ہے تو میں تیرے ساتھ ہوں۔ تو نے یہ کیوں سوچا؟"

"نہیں میں نے نہیں سوچا امی اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت میں تجربات کے دور سے گزر رہی ہوں۔ یہ تجربات مکمل کر لوں تو ایک بہت بڑے کام کا آغاز کروں گی۔ بس مجھے آپ لوگوں کا ساتھ چاہیے کیونکہ کسی بھی مقصد کی تکمیل کے لیے پہلے ایک گروہ بنایا جاتا ہے اور تم میرے اس گروہ کی پہلی کارکن ہو گی امی' ممتاز اور نور جہاں۔"

"اگر تم دوبارہ ہمارے درمیان واپس آ جاؤ اور ہمیں کسی فٹ پاتھ پر زندگی گزارنی پڑے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا سلطانہ۔" نور جہاں نے کہا۔

"زندہ باد۔ اچھا تو پھر آیئے اب ذرا بیگم ارباب سے مل لیں۔ ہم ذرا مختلف لوگ ہیں لیکن یہ بیگمات الگ چیز ہوتی ہیں۔ اب ساری تفصیلات انہی کے سامنے پیش کرنا مناسب ہو گا۔ کیا وہ اندر موجود ہیں؟ یا کہیں گئی ہوئی ہیں؟"

"نہیں اندر ہی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو ہم وہاں سے آئے ہیں۔ تمہارے سلسلے میں اکثر بات کرتی رہتی ہیں کہہ رہی تھیں کہ ابھی تمہیں خاموشی سے وہاں دل لگانے دیا جائے۔ ہم لوگ درمیان میں مداخلت کریں گے تو کہیں تمہارا دل وہاں سے اچاٹ نہ ہو جائے

اس لیے مکمل خاموشی اختیار کر لی گئی تھی ورنہ ہر وقت تمہارے ہی تذکرے ہوتے رہتے ہیں۔ تمہارے بارے میں بہت سی باتیں مجھے معلوم ہو چکی ہیں' لیکن گزرے وقت کی کہانیاں اب گزر گئیں اب تو اس وقت کو صرف ماضی کی یادوں ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔"

"آیئے۔" سلطانہ نے کہا اور اس کے بعد یہ قافلہ بیگم ارباب کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔

◇◇◇

رابعہ بیگم بت کی طرح ساکت بیٹھی تھیں کہ شرافت حسین واپس آ گئے اور رابعہ بیگم کے قریب بیٹھ کر بولے۔

"بڑا بدنصیب ہوں میں کہ آپ کو اس طرح کچھ لیے دیئے بغیر اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔ لیکن آپ کا جو کچھ ہے مجھ پر قرض ہے رابعہ بیگم' اب تو آپ مجھ سے یہ الفاظ نہیں کہہ سکیں گی کہ دو اجنبی کس وقت تک یکجا رہ سکتے ہیں؟"

رابعہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے رہے تب شرافت حسین نے کہا۔

"اور اگر اس بات سے آپ کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا ہے رابعہ بیگم تو بخدا آپ یہ یقین کیجئے کہ میں آپ کا ہمیشہ احترام کروں گا اور اگر ہمارے حالات کچھ بہتری کی طرف مائل ہو جائیں تو پھر میں آپ کو آپ کی مرضی پر آزاد چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں .... نہیں ایسا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں ہے لیکن میں نے آپ کو اپنے بارے میں بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا آپ نے مجھے اپنے بارے میں؟ یہی کہ ایک گھر تھا اور وہ گھر ختم ہو گیا یہی کہانی تو میری بھی ہے رابعہ بیگم۔ اس میں فرق کیا ہے؟"

"میں نے کچھ اور بھی بتایا تھا آپ کو؟"

"اپنے لٹنے کی داستان؟ رابعہ بیگم اس وقت جو حسین اور پاکیزہ چہرے میرے

سامنے بکھرے ہوئے ہیں یہ کسی نہ کسی شکل میں لٹے ہیں لیکن ان میں سے کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بخدا میرے اگر ایک ہزار وجود ہوتے تو کم از کم ایک ہزار لڑکیوں کو پناہ دیتا۔ یہ ان کا قصور نہیں ہے۔ یہ تو بس تقدیر کی خرابی ہے' جس کا ہم کوئی شکوہ نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو ایک پاکباز عورت کی حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فخر حاصل کر چکا ہوں اور مجھے اس پر ناز ہے۔''

رابعہ بیگم نے بہت زیادہ گردن جھکالی اور پھر آہستہ سے بولیں۔

''آپ...... آپ واقعی اس قابل تھے جو میں نے آپ کے ساتھ کیا' خدا کا یہ فیصلہ میں نے قبول کر لیا ہے خلوص دل کے ساتھ۔''

''شکریہ رابعہ بیگم شکریہ۔'' شرافت حسین نے کہا اور اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔

دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ کافی دیر کے بعد شرافت حسین بولے۔

رابعہ بیگم اب ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم اپنی یہ جگہ کسی اور کے لیے خالی کر دیں۔ میں اس جگہ کو متبرک سمجھتا ہوں کہ یہاں دو زندگیوں کا فیصلہ ہوا۔''

رابعہ بیگم نے چونک کر شرافت حسین کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولیں۔

''لیکن جائیں گے کہاں؟''

''رابعہ بیگم انسان بڑی عجیب و غریب فطرت رکھتا ہے۔ اگر اس پر مایوسیوں کے اندھیرے مسلط ہوں تو اس کی تمام صلاحیتیں بیکار ہو جاتی ہیں اور اگر امیدوں کے چراغ روشن ہو جائیں تو پھر وہ جدوجہد کے لیے متوالا ہو جاتا ہے۔ میں بھی اب اپنی تقدیر کے اس دوسرے مرحلے کو آزمانا چاہتا ہوں۔ ہم ایک منصوبہ بنا کر نکلتے ہیں۔ دیکھیے رابعہ بیگم جن حالات سے ہم گزرے ہیں انہیں ہمیں اپنے ذہنوں سے نکالنا ہوگا۔ انسان کی کہانی تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ خوشی غم' دن رات یہ سب کچھ ایک ہی انداز میں جاری رہا اور جاری رہے گا لیکن جدوجہد میں سمجھتا ہوں ہر مسئلے کے لیے ضروری ہے۔ میں کم از کم اپنے دل میں اب یہ امنگ پا رہا ہوں کہ کچھ ہو۔ یہ کچھ کیا ہوگا اس کے لیے آیئے ہم زمانے کو دیکھتے ہیں۔ یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ

وقت ہمیں اپنے درمیان کس طرح جگہ دیتا ہے۔''

''مجھے اب بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' رابعہ بیگم نے کہا اور شرافت حسین ان کا ہاتھ پکڑ کر کیمپ سے باہر نکل آئے۔

دونوں نے پھر سے سفر شروع کر دیا تھا۔ اس سفر کی ابتدا ہو چکی تھی اور اب انہیں منزل کی تلاش تھی۔ شام گزر گئی لیکن کوئی ایسا ٹھکانہ نہ ملا جو ان کے لیے کسی تسلی کا باعث ہوتا۔ شرافت حسین نے اسی درخت کے نیچے ڈیرہ جمایا تھا جہاں ہسپتال سے نکلنے کے بعد وہ آ بیٹھے تھے لیکن اس وقت میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ یہاں بیٹھ کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ کل ایسے گھروں کی تلاش کی جائے گی جہاں انہیں کوئی ملازمت مل سکے۔ شرافت حسین کہنے لگے۔

''تم بھی کیا یاد کرو گی رابعہ بیگم کہ کوئی شوہر نامدار ملے تھے جنہیں حجلہ عروسی کے لیے جگہ تک میسر نہ تھی۔ بہر طور ہم اس یقین کے ساتھ کل اپنے نئے سفر کا آغاز کریں گے ہمیں ہماری منزل ضرور مل جائے گی۔''

رابعہ بیگم مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔ یہ مسکراہٹ انہوں نے ضروری سمجھی تھی۔ حالانکہ دل نے اندر سے نجانے کیا کیا کہانیاں سنائیں تھیں لیکن ان کہانیوں کو اب دفن کر دینا ضروری ہوگا کیونکہ شرافت حسین نے ان کہانیوں کو بے مقصد قرار دے دیا تھا اور شرافت حسین مجسم شرافت و اخلاق تھے۔

رات کا پہلا پہر ہوگا کہ انہوں نے ایک شخص کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ بھاری بھرکم بدن کا مالک ایک معزز آدمی تھا۔ گو اس کے خدوخال نمایاں نہیں تھے لیکن اس کے چلنے کے انداز میں ایک ایسی متانت اور وقار تھا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ انہی کی جانب آ رہا تھا۔ رابعہ بیگم اور شرافت حسین کچھ متعجب سے ہو گئے۔ چند لمحات کے بعد وہ معمر شخص قریب پہنچ گیا' سادہ سے لباس میں ملبوس تھا۔ بڑی سی داڑھی' لمبے لمبے بال' اس نے ان کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔

''آؤ...... میرے ساتھ آؤ۔''

شرافت حسین جلدی سے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے تعجب سے اس شخص کو

دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں.......... میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میرے ساتھ آؤ''، معمر شخص نے مختصر الفاظ میں کہا۔

''لیکن کہاں؟''

''جہاں میں تمہیں لے جانا چاہتا ہوں' خدا پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہارے لیے کسی طور پر نقصان دہ ثابت نہیں ہوں گا۔''

شرافت حسین نے متعجبانہ نگاہوں سے پہلے اسے اور پھر رابعہ بیگم کی طرف دیکھا۔ رابعہ بیگم بھی اتنی ہی متحیر نظر آ رہی تھیں پھر شرافت حسین نے رابعہ بیگم سے کہا۔

''اٹھو رابعہ آؤ۔''

معمر شخص آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے لیکن دونوں سخت حیران تھے۔ ظاہر ہے اس شخص کو انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کوئی تعارف نہیں تھا۔ نہ ہی صورت آشنا محسوس ہوتی تھی پھر.......... پھر یہ کون ہے؟ اور انہیں کہاں لے جا رہا ہے؟ بہر طور وہ چلتے رہے اور انہیں تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل سفر کرنا پڑا تھا۔ رابعہ بیگم کچھ تھک سی گئی تھیں اور اگر یہ سفر مزید جاری رہتا تو شاید وہ ان کی رفتار کا ساتھ نہ دے پاتیں لیکن پھر یہ سفر ایک ایسی عمارت کے سامنے ختم ہو گیا جو اس وقت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور نمایاں نہیں تھی۔ اس شخص نے عمارت کے دروازے کو کھولا اور ان لوگوں سے بولا۔

''آ جاؤ.......... بے دھڑک اندر آ جاؤ۔''

ایک لمحے کے لیے شرافت حسین کے دل میں بے شمار وسوسے جاگے لیکن پھر انہوں نے سوچا کہ جب خدا کے نام کے ساتھ اس سفر کا آغاز کر ہی لیا تو پھر خوف کرنا بری بات ہے چنانچہ وہ اس تاریک گھر میں داخل ہو گئے۔

گھر کیا تھا عظیم الشان حویلی تھی۔ بہت ہی وسیع و عریض.......... جس کے صحن میں بے شمار درخت لگے ہوئے تھے۔ حویلی کے بہت بڑے دروازے کے سامنے چند سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں سے چڑھ کر وہ اندر داخل ہو گئے۔ معمر شخص نے دروازہ کھولا اور پھر اندر تیز

روشنی کر دی۔ اس روشنی میں انہوں نے وہاں کا ماحول دیکھا بہت ہی عمدہ قسم کا فرنیچر اندر موجود تھا۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا اور ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ معمر شخص نے کہا۔

''دیکھو عزیز یہ تمہاری پناہ گاہ ہے۔ اس چھت کے نیچے تم اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو اور پورے صبر و سکون کے ساتھ یہاں رہ سکتے ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ یہاں تمہیں پریشان کرنے والا کوئی آدمی نہیں آئے گا چنانچہ اب یہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔ یہ عمارت تمہیں بہت بے ترتیب ملے گی۔ اسے ترتیب دینا تمہارا کام ہے۔ بہت عرصے سے یہاں صرف میں رہتا ہوں اور میرے ساتھ اور کوئی نہیں ہے چنانچہ اس عمارت میں جو گندگی اور غلاظت نظر آ رہی ہے اسے تم میری تنہائی کی وجہ سمجھ لینا۔ اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ تم اپنی نئی زندگی کا آغاز یہاں سے کرو اور سنو یہاں جو کچھ ہے اسے اپنے تصرف میں لانے سے گریز نہ کرنا۔ میں نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے اور میں بلاشرکتِ غیرے ان تمام چیزوں کا مالک ہوں۔''

شرافت حسین حیرت سے منہ پھاڑے کھڑے ہوئے تھے۔ معمر شخص نے کہا۔

''تم مجھے قربت شاہ کے نام سے پکار سکتے ہو۔ لیکن میرا خیال ہے تمہیں مجھے پکارنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیونکہ میں خود اس گھر میں نہیں رہتا۔ بس ایک مسافر کی مانند ہوں۔ کبھی ادھر سے گزرا تو اس پر ایک نگاہ ڈال لی۔ میرا خیال ہے اب تمہارے ذہن میں اور کوئی سوال نہیں ہو گا۔''

''لیکن.......... لیکن..........''

''نہیں یہ لفظ بہت غلط ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب کوئی تمہیں خلوص و دیانت سے کچھ دے دے یہ لفظ ''لیکن'' نیت کا حال پوچھنا چاہتے ہو۔ بہر طور میں فقیر منش ہوں اور کوئی ایک جگہ میرا ٹھکانہ نہیں ہوتی البتہ جب کبھی اس طرف سے گزرا تم سے ملاقات کر لوں گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

''میں صرف یہ سوال کرنا چاہتا تھا کہ لوگوں نے ہمیں یہاں دیکھا اور ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا تو ہم کیا جواب دیں گے۔'' شرافت حسین نے کہا۔

''یہی کہ تم شرافت حسین ہو اور یہ تمہاری منکوحہ'' قربت شاہ نے مسکرا کر کہا۔

''اور اس گھر سے ہمارا تعلق؟''

''اس کی وضاحت میں نے پہلی ہی کر دی ہے۔ میں نے تمہیں یہ گھر دے دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے تم سے کہ یہاں تمہیں پریشان کرنے والا کوئی نہیں آئے گا۔ اب اجازت دو۔'' شرافت حسین اب بھی متحیر انداز میں منہ پھاڑے کھڑے ہوئے تھے۔ بزرگ صورت آدمی واپس پلٹے اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ دونوں ہی انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھی کے بڑے دروازے سے باہر نکل کر رات کی تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ شرافت حسین پریشانی سے کھڑے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

''رابعہ بیگم کیا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔''

''یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔ کیا یہ سب کچھ حقیقت ہے۔''

''تم مجھے اس کا یقین دلاؤ۔'' شرافت حسین نے کہا۔

''مم.........میں.........میں خود اتنی حیران ہوں، یہ سب کیا ہے کہیں ہم

''

''نہیں رابعہ، بہتر ہے کہ کوئی غلط بات مت سوچو۔ بعض اوقات تقدیر انسان کے لیے ایسے انوکھے فیصلے کرتی ہے کہ انسانی ذہن انہیں قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں یہ ہماری چند روزہ زندگی کا دوسرا اہم ترین واقعہ ہے پہلا واقعہ وہی تھا جب میں نے تمہارے چہرے پر حیا کی پرچھائیاں دیکھی تھیں اور تم اپنے پھٹے ہوئے لباس سے بری طرح پریشان نظر آ رہی تھیں۔ اس وقت ایک ایسا ہی جذبہ میرے سینے میں ابھرا تھا اور میں نے تمہیں اپنی چادر دے دی تھی اور وہ معمولی سا واقعہ ہی ہماری اس یکجائی کا باعث بن گیا۔'' رابعہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بس عجیب سے انداز میں گہری گہری سانسیں لے کر خاموش ہو گئی تھیں۔ دونوں لق و دق عمارت کے اس کمرے میں کھڑے ہوئے حیرانی سے ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے پھر شرافت حسین نے ہی خود کو سنبھالا اور آہستہ سے بولے۔

''رابعہ بیگم رات بہت گزر چکی ہے، بہتر ہے کہ ہم سونے کا انتظام کر لیں۔ میں اپنے آپ کو اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ عالم خواب میں نہیں ہوں، کم از کم صبح کو آنکھ کھلے گی تو

حقیقت تو معلوم ہو جائے گی۔'' رابعہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز روشنی میں انہوں نے کمرے کے منتشر ماحول کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر آرام کے لیے جگہ بنانے لگیں، انہوں نے تھوڑے سے حصے کو صاف ستھرا کر لیا تھا جہاں شرافت حسین سکون سے لیٹ سکیں اور پھر انہوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ آرام کریں۔ شرافت حسین نے مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھا اور پھر بولے۔

''نصف بہتر، بہتری کا ثبوت بلا شبہ تم نے دے دیا ہے لیکن کیا یہ باقی جگہ مجھے صاف کرنا ہوگی۔ میرا مطلب ہے تمہارے آرام کے لیے۔''

''نہیں خدارا ایسی بات نہ کہیں، میں تھوڑا سا حصہ صاف کیے لیتی ہوں۔'' رابعہ بیگم نے کہا اور اپنے لیٹنے کی جگہ بنانے لگیں۔ شرافت حسین سے تھوڑے فاصلے پر انہوں نے اپنے لیے بھی تھوڑی سی جگہ صاف ستھری کی اور پھر حیا کے انداز میں دراز ہو گئیں۔ یہ انوکھا ملاپ تھا جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں تھا، جہاں تک ایک دوسرے کی قربت کا تصور تھا، وہ دونوں کے ذہنوں سے بھلا کیسے نکلتا، لیکن جن حالات میں یہ یکجائی ہوئی تھی وہ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ابھی وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں داخل ہو سکیں، یہ بات ہی حیران کن تھی کہ وہ ایک ایسی جگہ تھے جہاں صرف ان کی حکمرانی تھی۔ ناقابل یقین، ناقابل تصور، بہر طور لمحات گزرتے رہے، دونوں ہی خاموش تھے اور پھر یہ خاموشی رنگ لائی۔ نیند کی دیوی نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور پھر صبح یوں ہی ہو گئی جیسے رات ہوئی ہی نہ تھی۔ پہلے جاگنے والی رابعہ بیگم تھیں۔ انہوں نے جاگ کر سب سے پہلے یہ یقین کیا کہ رات کی بات صرف رات کی بات نہ تھی بلکہ ایک حقیقت بھی اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے انہوں نے سامنے سوتے ہوئے شرافت حسین کو دیکھا، دیکھتی رہیں، اچھی شکل و صورت کے تھے شرافت حسین درحقیقت پیکر شرافت ہی تھے۔ انہوں نے جس طرح رابعہ بیگم کے داغدار وجود کو اپنا لیا تھا یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ رابعہ بیگم کے بدن میں دہشت کی تھرتھری دوڑنے لگی۔ وہ لمحات یاد آ گئے تھے جب وہ لاتعداد بھیڑیوں کے قبضے میں تنہا تھیں اور وہ بھیڑیے ہر سمت اپنے منحوس دانت نکال کر مسکرا رہے تھے۔ رابعہ بیگم سے یہ خوف برداشت نہ ہو سکا، آہستہ سے آگے بڑھیں، شرافت حسین کی

طرف ہاتھ بڑھائے تو شرم کی ایک لہر بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اپنے کچلے ہوئے وجود کا تصور ذہن میں آیا تو انہوں نے خاموشی سے شرافت حسین کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ سب کچھ ان کے لیے اجنبی تو نہیں ہے۔ شرافت حسین مست نیند سو رہے تھے۔ بہر طور رابعہ بیگم نے انہیں زور زور سے ہلایا اور وہ جاگ گئے۔ چند لمحے دہشت زدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے اور اس کے بعد انہوں نے رابعہ بیگم کو دیکھا، تھوڑی سی خجالت ہوئی، تھوڑے سے پیچھے سمٹے اور پھر شاید سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ حاکمیت یاد آئی جو خدا اور رسول کو درمیان میں رکھ کر انہیں سونپ دی گئی تھی اور اس کے بعد انہوں نے رابعہ بیگم کا بازو پکڑ کر ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا کیونکہ یہ حق انہیں حاصل ہو چکا تھا۔ بلاشبہ یہ چوڑا سینہ رابعہ بیگم کے لیے بہت بڑی پناہ گاہ تھا اور اس پناہ گاہ میں پہنچنے کے بعد انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ کبھی تنہا نہ رہی ہوں، جیسی ان کے اپنے بچھڑ نہ گئے ہوں، کوئی تو موجود ہے، کوئی تو موجود ہے' شرافت حسین، رابعہ بیگم کے سر کو اسی طرح سینے سے لگائے رہے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''یہ تصور کھو بیٹھا تھا رابعہ کہ کوئی میرے ساتھ بھی ہے۔ مجھے کسی کی قربت حاصل ہے۔'' رابعہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔ شرافت حسین کی گلوگیر آواز سے ان کے جذبات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ دفعتاً وہ مسکرا پڑے۔

''ذرا اٹھو تو سہی یہ سچائی تو ثابت ہو گئی ہے کہ یہ سب خواب نہیں ہے لیکن اب ہمیں ہوش کی دنیا میں واپس آ جانا چاہیے۔'' شرافت حسین اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دن کی روشنی میں کمرے کا ویران ماحول اجاگر تھا۔ ایک ایک شے قیمتی تھی لیکن بے ترتیب۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے یہ کوٹھی استعمال نہ کی گئی ہو۔ ابھی تو صرف ایک کمرے ہی کی بات تھی، کوٹھی کا وسیع وعریض احاطہ اور اس کی عظیم الشان عمارت کے مٹے مٹے نقوش شرافت حسین کو یاد تھے جو رات کی تاریکی میں، دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھے گئے تھے لیکن اب تجسس بڑھ گیا اور انہوں نے رابعہ بیگم سے کہا۔

''پتہ نہیں یہ عمارت خود قربت شاہ کی ہے یا.......... آؤ ذرا اس کا جائزہ تو لیں۔'' اور پھر وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے رابعہ بیگم کا ہاتھ پکڑے ہوئے، اس کمرے سے باہر نکل آئے۔

خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا، بس ایک انوکھا تجسس تھا ایک عجیب سا احساس کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے، اس کمرے سے نکلنے کے بعد وہ برآمدے میں پہنچے اور اس کے بعد قطار میں بنے ہوئے دوسرے کمروں کا جائزہ لینے لگے۔ ہر کمرہ آرائشی سامان سے بھرا ہوا، قیمتی فرنیچر، قیمتی قالین، الماریاں، دیواروں پر لٹکے ہوئے ریشمی پردے جو بوسیدہ تو ہو چکے تھے لیکن اب بھی بے حد نفیس تھے۔ بہت دیر تک وہ اس عمارت کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک عظیم الشان باورچی خانہ اور اس باورچی خانہ میں موجود ضروریات زندگی کی تمام اشیاء یہاں تک کہ کھانے پینے کی چیزیں بھی موجود تھیں۔ ہر طرح سے یہ عمارت ایک مکمل رہائش گاہ تھی اور اس میں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر برسوں گزارے جا سکتے تھے۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا انہیں اسی طرح اس عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے، لاکھوں روپے کی مالیت کا سامان یہاں موجود تھا لیکن پوری عمارت میں کسی انسانی وجود کا پتہ نہ تھا۔ بہر طور وہ پوری عمارت کا جائزہ لینے کے بعد اسی کمرے میں واپس آ گئے اور پھر دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ شرافت حسین نے کہا۔

''رابعہ بیگم اب کیا کہتی ہو اس بارے میں؟''

''میں تو صرف آپ کے فیصلوں کی پابند ہوں۔''

''بھئی تقدیر نے اگر یہ موقع ہمیں فراہم کیا ہے تو میرے خیال میں ہمیں اس سے انحراف نہیں کرنا چاہیے، کم از کم اس وقت تک جب تک ایسی کوئی صورت حال سامنے نہ آئے جو ہمیں یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ ہم یہاں آرام کریں اور پھر قربت شاہ بظاہر کوئی ایسی شخصیت نہیں معلوم ہوتے تھے جو دھوکہ دہی کر سکے۔ ایک انوکھا وقار ایک انوکھی کیفیت تھی ان کے اندر۔''

''ہاں.......... اس میں کوئی شک نہیں۔'' رابعہ بیگم نے کہا اور پھر شرافت حسین مسکرا کر بولے۔

''پتہ نہیں اصولی طور پر ہمیں کیا کرنا چاہیے لیکن غیر اصولی طور پر صورت حال یہ ہے کہ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور اس باورچی خانے میں، میں نے تمام سامان دیکھا ہے، چولہے چائے بنانے کے لوازمات اور بھی بہت سی چیزیں، تو پھر کیا خیال ہے؟''

"اگر آپ کی اجازت ہو تو؟"

"اجازت ہے' اجازت ہے۔" شرافت حسین نے کسی قدر ظریفانہ انداز میں کہا اور رابعہ بیگم ان کے اس انداز پر مسکرا دیں۔ اس کے بعد وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی تھیں۔ شرافت حسین وہیں اپنی جگہ بیٹھے ان حالات پر غور کرتے رہے تھے۔ دفعتاً ہی چونک پڑے۔ عورت ہے اور اس ویران کوٹھی میں تنہا کہیں دہشت زدہ نہ ہو جائے۔ تیزی سے باورچی خانے کی جانب دوڑے اور باورچی خانے میں داخل ہو گئے۔ رابعہ بیگم برتن دھو رہی تھیں۔ حیرت سے شرافت حسین کو دیکھنے لگیں اور پھر پریشان لہجے میں بولیں۔

"خیر تو ہے کچھ ہو گیا؟"

"نہیں بھئی' میں تو صرف اس تصور کے ساتھ یہاں دوڑا چلا آیا کہ کہیں تم تنہا ڈر نہ جاؤ۔" برتن دھوتے دھوتے رابعہ بیگم کے ہاتھ لرز گئے۔ انہوں نے عجیب سی نگاہوں سے شرافت حسین کو دیکھا پھر آہستہ سے بولیں۔

"ڈر اور دہشت اب میرے وجود سے ختم ہو چکے ہیں۔ اور آپ بھی اس بارے میں غور نہ کریں' میں کسی بھی مرحلے میں کم از کم خوف زدہ تو نہیں ہو سکتی۔ خوف اب میرے سینے میں ختم ہو چکا ہے۔ شرافت حسین ان الفاظ کا مطلب سمجھتے تھے' لیکن وہ اس دکھ کو رابعہ بیگم کے سینے سے نکالنے کے خواہش مند تھے چنانچہ انہوں نے شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

"محترمہ زوجہ صاحبہ چلیے آپ بے حد بہادر ہیں لیکن ناشتے کی کیا کیفیت ہے' یہ چوہے جو ہیں نا' یہ اب اتنی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ پیٹ سے باہر نہ آ پڑیں۔" رابعہ بیگم مسکرانے لگیں اور پھر جلدی سے برتن دھو کر انہوں نے ناشتے کا سامان ان میں نکالنا شروع کر دیا۔ پیالوں میں چائے انڈیلی' شکر وغیرہ ملائی اور شرافت حسین وہیں کشادہ باورچی خانے کے ایک حصے میں بیٹھ گئے۔

"بس آ جائیے۔ فوراً آ جائیے۔"

"آپ شروع کیجئے۔"

"بھئی ایک بات ہم آپ کو بتا دیں' آپ کے بغیر کچھ کرنا اب ہمارے لیے ممکن

نہیں ہے رابعہ بیگم صاحبہ چنانچہ بغیر کسی تکلف کے آ کر ہمارے سامنے بیٹھ جائیں۔" رابعہ بیگم نے شکر گزار نگاہوں سے شرافت حسین کو دیکھا اور پھر ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔ بڑا اعتماد سا محسوس ہو رہا تھا انہیں شرافت حسین کی ذات پر کوئی وسوسہ کوئی خوف دل میں نہیں ابھرتا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر جس نے بے لوث اپنے زخم پر سے چادر اتار کر ان کا وجود ڈھک دیا تھا جو دوسروں کی نگاہوں کے تیروں کا نشانہ بنا ہوا تھا ایسا شخص جو بے لوث کسی کی ذات کے لیے یہ سب کچھ کر سکے زندگی کے کسی مرحلے پر غلط نہیں ثابت ہو سکتا' یہ اعتماد ان کی ذات کو بے حد سکون پہنچا رہا تھا' ناشتہ خاموشی سے کیا گیا اور اس کے بعد شرافت حسین نے کہا۔

"رابعہ بیگم' اب ذرا سوچنے سمجھنے کی قوتیں بحال ہوئی ہیں تو ہم تم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں کہ کیا کیا جائے' پہلی بات تو یہ کہ عارضی طور پر کچھ وقت گزارنے کے لیے مناسب ترین انتظامات موجود ہیں' دو ہی صورتیں ہیں یا تو ہم کمر بستہ ہو جائیں اس بات کے لیے کہ اس کوٹھی سے جو غیر انسانی کیفیت کی شکار ہے یہ کیفیت مکمل طور سے ختم کر دی جائے یا پھر یہاں سے نکلنے کی سوچو۔" رابعہ بیگم نے عجیب سی نگاہوں سے شرافت حسین کو دیکھا اور پھر بولیں۔

"میرا خیال ہے یہاں سے نکلنا تو کسی طور مناسب نہیں ہے۔ پہلا کام ہم شروع کیے دیتے ہیں' باقی جیسے کہ آپ نے کہا کہ سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا جائے۔"

"تو پھر بسم اللہ اس باورچی خانے کا کھایا ہے تو سب سے پہلے یہیں سے اس کام کو شروع کیا جائے۔"

"یہ تو میں ابھی ٹھیک کیے دیتی ہوں۔"

"لیجئے' کم از کم ہم بھی آپ کی تھوڑی بہت مدد کر سکتے ہیں۔ اب آپ یہ بھی نہ سمجھیں کہ ہم صرف ایک ہاتھ کے مالک ہیں اس ایک ہاتھ سے ہم آپ کو کیا کیا کر دکھائیں گے تصور بھی نہیں کر سکتیں آپ۔"

"جو کچھ آپ مجھے کر کے دکھائیں گے' اس کے لیے میری دعا ہے کہ میری آنکھوں کی بینائی سلامت رہے لیکن آپ نے مجھے نصف بہتر بھی کہا ہے تو میری پہلی گزارش ہے کہ اس کے بعد ایک ہاتھ کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ایک نہیں' تین ہاتھ ہیں اب آپ کے اور آپ ان

تینوں ہاتھوں کو قبول کرلیں۔''

شرافت حسین قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے۔ ''بھئی واہ کیا تصور پیش کیا ہے' واقعی بات تو درست ہے۔ تو آیئے اب یہ تینوں ہاتھ مل کر آج کا کارنامہ انجام دیں۔'' باورچی خانے کی صفائی' اس کے بعد کوٹھی کے بیرونی حصوں کی صفائی کی گئی اور دوپہر تک دونوں پسینے میں شرابور ہو گئے لیکن ایک انوکھا جذبہ' ایک انوکھی قوت ان کے وجود میں جنم لے چکی تھی۔ چنانچہ تھکن کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ بیرونی حصے کو اس طرح بدل دیا گیا کہ کوئی دیکھنے والا سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ آج ہی صبح یہ کوٹھی ویرانے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ایک بھوت گھر محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس کوٹھی کے تمام حصے صاف ستھرے نظر آ رہے تھے اور بیرونی دروازے سے داخل ہونے والا کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ کبھی غیر آباد رہی ہوگی۔

صبح کو ناشتے کے وقت جو کچھ تیار کیا گیا تھا' اس کا کچھ حصہ ابھی بھی بچا ہوا تھا جسے دوپہر کے کھانے پر استعمال کر لیا گیا اور اس کے بعد سب سے پہلے اس کمرے کو نفاست کے ساتھ آراستہ کیا گیا جس میں انہوں نے پہلی رات گزاری تھی۔

ہر چیز سے قرینہ جھانک رہا تھا۔ رابعہ بیگم کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ بہرطور وقت نے انہیں جو کچھ بھی بنا دیا تھا وہ ایک الگ بات تھی' لیکن زندگی میں نفاست تھی اور اس نفاست کا اظہار اس کمرے سے ہو رہا تھا۔

شرافت حسین لمحہ لمحہ ان کے ساتھ تھے اور ہر طرح سے ان کی مدد کر رہے تھے۔ اس کے بعد دوسرے تین کمرے درست کیے گئے۔ پوری کوٹھی درست کرنے کے لیے تو ابھی ایک طویل وقت درکار تھا۔ اس کام میں شام ہو گئی تھی اور اس وقت غالباً مغرب کی اذان ہونے والی تھی جب قربت شاہ بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئے' انہیں دور ہی سے دیکھ لیا گیا تھا۔ قربت شاہ کو دیکھ کر دونوں خوش ہو گئے۔ ان کے خیال میں یہ بات نہیں تھی کہ قربت شاہ سے اتنی جلدی دوسری ملاقات ہوگی۔

قربت شاہ نے اندر داخل ہو کر سلام دعا کی پھر کہنے لگے۔

''بھئی اذان ہو چکی ہے ذرا نماز پڑھ لوں اس کے بعد تم سے باتیں ہوں گی۔'' وہ

نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے ایک سمت بڑھ گئے۔ رابعہ بیگم نے شرافت حسین کو دیکھا اور بولیں۔

''میں ذرا جا کر مصلے وغیرہ کے بارے میں پوچھ لوں۔''

''ہاں ہاں ضرور۔'' شرافت حسین بولے۔ رابعہ بیگم آگے بڑھ گئیں۔

جس طرف قربت شاہ گئے تھے اس سمت جا کر انہوں نے قربت شاہ کو تلاش کیا لیکن وہ نظر نہیں آئے۔ وہ دیر تک حیرانی سے اِدھر اُدھر دوڑتی رہیں لیکن قربت شاہ کا کہیں پتہ نہیں چلا تھا۔ پھر وہ واپس شرافت حسین کے پاس آ گئیں۔

''نجانے کہاں چلے گئے ہیں؟''

''کیوں ملے نہیں؟''

''نہیں' دور تک دیکھ آئی ہوں۔''

''بھئی ان کا گھر ہے ہو سکتا ہے اپنی کسی پسندیدہ جگہ نماز پڑھ رہے ہوں۔ میرے خیال میں تم چائے بنا لو۔''

''ابھی لاتی ہوں۔'' رابعہ بیگم نے کہا اور باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ شرافت حسین ان کا انتظار کرنے لگے تھے پھر جب رابعہ بیگم چائے لے کر آئیں' عین اسی وقت دوسری سمت سے قربت شاہ آتے ہوئے نظر آئے۔ چہرے پر نور جھلک رہا تھا۔ دن کی روشنی میں ان کی شخصیت میں پہلے سے زیادہ وقار نظر آیا' نزدیک آ کر وہ اس جگہ بیٹھ گئے جو یہاں بنالی گئی تھی۔ رابعہ بیگم نے پیالوں میں چائے نکالی تو قربت شاہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

میرے کھانے اور پینے کے اوقات مقرر ہیں ان کے علاوہ میں کچھ نہیں کھاتا پیتا' میرے لیے زحمت نہ کرو۔''

''اوہ' بہتر ہے۔'' شرافت حسین نے کہا۔ قربت شاہ مسکرا کر بولے۔

''کہو یہ گھر تمہیں پسند آیا؟''

''کیا عرض کریں' کچھ کہنے کے لیے الفاظ میسر نہیں۔ ہم تو ان ویران اور خانماں بربادوں میں سے تھے جن کے لیے گھر کا تصور ہی ناممکن ہو گیا تھا اور آپ نے ہمیں یہ محل دے

ڈالا۔اور آپ ہم سے یہ سوال بھی فرما رہے ہیں کہ یہ ہمیں پسند آیا یا نہیں۔البتہ کچھ پریشانیاں کچھ سوالات ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔''

''ہاں ہاں کہو کیا الجھن ہے؟''

''یہاں ہم کس حیثیت سے قیام کریں' کون کون سا حصہ ہمیں استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔اگر یہ حکم ہوجاتا تو بہتر تھا۔'' قربت شاہ مسکرائے پھر بولے۔

''شاید میں رات کو تم سے وضاحت کرنا بھول گیا تھا' یہ پوری عمارت تمہارے تصرف میں ہے' یہاں جو کچھ ہے' میں نے تمہیں دیا' یوں سمجھو کہ یہ سب کچھ اب تمہاری ملکیت ہے۔بس کچھ نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں' انہیں خاص طور سے ذہن میں رکھنا۔''

شرافت حسین سحر کے سے عالم میں قربت شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ان کے یہ الفاظ شرافت حسین کے لیے ناقابل یقین سے تھے۔رابعہ بیگم کی حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھی۔ قربت شاہ نے کہا۔

''یہ احسان میں نے تم پر نہیں کیا' تقدیر کی فیصلے آسمانوں میں ہوتے ہیں۔کس کے لیے مالک کائنات نے کیا تحریر کیا ہے' یہ وہی جانتا ہے' غیب داں بننے کی کوششیں ہمیشہ نقصان دہ ہوتی ہے' ہاں تم اپنی سچائیوں کو مدنگاہ رکھو اور تمہیں تمہارے ہر قدم پر مشورہ دینے والا تمہارا ضمیر ہے۔اس سے برابر رابطہ رکھو اور جہاں وہ تمہارے کسی اقدام کی نفی کرے' بہتر ہے اس سے تعاون کرو۔'' نیک و بد کی تمیز کرنے کے لیے تمہارے اندر تمہارا محاسب موجود ہے اس کے علاوہ اپنی ذات کو اپنے جیسوں کے لیے کشادہ کرو اور یہ نہ سوچو کہ وہ جو تم میں آ شامل ہوئے' تم پر بار ہیں بلکہ یوں سمجھو کہ وہ اپنی تقدیر سے تمہاری راہیں کشادہ کرسکتے ہیں۔اور ہوسکتا ہے وہ اپنے ساتھ تمہارے لیے کچھ لائے ہوں۔مالک کائنات قادر ہے کہ تمہارے لیے اپنی تحریر میں ردوبدل کردے۔مسئلہ بس اسے خوش کرنے کا ہے' میرا خیال ہے میرا مقصد تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا۔''

شرافت حسین عقیدت سے قربت شاہ کو دیکھ رہے تھے۔قربت شاہ خاموشی سے چند لمحات آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے پھر بولے۔

''خدا کے دیئے ہوئے رزق کو استعمال کرو اس کے بعد میں ذرا تمہیں کچھ اور دکھانا چاہتا ہوں۔'' اشارہ چائے کی جانب تھا اور خود انہوں نے چائے پینے سے انکار کردیا تھا۔بہر طور شرافت حسین اور رابعہ بیگم نے چائے پی اس کے بعد قربت شاہ اٹھ گئے۔وہ انہیں لیے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑے۔کئی راہداریاں طے کرنے کے بعد وہ ایک اندرونی کمرے میں پہنچے تھے یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے کمرے میں روشنیاں کیں اور پھر ایک الماری کو انہوں نے کھولا۔اس کے اندر لباس وغیرہ ٹنگے ہوئے تھے۔قربت شاہ نے لباس ایک سمت سرکائے اور پھر شرافت حسین کی طرف دیکھ کر بولے۔

''یہ کنڈا نظر آرہا ہے تمہیں' اسے دو بار بائیں سمت موڑو اور ایک بار دائیں سمت۔''

اس طرح انہوں نے وہی عمل کیا جو کہا تھا اور الماری کے اندرونی حصے کا ایک دروازہ کھل گیا۔ قربت شاہ پہلے اس دروازے سے اندر داخل ہوئے اور اس کے بعد ان دونوں کو اندر آنے کے لیے کہا۔یہاں بھی روشنی کردی گئی تھی اور اس روشنی میں آٹھ سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ قربت شاہ ان سیڑھیوں کو طے کرکے نیچے پہنچ گئے۔ایک وسیع و عریض کمرہ بنا ہوا تھا اور اس کمرے میں کئی تجوریاں نظر آرہی تھیں۔قربت شاہ نے ان میں سے ایک تجوری کو کھولا اور رابعہ بیگم اور شرافت حسین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔الماری میں بے پناہ قیمتی زیورات بھرے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ہی نئی نوٹوں کی گڈیاں بھی بھری ہوئی تھیں۔قربت شاہ نے اس طرح دوسری الماریاں کھول کر انہیں دکھائیں اور یہ دونوں شدت حیرت سے گنگ ہوکر رہ گئے۔

یہ تو ایک بیش بہا خزانہ تھا جس کی مالیت نجانے کتنی ہوگی۔یہ سب کچھ دکھانے کے بعد قربت شاہ نے ان سے کہا۔

''دیکھو شرافت حسین' تم اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق سب کچھ لے سکتے ہو بلکہ میں تم سے کہہ دوں کہ یہ سب تمہاری ملکیت ہے اور میں نے یہ سب کچھ تمہیں دیا یا پھر مجھے حکم ملا کہ یہ سب کچھ میں تمہیں دے دوں۔سو میں نے یہ امانت تمہارے حوالے کردی۔ اب اس کا تحفظ تم پر لازم ہے اب تم یوں کرو کہ اس میں سے کچھ لو اور اپنی زندگی کو اس سے

آگے بڑھاؤ۔ بہتر یہ ہے کہ تجارت کرو کہ یہ ایک بہترین مشغلہ ہے‘ بزرگان دین وملت کا‘ اس
میں سے حاصل شدہ رقم کو تم اپنی تدبیر کے مطابق استعمال کرو اور اگر منافع ہو تو اس کا کچھ حصہ
اس میں منتقل کر دو تاکہ یہ آنے والے وقت میں دوسروں کے کام آئے‘ نقصان ہو تو اس میں
سے مزید لے لو کیونکہ تدبیر کے صحیح راستوں کو پہچاننا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اتنا ہے کہ اگر تم
ساری زندگی بھی تجربے کرتے رہو گے تو تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی لیکن میں جانتا ہوں کہ
تدبیر بہر طور تمہارے لیے بہتر راستہ منتخب کر دے گی کیونکہ اس کا رابطہ تقدیر سے ہوتا ہے۔ سمجھ
گئے؟ یعنی اگر اس میں سے حاصل شدہ رقم سے تمہیں منافع ملنا شروع ہو جائے تو اس منافع کا
چوتھائی حصہ یہاں منتقل کر دو‘ یہاں تک کہ اصل پوری ہو جائے اور اس کے بعد اس چوتھائی حصے
کا عمل جاری رکھو تاکہ یہ تم جیسوں کے کام آسکے۔ دل کے دروازے کشادہ رکھو اور کسی ضرورت
مند کی حاجت کو نظر انداز نہ کرو‘ بس یہی چند عمل ہیں اس دنیا میں انسان کے لیے‘ اور ان پر
گامزن رہو گے تو ذات ایزدی تم سے خوش ہو کر تمہاری محافظت کرے گی اس کے راستے چھوڑ
دینے والے تو بہت ہوتے ہیں‘ لیکن اس کے راستے منتخب کر کے چلتے رہو تو دنیا میں تمہارے
لیے مشکلات پیدا نہ ہوں گی۔ آؤ اب یہاں سے واپس چلتے ہیں‘ ایسی چیزوں کو عام لوگوں سے
پوشیدہ رکھا جاتا ہے اس کے راز دار صرف تم دونوں ہو‘ بہتر ہے اس وقت تک کسی تیسرے کو اس
کا پتہ نہ دینا جب تک تم میں سے ایک دنیا سے نہ سدھار جائے۔ آجاؤ! واپس چلتے ہیں۔‘‘

شرافت حسین اور رابعہ بیگم کے پاؤں لرز رہے تھے۔ قربت شاہ انہیں لیے ہوئے
اس دروازے سے باہر آگئے۔ الماری بند کی اور پھر بیرونی برآمدے تک پہنچ گئے۔

’’میں تمہیں یہی بتانے کے لیے اس وقت یہاں آیا تھا۔ شرافت حسین تم جو کچھ کر
رہے ہو کرتے رہو۔ میں نے تم میں وہ صلاحیتیں پائی ہیں‘ جو انسان کی ابتدا کو ظاہر کر دیتی ہیں
یعنی اس گھر کی صفائی کے لیے تم نے جو محنت کی ہے وہ میرے یقین سے آگے کی چیز تھی‘ کیونکہ
اتنے عرصے کے بعد ایک پرسکون پناہ گاہ حاصل کرنے والے ہفتوں تو کاہلوں کی طرح لوٹیں
لگاتے رہتے ہیں لیکن تم ان میں سے ہو جو اپنی جگہ صاف کر کے بیٹھتے ہیں‘ چنانچہ میں امید رکھتا
ہوں کہ تمہارا تابناک مستقبل تمہارے سامنے ہے۔ اب مجھے اجازت دو‘ ہو سکتا کہ جب تک

میری کوئی اہم ضرورت پیش نہ آئے‘ میں تم سے ملاقات نہ کر سکوں۔ خدا حافظ۔‘‘

قربت شاہ صاحب واپس مڑ گئے اور پہلے دن ہی کی مانند کوٹھی کے صدر دروازے
سے باہر نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ شرافت حسین کا بدن کانپ رہا تھا جو کچھ انہیں مل گیا
تھا اب اس کے لیے خواب کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ رابعہ بیگم تھیں‘ یہ گھر تھا‘ قربت شاہ کے
افکار و خیالات تھے۔ ان کی نعمتیں تھیں‘ یہ سب خواب کے عالم میں نہیں تھیں۔ وہ ہوش و حواس کی
دنیا کے انسان تھے اور قدرت کی دین کو خواب سمجھ کر اس کی تضحیک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

انہوں نے رابعہ بیگم سے کہا۔ ’’رابعہ بیگم‘ ہمیں اس بات پر شک نہیں کرنا چاہیے کہ
تقدیر نے ہمارے راستے کھول دیئے ہیں۔‘‘

’’ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔‘‘ رابعہ بیگم متاثر لہجے میں بولیں۔

’’میں سمجھتا ہوں رابعہ بیگم یہ صرف تمہارے قرب کی برکت ہے کہ پریشانیاں خود
بخود دور ہوتی جا رہی ہیں۔‘‘

’’یہ صرف آپ کی نیکیوں کا پھل ہے‘ آپ نے بھی تو مجھے اپنے قدموں میں جگہ
دے کر ایثار کیا ہے۔‘‘ رابعہ بیگم نے کہا۔

◊◊◊

بیگم ارباب آرام کر رہی تھی۔ شاہ جہاں جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو انہوں نے
کہا۔ ’’آؤ شاہ جہاں ٹھٹک کیوں گئیں؟‘‘

’’آپ آرام کر رہی تھیں‘ لیکن وہ......سلطانہ آئی ہے۔‘‘ شاہ جہاں نے کہا۔ اور
بیگم تویر ارباب اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ’’سلطانہ آئی ہے۔ کہاں ہے وہ؟‘‘

اسی وقت نور جہاں اور ممتاز کے ساتھ سلطانہ اندر داخل ہو گئی۔ بیگم ارباب نے نیچے
اتر کر اسے گلے سے لگا لیا۔

’’ماشاء اللہ چار دن میں شکل نکل آئی‘ خوش تو ہو سلطانہ؟‘‘

’’جی‘ بہت خوش۔‘‘ سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا تمہیں خوش رکھے۔ کس کے ساتھ آئی ہو؟ یقیناً عارض میاں لائے ہوں گے؟ آؤ بیٹھو، عارض کہاں ہیں؟ شاہ جہاں انہیں بھی بلا لو۔"

"کوئی نہیں ہے میرے ساتھ، میں تنہا ہی آئی ہوں۔"

"کچھ بتاؤ سلطانہ کیا ہو گیا' کیا بات ہے؟"

"نور جہاں اور ممتاز تم دونوں باہر چلی جاؤ۔ تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔" سلطانہ نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"دراصل ان کے سامنے میں یہ کہانی نہیں سنانا چاہتی تھی۔ کنواری لڑکیاں ہیں کچھ اچھا نہیں لگتا۔" بیگم ارباب بدستور الجھی ہوئی نگاہوں سے سلطانہ کو دیکھتی رہیں تب اس نے کہا۔

"وہ بیگم صاحبہ یہاں سے لے جانے کے بعد شاید ان دونوں خاتون اور حضرت کو یہ احساس ہوا کہ اب چونکہ شہریار صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں اور وہ جذباتیت میں ایک ایسا قدم اٹھا چکے ہیں جو سراسر غیر منافع بخش ہے تو دونوں اس سوچ میں گم ہو گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ میں درحقیقت اس وقت ایک لاوارث ہستی ہوں اور لاوارثوں کو پناہ دی جاسکتی ہے۔ انہیں گھر کی عزت نہیں بنایا جاسکتا۔ بے چارے اسی سوچ میں غرق تھے کہ میں نے ان کی یہ مشکل حل کر دی۔ میں دراصل یہ بات نور جہاں اور ممتاز کے سامنے نہیں بتانا چاہتی تھی کہ خوف کا وہ سفر جو میں نے تنہا ویرانوں میں کیا' ماں باپ کے بچھڑ جانے کے بعد وہ بالکل ہی تنہا نہیں تھا اس سفر میں کچھ درندے تھے جنہوں نے میرے جسم کو بھنبھوڑا اور مجھے دنیا کی بدترین ذلت سے دوچار کر دیا۔ میرا مطلب ہے پھوپی جان کے گھر میری حالت بگڑ گئی تو انہوں نے مجھے ایک ڈاکٹر کو دکھایا اور ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔" سلطانہ نے اتنی بے جھجک ہو کر یہ الفاظ کہے کہ شاہ جہاں اور بیگم ارباب سناٹے میں رہ گئیں۔ انہوں نے سلطانہ کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن اس پر ایک ٹھوس اعتماد نظر آ رہا تھا۔ بیگم ارباب کا چہرہ شدت پریشانی سے سرخ ہو رہا تھا۔ سلطانہ نے پھر کہا۔ "یہ سب کچھ میری توقع کے بھی خلاف تھا لیکن میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے نکل آئی۔ یہاں آ کر آپ کو یہ سب

کچھ بتانا بھی ضروری ہے لیکن ظاہر ہے میں آپ کو بھی پریشان نہیں کروں گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بیگم ارباب ہول کر بولیں۔

سلطانہ کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں اس لیے یہاں آ گئی کہ پہلے آپ کو صورت حال بتا دوں اس کے بعد دوسرے فیصلے کروں۔"

"دوسرے فیصلے؟" بیگم ارباب نے سراسراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیگم صاحبہ۔ سماج اور معاشرے کی نگاہ میں اب میں ایک باعزت لڑکی نہیں ہوں۔ یوں بھی کسی طور اب میں کسی شریف گھرانے کی بہو بننے کے قابل نہیں تھی۔ اگر کوئی یہ ایثار کرتا بھی تو خود بھی ساری زندگی کا کرب خرید لیتا اور مجھے بھی کرب کا شکار کر دیتا۔ جبکہ میرے پیش نگاہ ایک اور مقصد ہے۔"

"کیا؟" بیگم صاحبہ اب حیرتوں سے نکل آئی تھیں۔

"یہ تو ایک روشنی دکھائی ہے میرے رب نے مجھے بیگم صاحبہ۔ اب خود بتائیے میرا کوئی گناہ ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا وقت کے اس ہولناک دھارے میں بہہ جانے والی تنہا میری ذات ہو گی۔ کیا مجھ جیسی دوسری بے شمار لڑکیاں میرے جیسے عذاب میں گرفتار نہ ہوئی ہوں گی۔ کیا زمانہ انہیں اپنی ٹھوکروں میں نہ کچل دے گا۔ میں ان کومل جسموں کو زمانے کی ٹھوکروں سے بچانے کی آرزو رکھتی ہوں۔ پہلے اپنی ذات پر تجربے کروں گی اور ان تجربوں سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کو بچاؤں گی۔ یہ عورت کا کرب ہے مرد ہر حال میں اس پر حاوی ہے۔ چند بھیڑیے اسے لوٹ لیتے ہیں اور وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار بن جاتی ہے۔ دوسری قسم کے بھیڑیے اسے سماج کا ناسور بنا دیتے ہیں جبکہ اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ میری آرزو ہے کہ میں ان کے لیے سماج سے لڑوں۔"

"کیا کرو گی تم؟" بیگم ارباب نے پوچھا۔

"اب میں بے سہارا ہوں۔ یہ تجربہ کروں گی کہ بے سہارا لڑکیوں کے ساتھ سماج'

وقت' لوگ کیا سلوک کرتے ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوگا کہ وہ مجھے کہاں کہاں اور کس حال میں مل سکتی ہیں۔ اپنی مشکل سے نکل کر میں انہیں باآسانی تلاش کرسکوں گی اور پھر میں ان کی مدد کروں گی۔''

''تم اپنی اس مشکل کا کیا کرو گی جس کا انکشاف ہوا ہے؟''

''میری بے باکی کو معاف کریں بیگم صاحبہ۔ مگر کیا کروں حالات نے مجھ سے معصومیت کا وہ مقام چھین لیا ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ میری ذات میں شامل اس وجود کا کوئی قصور نہیں ہے میں اسے پورے احترام سے جنم دوں گی۔ اس کی پورے اعتماد سے پرورش کروں گی اور قدرت کے دوسرے فیصلوں کی منتظر رہوں گی۔''

''شاہ جہاں' تم اس لڑکی کو دیکھ رہی ہو۔ کتنا اعتماد ہے اسے خود پر۔ دوسروں کو تو یہ بالکل ہی بے وقوف سمجھتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے سلطانہ ہم تمہیں بے سہارا چھوڑ دیں گے؟'' بیگم ارباب گلوگیر لہجے میں بولیں۔ شاہ جہاں کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔

''اور میں' میں اسے تنہا دنیا کے ہاتھوں میں چھوڑ دوں گی' میں جس کے دل میں اس کے لیے ماں جیسا پیار جاگ اٹھا ہے جو صرف اس لیے دل مسوس کر اس سے جدا ہوگئی کہ وہ اپنے سسرال جارہی ہے۔ اس نے ہم سب کو اتنا ہی ذلیل سمجھ لیا ہے۔'' شاہ جہاں نے کہا۔

''پوچھو اس سے شاہ جہاں کہ اس نے ایسا کیوں سوچا؟'' بیگم ارباب نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''قصور میرا نہیں ہے بیگم صاحبہ۔ میں شاید حالات کو خود بخود سمجھنے لگی ہوں۔ ان حالات کے تحت ہی میں نے یہ بات سوچی تھی لیکن جو فیصلہ میں نے کیا ہے وہ اٹل ہے۔''

''سنو سلطانہ۔ باقی اپنے بارے میں تم خود فیصلہ کرسکتی ہو۔ بہت دور کا نہایت دور کا ایک رشتہ بھی ہے تم سے۔ لیکن میں اس رشتے کے حوالے سے تم پر کسی حق کا اظہار نہیں کرسکتی لیکن انسانیت کا وہی رشتہ جس کے تحت شاہ جہاں اور اس کی دونوں بچیاں میرے ساتھ رہ رہی ہیں تم سے بھی تو ہے۔ بے شک تم بے قصور ہو اور جو کچھ ہوا وہ ایک دردناک کہانی ہے لیکن ہم بھی تو اپنا فرض پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی تو روز عاقبت خدا کو اپنا منہ دکھانا ہے۔ میں تمہیں

یہاں قیام کی پیشکش کرتی ہوں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی تمہیں انور حسین کے سامنے تک نہیں لاؤں گی۔ نہ ہی ان سے کوئی شکوہ کروں گی۔ یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا خدا نے جسے جس قدر توفیق دی ہے وہ اسی کے تحت کام کرسکتا ہے۔ تم یہاں رہو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جو چاہو کرتی رہو۔ میں تمہاری معاون بنوں گی اور جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا' کرتی رہوں گی۔''

''بیگم صاحبہ اس عنایت کے لیے میں زندگی کے آخری سانس تک آپ کی ممنون رہوں گی لیکن میری زندگی شاید اب میرے مقصد کے لیے وقف ہوگئی ہے اور اسے چھوڑنا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف ہے اور میں ابھی اپنے آپ کو موت کے حوالے نہیں کروں گی۔''

''تمہارے مشن میں ہم سب تمہارے برابر کے شریک ہوں گے۔ اب ذرا اپنے ذہن کو تسلی دو اس کے بعد باقی ساری باتیں ہوں گی۔ جاؤ شاہ جہاں اسے لے جاؤ' پگلی ہے بالکل۔ بالکل ہی پگلی۔'' شاہ جہاں نے محبت سے سلطانہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے کر چل پڑی۔

نور جہاں اور ممتاز' سلطانہ کی واپسی سے بہت خوش تھیں لیکن شاہ جہاں جیسی جہاندیدہ نے صورت حال کا جو اندازہ لگایا تھا وہ کچھ اور تھا۔ نور جہاں سلطانہ سے شکایت کرنے لگی۔

''تم نے ہمیں وہاں سے کیوں بھگا دیا تھا؟''

''کہاں سے؟''

''بیگم صاحبہ کے پاس سے۔''

''کچھ ایسی باتیں کرنی تھیں جو بچوں کے سننے کی نہیں تھیں۔'' سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم بچے ہیں؟'' نور جہاں آنکھیں نکال کر بولی۔

''ہاں نور جہاں۔ وقت نے میرے لیے کچھ اور راستے متعین کردیئے ہیں جن میں میری عمر تم سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔'' سلطانہ الجھے الجھے انداز میں بولی اور پھر شاہ جہاں کی

آمد نے گفتگو کا یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

انیکسی میں شاہ جہاں اور اس کی دونوں بیٹیوں کے ساتھ سلطانہ کی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ شاہ جہاں درحقیقت زبان کی سچی تھی۔ جن جذبوں کے تحت اس نے سلطانہ کو اپنی بیٹی ظاہر کیا تھا اور ہر اچھے برے کا ساتھی بنا لیا تھا وہ آج بھی برقرار تھے۔ سلطانہ کی کیفیت کے پیش نگاہ شاہ جہاں اسے پھولوں کی طرح رکھتی تھی۔ لیکن سلطانہ کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔ اس دن کے بعد سے عارض نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اور وہ تجربات کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔

یہ کام جس کا اس نے بیڑہ اٹھایا تھا' ترک تو کسی قیمت پر نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن زمانے کو بہت غور سے دیکھنا ہوگا۔ لوگ کسی بات پر متاثر ہو کر اپنے جذبات تو پیش کر دیتے ہیں لیکن ان پر کاربند رہنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ وقت یہ تھی کہ وہ جن کیفیات سے گزر رہی تھی اس کا اظہار ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس اظہار کے ساتھ وہ پوری قوت سے باعمل نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر ایک دن انور حسین صاحب کچھ اور لوگوں کو ساتھ لے کر بیگم ارباب کے ہاں پہنچے۔ مہتاب بیگم بھی ساتھ تھیں البتہ دونوں بچے نہیں تھے۔ یہ لوگ جو انور حسین کے ساتھ آئے تھے اسی خاندان کے ساتھ تعلق رکھتے تھے اور بیگم ارباب کے زیادہ قریبی لوگوں میں سے تھے۔ بیگم ارباب انہیں دیکھ کر مسرور ہو گئیں اور ان کی آمد کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگیں۔ انور حسین نے تفصیلات سناتے ہوئے کہا کہ وہ یہاں قدم جمانے کے بعد ہندوستان میں جہاں جہاں ان کے عزیز و اقارب ہیں اور جو پاکستان آنا چاہتے ہیں' انہیں دعوت دے رہے ہیں۔

بیگم ارباب بہرحال ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں اور انھوں نے کہا تھا کہ ان کے لائق جو بھی خدمت ہو تو فوراً بتائی جائے۔ اسی وقت انور حسین کو سلطانہ کا خیال آ گیا اور وہ کہنے لگے۔

''محفوظ بھائی سے میں نے شہریار کی بچی کا ذکر کیا تھا۔ بہرحال بہت افسوس ہوا انہیں بھی' لیکن وہ لڑکی اب کہاں ہے؟''

''یہیں موجود ہے' انیکسی میں رہتی ہے۔''

''ارے تم نے ابھی تک اس سے پیچھا نہیں چھڑایا۔ بھئی۔ خاندانی رشتے اور محبتیں بے شک ایک حیثیت رکھتے ہیں لیکن عزت و وقار کا قائم رکھنا بھی ایک انسانی عمل ہی ہے۔ میں تو بہت ہی نیک جذبوں کے ساتھ اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن جو کرتوت اس کے بعد میں معلوم ہوئے' انہوں نے مجھے دل برداشتہ کر دیا۔ اپنی عزت تو کوئی نہیں گنواتا اور تو اور اس نے صاحبزادے پر بھی جال ڈال دیا تھا اور صاحبزادے بھی اس کے لیے جذباتی ہو گئے تھے۔ بعد میں ہم نے دماغ درست کر دیا تھا۔ اب تم خود سو نیکیاں بھی ایک حد رکھتی ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو بالکل بے عزت کر کے تو نیکیاں کمانے سے رہا۔ ویسے معاف کرنا تنویر بہن' تم نے یہ ذمہ داری قبول کر کے اپنی ذات کو داغ دار کر لیا ہے۔''

یہ مہمان تو چلے گئے لیکن بیگم ارباب کے لیے لمحہ فکر یہ چھوڑ گئے تھے۔ بلاشبہ یہ دقتیں تو پیش آئیں گی۔ اپنا معیار اور اپنا وقار بھی ایک چیز ہوتی ہے اور پھر اس انداز میں وہ سلطانہ کے لیے کیا کر سکیں گی۔ تاہم شاہ جہاں بیگم سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ جس انداز میں سلطانہ کو دلاسے دیئے تھے وہ بڑا جذباتی عمل تھا اور اس وقت واقعی یہ سب کچھ ضروری بھی تھا لیکن اب عقل ساتھ دے رہی تھی اور سوچ رہی تھیں کہ اس کہے کو نبھا پائیں گی یا نہیں۔ خاندان کا مسئلہ ہے۔ بس وہی ایک الگ تھلگ رہ جائیں گی ورنہ سارے ہی لوگ یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ پھر بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھیں اور ان کی بدلی ہوئی کیفیت سے ابھی شاہ جہاں وغیرہ کو کوئی واقفیت نہیں تھی۔ لیکن انداز تو چہرے سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں شاہ جہاں بیگم نے اس ہلکی سی کشمکش کو محسوس کر لیا جو ان احساسات کے ساتھ بیگم ارباب کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ جہاں کی زیرک نگاہوں نے یہ سب کچھ بھانپا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اور پھر چند ہی روز کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے سے سب سے پہلے سلطانہ کو آگاہ کیا۔

''سلطانہ بیٹی! میں نے ایسے چند اداروں کے بارے میں سنا ہے جہاں بے سہارا عورتوں کو کچھ کام وغیرہ مل جاتا ہے۔ میں کئی دنوں سے یہ بات سوچ رہی تھی کہ ہم چار جانیں بے مقصد بیگم ارباب کی روٹیاں توڑ رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیں سر چھپانے کا ٹھکانہ دیا یہی کیا

کم ہے کہ ہم اپنے اخراجات کا بوجھ بھی ان پر ڈالیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ ایسا ہی کوئی کام شروع کر دوں۔''

''میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی امی۔''

''نہیں بیٹی! ابھی تمہاری یہ دو بہنیں ہیں' میں ہوں۔ ہم تین افراد مل کر کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ تم اپنے مقصد کے بارے میں سوچتی رہو۔ میرا خیال ہے جب وہ وقت آئے تو تم بھی جیسے مناسب سمجھو کرنا۔''

''آپ دیکھ رہی ہیں کہ میرے اندر کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ میں بھی آپ کا ساتھ دوں گی۔''

بیگم ارباب کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی اور وہاں جا کر بات بھی کر لی۔ بعد میں انہوں نے بیگم ارباب سے اس کا تذکرہ کیا۔

بیگم ارباب ایک لمحے کے لیے شاہ جہاں بیگم کو دیکھتی رہیں' پھر آہستہ سے بولیں۔

''جیسا تم مناسب سمجھو شاہ جہاں' ویسے بھی اب کچھ اور لوگ آ رہے ہیں اور ان کے لیے بھی مجھے قیام کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' بیگم ارباب کے یہ الفاظ شاہ جہاں کے لیے جان لیوا تھے۔ لیکن خوش اسلوبی سے اس وار کو سہہ گئیں اور کہنے لگیں۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں بیگم صاحبہ کہ اب ہم اپنا بوجھ آپ پر سے اتار دیں۔''

''نہیں بھئی' بوجھ تو تم لوگ نہیں ہو' بس میں تو حالات کے تحت کہہ رہی تھی اور پھر ابھی ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ اپنے لیے کوئی مناسب بندوبست کر لو۔'' یہ الفاظ کسی سمجھ دار شخصیت کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ شاہ جہاں بیگم اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ سلائی کے اس ادارے میں پہنچ گئیں۔

کوئی ایسی الجھن والی بات نہیں ہوئی البتہ اب سلطانہ بیگم نے بھی یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ بیگم ارباب کے جذبے کچھ سرد پڑتے جا رہے ہیں۔ ٹھیک بھی تھا وہ کب تک اپنا مال لٹا سکتی تھیں۔ یہ دیوانگی ان کے ذہن پر تو طاری نہیں تھی جو سلطانہ کے اپنے ذہن پر

تھی۔ جس تن لاگے سو تن جانے والی بات تھی۔ اس پر جو بیتی تھی وہ اس کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ چنانچہ یہ مسئلہ یونہی جاری رہا کہ ایک دن ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔

شام کے چار بجے یہ لوگ اپنے سلائی کے ادارے سے واپس آ رہی تھیں کہ ایک اوباش سی شکل کے آدمی نے شاہ جہاں بیگم کا راستہ روک لیا۔ شاہ جہاں بیگم نے اسے دیکھا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دوسرے لمحے شاہ جہاں بیگم کے منہ سے بے اختیار آواز نکلی۔

''نوشہ میاں تم؟''

◇◇◇

شرافت حسین قربت شاہ کی گفتگو کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے اور رابعہ بیگم گہری سوچوں میں گم تھیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

''دیکھئے قربت شاہ صاحب نے ہمیں کھلی اجازت دی ہے کہ ہم اس گھر کو اپنے گھر کے طور پر استعمال کریں۔ اس کے علاوہ جو کچھ نصیحتیں انہوں نے کی ہیں ان میں یہ بات واضح ہے کہ شک و شبے کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ میرے خیال میں الجھنوں اور پریشانیوں سے نکل کر ہمیں اب زندگی کی تعمیر کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ آپ کے چہرے کی پریشانی دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ شکوک و شبہات کی منزل میں ہیں۔''

''بخدا اس انسانی کمزوری سے انحراف نہیں کروں گا۔ آخر قربت شاہ صاحب ہیں کون؟''

''جب یہ بات انہوں نے خود ہمیں نہیں بتائی تو میرے خیال میں ہمیں اس کا زیادہ تجسس بھی نہیں کرنا چاہیے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ چلو کچھ کھانے پینے کی تیاریاں کر لو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اس کے بعد آرام سے گفتگو کریں گے۔''

باورچی خانے میں جو کچھ تھا اسی میں سے اس وقت کا کھانا تیار کیا گیا اور اس کے

بعد وہ اپنے منتخب شدہ کمرے میں آ گئے۔ یہاں مسہریاں بھی تھیں اور فرنیچر بھی تھا۔ گو پچھلی رات انہوں نے قالین پر گزاری تھی۔ لیکن آج دونوں بستر آراستہ ہو گئے تھے چنانچہ قربت شاہ کے حکم کے مطابق انہی بستروں پر ڈیرہ جمایا گیا۔ رابعہ بیگم کہنے لگیں۔

''اور اب آپ کے شانوں پر جو ذمہ داریاں آ پڑی ہیں انہیں نبھانے کے لیے تیار ہو جائیے۔''

''بھئی آخری بار کہہ رہا ہوں شانوں نہیں' شانہ کہو۔''

''آپ ذرا سوچئے کہ خداوند عالم نے جو کچھ آپ سے لیا اس کے عوض آپ کو اتنا کچھ دے دیا کہ کم از کم ہم یہاں تصور نہیں کر سکتے تھے۔ بہتر ہے جو اس نے لے لیا اس کا شکوہ نہ کریں جو موجود ہے اس کا شکر کریں۔''

''بخدا نصف بہتر بڑی اچھی باتیں کرتی ہو۔ یوں لگتا ہے کہ تمہاری قربت میں ہم سچ مچ سب کچھ بھول جائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کرنا کیا چاہیے؟''

''اگر اس کے لیے کل صبح سوچیں تو بہتر ہے۔ اس وقت آرام کیجئے گا۔''

''ہاں۔ لیکن ابھی ہم نے ایک جملہ کہا تھا آپ سے' محترمہ رابعہ بیگم۔''

''کیا؟''

''ہم نے کہا تھا کہ شاید آپ کی قربت ہمیں سب کچھ بھلا دے گی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمیں ابھی تک وہ قربت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے لیے کوئی بہتر تجویز پیش کیجئے۔ ہم آپ سے مشورہ مانگ رہے ہیں۔''

رابعہ بیگم نے عجیب سی نگاہوں سے شرافت حسین کو دیکھا اور آہستہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں آ بیٹھیں۔ ان کے چہرے پر عجیب سی ہیجان خیزی پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر انہوں نے شرافت حسین کے دونوں پاؤں پکڑتے ہوئے کہا۔

''مم...... میں...... میں اپنی کمزوریوں کو آپ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی۔ سب کچھ تو بتا چکی ہوں۔ آپ کو اور اب...... اب۔''

شرافت حسین اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے رابعہ بیگم کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں

میں تھامتے ہوئے کہا۔

''رابعہ بیگم جب قاضی صاحب نکاح پڑھا رہے تھے تو ہم نے جن آیات مقدسہ کی چھاؤں میں آپ کو اپنی زوجیت میں قبول کیا تھا بخدا ہمیں ان کی بے حرمتی مقصود نہ تھی۔ ہم نے سچے اور صاف دل کے ساتھ آپ کو سچے اور پاک انسان کی حیثیت سے اپنی زندگی میں جگہ دی ہے اور آپ سے درخواست کی تھی کہ ماضی کے ان زخموں کو بھول جائیے جو وحشی درندوں کے ہاتھوں لگے ہیں مگر شاید آپ نے ہماری درخواست قبول نہیں کی۔ ہماری سچائی پر یقین نہیں کیا۔''

رابعہ بیگم نے مضبوطی سے شرافت حسین کے پاؤں پکڑ کر آہستہ سے کہا۔

''میں خود کو آپ کے قابل نہیں پاتی لیکن آپ اگر مجھے اپنے قابل پاتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ میری ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔''

شرافت حسین صاحب کا اکلوتا ہاتھ آگے بڑھا اور انہوں نے ایک بار پھر رابعہ بیگم کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ رابعہ بیگم کی آنکھوں سے سارے آنسو بہہ گئے اور انہی آنسوؤں میں دل کی وہ ساری کجلاہٹیں بھی بہہ گئیں جنہوں نے رابعہ بیگم کو داغدار کر دیا تھا اور دوسری صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ بالکل ایسے ہی محسوس ہوئی جیسے انہوں نے کبھی اپنے گھر کے آنگن کے درخت پر سنی تھی۔ گویا روحوں کی پاکیزگی نے جسموں کے داغ بے مقصد کر دیئے تھے۔ شرافت حسین نے معمولات سے فارغ ہو کر کہا۔

''اب ہم اس قرض کی ابتدا کرتے ہیں رابعہ بیگم جس کی اجازت ہمیں قربت شاہ نے دی ہے۔ یعنی کچھ رقم کی حاجت محسوس ہو رہی ہے۔ پہلے میں آپ کے باورچی خانے کے لیے انتظامات کر دوں اور اس کے بعد اس جہان رنگ و بو میں اپنا مقام تلاش کروں۔''

''بہتر ہے ہمیں اس قرض کی اجازت مل گئی ہے اس لیے ہم احتراز نہیں کریں گے۔''

شرافت حسین کا رخ اس تہہ خانے کی طرف ہو گیا تھا اور اس کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ بازار پہنچے۔ کیفیت وہی تھی۔ بے خانماں جگہ جگہ پھر رہے تھے۔ شرافت حسین کا دل ان کے لیے روتا رہا جو کچھ خرید و فروخت کی تھی اس میں سے آدھی ان کے حوالے کی باقی لے کر گھر واپس آ گئے اور انہوں نے جو کچھ لیا تھا اسے ایک جگہ تحریر کر دیا تھا کہ قرض کی واپسی میں

کوئی الجھن نہ پیش آئے۔ یوں کئی روز گزر گئے اور اب شرافت حسین اپنے لیے کوئی ایسا ذریعہ تجارت تلاش کرنے لگے تھے جس پر کام کر کے اپنی زندگی کی گنجائش نکال سکیں۔

پھر ایک دن تقریباً دس بجے گھر سے نکلنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ کوٹھی کے صدر دروازے پر کچھ افراد نظر آئے۔ سب سے آگے معمر بزرگ تھے۔ ان کے پیچھے میلی کچیلی چادر میں لپٹی ہوئی ایک خاتون' ان کے ساتھ دو لڑکے اور ایک خوبصورت سی لڑکی۔ شرافت حسین اور رابعہ بیگم انہیں دیکھتے رہے۔ دروازے سے ہی ایک زوردار کڑک سنائی دی۔

''میاں کیا شرافت حسین صاحب اسی گھر میں رہتے ہیں؟''

''جی.........جی' تشریف لائیے۔ تشریف لائیے۔'' شرافت حسین نے کہا اور وہ معمر بزرگ آگے بڑھ آئے۔

چہرے پر غم و اندوہ کے سائے بکھرے ہوئے تھے لیکن آواز کی کرج بے مثال تھی۔ بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھ آئے اور بولے۔

''حضرت یہ پرچا ذرا شرافت حسین صاحب کو دے دیجئے گا۔ ان سے ملنا ہے ہمیں۔''

''آپ اندر تو تشریف لائیے۔ میں ہی شرافت حسین ہوں۔'' شرافت حسین نے پرچا ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا اور بزرگ پیچھے رخ کر کے بولے۔

''آ جاؤ مہرالنساء بیٹی۔ آؤ سب لوگ اندر آ جاؤ۔'' وہ سب برآمدے میں پہنچ گئے۔

تب شرافت حسین نے پرچا پڑھا۔ لکھا تھا۔

''میاں شرافت حسین' ملت علی خان کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ ان کی رہنمائی کرو اور انہیں اپنی قربت میں جگہ دو۔ بڑے اچھے انسان ہیں۔ تمہارے لیے بہتر ثابت ہوں گے۔ ان سب کو اپنی محبت کے سائے میں اسی گھر میں جگہ دے دو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔''

شرافت حسین نے پرچا پڑھا اور پھر بزرگ کی طرف رخ کر کے بولے۔

''میں آپ کو اس غریب خانے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ بخدا آپ کے آنے سے میری ہمت بندھ گئی ہے ورنہ بڑا پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ تشریف لائیے یہاں جو کچھ ہے اسے اپنا ہی سمجھیے گا۔ ہم آپ کی خدمت کر کے بڑے مسرور ہوں گے۔ یہ میری بیوی رابعہ ہیں اور پرچے کے مطابق آپ کے نام سے واقفیت حاصل ہو چکی ہے' یعنی ملت علی خان۔''

''ہاں بیٹے۔ یہ مہرالنساء ہے میری بہو' یہ میری پوتی ثمرالنساء ہے اور یہ دونوں پوتے جواد اور سجاد۔ بس کیا کہانی سنائیں تمہیں اپنی۔ یوں سمجھ لو کہ حصول وطن کے لیے جو کچھ خدا نے ہم سے مانگا ہم نے اس کے سپرد کر دیا اور تب وطن عزیز کی زمین دیکھنا نصیب ہوئی۔ خداوند عالم اسے تاابد پائندہ وسلامت رکھے۔''

شرافت حسین خاموش ہو گئے۔ قربت شاہ صاحب کا حکم تھا کہ جو کچھ ہے اسے سینے میں محفوظ رکھا جائے ورنہ جی تو چاہا تھا کہ ملت علی خان کو یہ بتا دیتے کہ صاحب ہم بھی کل تک آپ جیسے ہی تھے۔ بس تقدیر کے فیصلے ہر عمل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ملت علی خان اس کوٹھی میں کیا آئے تھے گویا بہار آ گئی تھی۔ بڑی کڑک دار آواز تھی۔ پوری کوٹھی میں دندناتے پھرتے تھے۔ رابعہ بیگم بھی خوش تھیں۔ مہرالنساء بے حد نرم خو تھیں اور رابعہ بیگم کے حسن سلوک سے ان کے دل میں بھی رابعہ بیگم کی محبت پیدا ہو گئی اور پھر تینوں بچے جن کی چہکار اس کائنات میں قدرت کا سب سے بڑا انعام تھی۔ مہرالنساء نے بتایا تھا کہ ان کے شوہر وحدت علی خان ایک کام سے چلے گئے تھے۔ دراصل ان کے ایک بہت ہی قریبی د[illegible]ادر بیگ ولایت جا رہے تھے اور انہوں نے وحدت علی خان کو لکھا تھا کہ وہ ان کے پاس آ جائیں۔ بس اس کے بعد حالات خراب ہو گئے اور پھر بحالت مجبوری ان کے بغیر پاکستان آنا پڑا۔ ابا میاں (یعنی ملت علی خان) بڑی احتیاط سے بچوں کو یہاں تک لے آئے لیکن وحدت علی خان ابھی یہاں تک نہیں پہنچے۔ مہرالنساء آبدیدہ ہو کر کہتی تھیں۔

''پتا نہیں انہیں ہمارا پتا کیسے معلوم ہوگا؟''

دوسرے دن دونوں حضرات علی الصبح سبزی منڈی پہنچ گئے اور اس دن جب دوپہر کے بعد گھر لوٹے تو منافع کی بہترین رقم ان کے ساتھ تھی۔ شرافت حسین نے اس سلسلے میں ملت علی کو الگ نہ رکھا اور حاصل شدہ منافع کے دو حصے کر لیے گئے جس میں سے ایک حصہ ملت علی خان کے حوالے کر دیا گیا اور دوسرے حصے میں سے شرافت حسین نے تھوڑی سی رقم قرض کے حساب میں واپس کر دی۔ باقی اپنے خرچ کے لیے محفوظ کر لی۔ ملت علی خان نے اس رقم کو لینے سے انکار نہیں کیا تھا' البتہ شام کو وہ کہنے لگے۔

''بھئی اب ہماری مہمان داری تو ختم۔ اس کے بعد ہم گھر کے معاملات میں بھی

کچھ ہاتھ بٹائیں گے۔''

''چچا جان، ہم دو افراد ہیں۔ ہمارا اتنا خرچ نہیں ہے۔ اگر اس میں سے کچھ خدمت آپ کی ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں اس میں غیریت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔''

''بات تو ٹھیک کہتے ہو میاں لیکن ہم ہیں ذرا چکر باز آدمی۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ تمہارے ساتھ مستقل ہی ڈیرہ ڈال دیا جائے۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ تم کبھی ہمارا بار نہ محسوس کرو۔ ہم اس نظریئے کے تحت کچھ حساب کتاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔''

''اس کی ضرورت پیش آئی تو میں آپ سے عرض کر دوں گا۔ آپ کے ساتھ ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ ویسے اس دوران آپ کو اپنے صاحبزادے کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتے رہنا چاہیے۔''

''ہاں ہم سوچ رہے تھے کہ کیمپوں میں اندراج کرا دیں اور اپنا پتہ وہاں دے دیں تاکہ وحدت میاں واپس آئیں تو انہیں ہمیں تلاش کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔''

''یقیناً...... یقیناً کل ہی اس کام کے لیے چلیں گے۔''

''نہیں میاں آپ کہاں...... آپ یوں کریں کہ کل صبح کی خریداری ہم کر لیں گے۔ فروختگی آپ اپنے ذمہ لے لیں۔ ہم ذرا اپنا یہ کام کر آئیں گے اور ویسے بھی دو بجے کے بعد تو ہمیں وقت ملتا ہی ہے۔ کیمپوں میں تو چوبیس گھنٹے کام ہو رہا ہے۔''

ملت علی خان نے دو تین دن کے بعد بتایا کہ انہوں نے تقریباً تمام کیمپوں میں وحدت علی کے نام کا اندراج کرا دیا ہے اور اپنا پتہ وہاں چھوڑ دیا ہے۔ مہر النساء اکثر یہ سوال کرتی رہا کرتی تھیں کہ وحدت علی خان کے بارے میں کچھ پتا چل سکا یا نہیں۔ تو ملت علی خان انہیں یہی جواب دیتے کہ بیٹی اب تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔

آموں کی فصل آ چکی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے تھے۔ پھر اک دن پہلی بار سبزی منڈی سے عمدہ قسم کے آم بچوں کے لیے لائے گئے اور یہ اتفاق تھا کہ اسی شام بادلوں سے بوندیں برسنے لگیں۔ ماحول بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔ فضا میں ایک عجیب سی رنگینی رچ گئی تھی۔ بچے آم کھانے کے لیے بے تاب ہو گئے تھے چنانچہ پانی میں آم بھگو دیئے گئے اور اس کے بعد انہیں اجازت دی گئی کہ اب وہ کھل کر کھائیں۔ شرافت حسین خود بھی آموں سے شغف

رکھتے تھے انہوں نے نفیس قسم کے آموں کا ایک حصہ اپنے اور ملت علی خان کے لیے مخصوص کیا اور کھلے حصے میں جا بیٹھے۔ ملت علی خان نے چند آم اس میں سے اٹھائے اور پھر بولے۔

''میاں ذرا ہمیں اجازت دیجیے گا ابھی حاضر ہوتے ہیں۔''

وہ ایک گوشے میں چلے گئے اور جب کافی دیر تک ان کی واپسی نہ ہوئی تو شرافت حسین جو ان کا انتظار کر رہے تھے، یہ معلوم کرنے کے لیے وہاں تک گئے کہ نہ جانے ملت علی خان ابھی تک کیوں نہیں آئے ہیں۔ دیکھا کہ ملت علی خان جائے نماز بچھائے بیٹھے ہیں۔ سامنے آم رکھے ہوئے تھے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ غالباً وہ فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔ یہ منظر رقت آمیز تھا۔ شرافت حسین انہیں دیکھتے رہے پھر ملت علی خان نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شرافت حسین کی طرف دیکھا اور کسی قدر خجل سے ہو گئے۔ شرافت حسین بغور ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات ان کے ذہن میں آ رہے تھے۔ ملت علی خان نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن رو پڑے۔ شرافت حسین بے قرار ہو کر ان کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''چچا جان میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ کو کسی ایسی بات کے لیے مجبور کر سکوں جو آپ اپنے سینے میں دبائے ہوئے ہیں لیکن ان آنسوؤں کی وجہ جاننے کی خواہش میرے دل میں بیدار ہو رہی ہے۔''

ملت علی خان جو ہر وقت ہنستے بولتے رہتے تھے پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر شرافت حسین کے سامنے رو پڑے۔

''کیا بتائیں شرافت میاں۔ کیا بتائیں؟ یوں سمجھو کہ تقدیر نے ایک داغ ہماری پیشانی پر ڈال دیا ہے۔ جھوٹ بولنے کا داغ...... بخدا ہم جھوٹ بولنے کے قابل نہ تھے لیکن...... ہم اس بچی کی چوڑیاں اپنے ہاتھ سے نہیں اتار سکتے۔ ہم ان بچوں کی آنکھوں کے روشن چراغ نہیں بجھا سکتے۔ ہم اس بات کے منتظر ہیں کہ وقت کا مرہم معجز نمائی کرے اور ان کے سینے اس غم سے خود بخود آزاد ہو جائیں۔''

''مم...... میں...... میں سمجھا نہیں چچا جان۔'' شرافت حسین نے ملت علی خان سے کہا۔

''کیا بتائیں شرافت میاں؟ کیا بتائیں؟ وحدت ہمارا اکلوتا بیٹا تھا۔ ہمارا اکلوتا چشم و

چراغ۔ ہماری آنکھوں کا نور۔ ہمارے گھر کی روشنی۔ ہم نے اسے اس کی والدہ کے انتقال کے بعد ماں بن کر پرورش کیا تھا لیکن اس باپ کے سینے کے بوجھ کا وزن پوچھو جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے کڑیل جوان کو ٹکڑوں میں تقسیم دیکھا ہو۔ ہاں وحدت علی خان بھیڑیوں کی نذر ہو گئے تھے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے۔ بس ہم نے ان کے بدن کے ٹکڑے جمع کیے اور ان کی تدفین کر دی۔ آہ! ہم وہ بدنصیب باپ ہیں جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کی قبر کھودی اور اس کے جسد خاکی کو لحد میں اتارا۔ لیکن ہم ان بچوں کو اور اس معصومہ کو یہ بتانے کی ہمت آج تک نہیں کر پائے کہ جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں وہ شہید، جنت نشین ہو گیا ہے۔ کیسے بتائیں ہم انہیں شرافت میاں، کیسے بتائیں۔ یہ ہمت ہم نے اپنے اندر نہیں پائی اور اب تک جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ بخدا ہم اس جھوٹ پر شرمسار ہیں لیکن اپنے دل کی کمزوری کا ہم کوئی علاج نہیں کر پائے۔''

شرافت حسین کا دل غم واندوہ میں ڈوب گیا تھا کون تھا جس کے ساتھ یہ کہانی منسلک نہیں تھی۔ بے شمار بے خانماں خاندان ایسی ہی آگ میں جی رہے تھے کہ اگر اس کی تفصیل معلوم ہو جائے تو دل ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ بمشکل تمام انہوں نے ملت علی خان کو سہارا دے کر کہا۔

''یہ مجبوری ہے آپ نے آج تک جو بات ان سے کہی ہے اسے نبھاتے رہے۔ وقت خود انہیں صبر دے دے گا اور اس کا مرہم ان کے زخموں کو بھر دے گا۔''

ملت علی خان صاحب روتے رہے تھے پھر انہوں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''بارش کا پہلا چھینٹا پڑتا تو وحدت آم لے کر آتے تھے زمینوں سے اور ہم پہلی بار یہ آم کھایا کرتے تھے۔ میں بس جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کے ایصال ثواب کے لیے اس طرف آ گیا تھا۔ تم سے درخواست ہے کہ اس راز سے رابعہ بٹی کو بھی آگاہ مت کرنا۔ ہو سکتا ہے ان کے منہ سے کبھی مہرالنساء کے سامنے یہ الفاظ نکل جائیں۔ میرا جھوٹ ان کے سامنے آئے گا تو میں شرمندگی سے گردن نہیں اٹھا سکوں گا۔''

''آپ اطمینان رکھیے گا۔ یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا، آپ کی امانت کے طور پر۔'' شرافت حسین نے جواب دیا اور پھر ملت علی کو اپنے ساتھ لے آئے۔

وہ بے چارے آنسو بہاتے جا رہے تھے اور آم کھاتے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ان آنسوؤں نے شرافت حسین کی آنکھیں بھی نم کر دیں۔ کہانیاں تو سبھی یکساں ہی تھیں۔ بچھڑے ہوؤں کے غم سے سبھی کے سینے داغ دار تھے۔ جانے کون کون کیا کیا کھو بیٹھا تھا؟

کتاب وقت کا یہ صفحہ پر ہوا تو دوسرا صفحہ سامنے آ گیا جو سادہ تھا اور اس پر آنے والے وقت کی تحریریں کندہ ہونا تھیں۔ کوٹھی میں ملت علی خان اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ اور شرافت حسین، رابعہ بیگم کے ساتھ سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔

آڑھت کا کاروبار بہت خوش اسلوبی سے چل رہا تھا اور ان لوگوں کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے تھے کہ اب انہیں کسی مالی پریشانی کا شکار نہیں ہونا پڑتا تھا۔ قدرت نے رابعہ بیگم کو اولاد سے نہیں نوازا تھا لیکن اس کی کسر پہلے سے پوری کر دی گئی تھی۔ یعنی جواد اور سجاد اور اس کے علاوہ بیٹی کی حیثیت سے ثمرالنساء جو بہت ہی خوبصورت اور نیک سیرت لڑکی تھی۔ رابعہ بیگم اور مہرالنساء مشترکہ طور پر ان بچوں کی پرورش کر رہی تھیں۔

بہر طور شرافت حسین کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ بزرگ ملت علی خان جو مشورہ دیں گے وہ بہتر ہوگا۔ چنانچہ اس وقت انہوں نے ملت علی خان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا اور ملت علی خان مسکرا کر بولے۔

''بیٹھو بھئی بیٹھو۔ حقے کے تمباکو کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ کمبخت ایک طرح کا دیتے ہی نہیں۔ ہر بار ذائقہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ میں کہہ کر لاتا ہوں کہ مجھے وہی تمباکو دیا جائے جس کا میں عادی ہو گیا ہوں۔ اس پریشانی کا کیا حل دریافت کیا جائے؟''

''اگر ہم زیادہ تمباکو خرید لیں تو؟''

''خراب ہو جاتا ہے۔ کیڑے پڑ جاتے ہیں۔'' ملت علی خان صاحب نے جواب دیا۔

''کسی تمباکو والے سے اس سلسلے میں مشورہ کر لیا جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں شام کو یہ کام کر دوں گا۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے۔ تمباکو کا مزا ایک نہ ہو تو حقہ پینے کا لطف ہی جاتا رہتا ہے۔ بیٹھو میاں کھڑے کیوں ہو؟''

شرافت حسین خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ ملت علی خان نے ان کا چہرہ دیکھا اور

آہستہ سے بولے۔

''کچھ الجھن کا شکار نظر آتے ہو؟''

''جی ہاں میں اس وقت سے ایک عجیب مخمصے میں پھنس گیا ہوں چچا جان جس وقت سے ان بزرگ نے قربت شاہ کے بارے میں تفصیلات بتائی ہیں۔''

''ہاں بھئی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ واقعہ ہماری زندگی کا جیتا جاگتا واقعہ تھا۔ ویسے تو میں نے بزرگوں کے اور نیک انسانوں کے بہت سے واقعات سنے ہیں۔ کچھ نگاہوں سے بھی گزرے ہیں لیکن یہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے جس پر عقل واقعی حیران رہ جاتی ہے۔''

''قربت شاہ صاحب کی نیکیوں سے تو کوئی انکار ہی نہیں۔ زندگی بنا گئے ہماری۔ لیکن میری الجھن ذرا مختلف ہے۔'' شرافت حسین نے کہا۔

''وہ کیا......؟'' ملت علی خان نے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

شرافت حسین کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے پھر انہوں نے کہا۔

''غالباً یہ آپ کی نیک نفسی ہے کہ آپ نے کبھی مجھ سے اس بارے میں کچھ سوالات نہیں کیے۔ اتنا تو خیر میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ میں بھی ہجرت کر کے پاکستان پہنچا تھا اور یہاں گوں ناگوں مسائل کا شکار رہا۔ یہاں تک کہ رابعہ بیگم سے ملاقات ہوگئی اور ہم دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ بعد میں میری ملاقات قربت شاہ صاحب سے ہوئی تھی اور وہ مجھے اس مکان تک لائے تھے جس کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ یہ ان کی اپنی ملکیت تھا۔ میرے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور میں اس الجھن کا شکار تھا کہ اب زندگی گزارنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟ اس کوٹھی میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں دنیا کی ہر شے موجود تھی۔ یہاں تک کہ اس وقت باورچی خانے میں کھانے پینے کی اشیاء بھی وافر مقدار میں تھیں لیکن قربت شاہ صاحب نے مجھ سے دوسری ملاقات کی اور ایک راز کا انکشاف کیا جو آج تک میرے سینے میں پوشیدہ ہے۔''

''راز؟'' ملت علی صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

''جی۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جا کر ایک ایسے خزانے سے آشنائی کرائی جس کی مالیت اس دور میں نہ جانے کہاں سے کہاں تک جاتی ہے۔ قربت شاہ صاحب نے

مجھے حکم دیا کہ اس خزانے کا تھوڑا سا حصہ لے کر کسی کاروبار کا آغاز کروں اور اسے یعنی اس حصے کو اپنے اوپر قرض تصور کروں اور واپس اسی جگہ واپس رکھوں۔ میں نے اس قرض کا باقاعدہ حساب رکھا اور اک تھوڑی سی رقم اس میں سے حاصل کرلی۔ یہ وہی لمحات تھے جب میری آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے آپ کے ساتھ شامل ہو کر یہ آڑھت کا کاروبار شروع کیا اور خدا نے ہمیں پہلے ہی مرحلے میں کامیابی سے ہم کنار کیا۔ چچا جان اس کے بعد میں نے اپنی اس کمائی سے ایک ایک پائی کا حساب کر کے وہ رقم واپس خزانے میں پہنچا دی جو میں نے قربت شاہ صاحب کے حکم سے اس میں سے لی تھی اور اس کے بعد میں نے اس خزانے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ خدا نے ہمیں مسلسل کامیابیاں دیں اور ہم اپنی ایک حیثیت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ خزانہ جوں کا توں محفوظ ہے۔ میں نے تو بس یہی سوچا تھا کہ ٹھیک ہے قربت شاہ صاحب سے دوسری ملاقات نہیں ہوئی لیکن یہ ان کی امانت ہے۔

اب ان معمر بزرگ نے جو داستان سنائی ہے اس نے مجھے ششدر کر دیا ہے اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر وہ خزانہ زیر زمین رہ کر خاک ہو جائے تو کیا یہ مناسب ہوگا؟ اس دولت کو کیا ہم کسی مصرف میں لا سکتے ہیں؟ یہ مصرف معاف کیجئے گا قربت شاہ صاحب کے نام پر ہی ہوگا۔ یعنی کوئی بھی ایسا نیک کام کوئی بھی ایسا مدرسہ، مسجد یا ایسا وقف ادارہ جو قربت صاحب کی روح کے لیے ایصال ثواب کی حیثیت رکھتا ہو۔ قائم کر کے یہ دولت اس کے لیے وقف کی جا سکتی ہے؟ یا پھر کوئی اور ایسا نظریہ جو اس دولت کا صحیح مصرف دریافت کر لے۔ میں مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں اور ایک طرح کی وعدہ خلافی کی گئی ہے قربت شاہ صاحب سے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس راز کو اپنے سینے میں ہی دفن رکھوں لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد میں اس الجھن کا شکار ہو گیا ہوں کہ اسے اپنے سینے میں ہی لیے لیے مرجاؤں یا پھر اس کا کوئی مصرف دریافت کر لیا جائے۔ آپ مجھے مشورہ دیجیے چچا جان۔ اس سلسلے میں کسی مفتی، مولوی سے فتویٰ لیا جائے یا اپنے طور پر کچھ کیا جائے یا خاموشی اختیار کر لی جائے۔ بخدا مجھے اس میں سے ایک پائی درکار نہیں ہے۔ خدا کے فضل اور قربت شاہ صاحب کی دعاؤں نے مجھے خود اس قابل کر دیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ سکون سے زندگی گزار رہا ہوں۔ میری نگاہوں میں صرف ایک ہی مرحلہ ہے اور وہ ہے ثمر کی شادی کا تو انشاء اللہ اس کے لیے ہمیں کوئی مشکل درپیش نہ ہوگی۔ ہم اپنے

وسائل ہی سے سب کچھ کرسکتے ہیں۔ باقی جواد اور سجاد ہیں۔ دونوں پڑھ رہے ہیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمتیں کریں گے یا جو کچھ بھی مناسب سمجھیں گے۔ مسئلہ صرف اس کا ہے کہ اس دولت کو ضائع ہونے دیا جائے یا اسے کسی کام میں لایا جائے۔ بخدا میں قربت شاہ صاحب کے حکم سے انحراف بھی نہ کرتا اور اس راز کو اپنے سینے میں لیے لیے ہی مرجاتا اگر میرے علم میں یہ بات نہ آتی کہ وہ بقید حیات نہیں ہیں۔ ذرا سی الجھن ہے تو اس بات پر کہ کہیں اس طرح یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد بھی مجھ پر کوئی ذمہ داری تو عائد نہیں ہوجاتی۔''

''ہاں میاں۔ یہ شرعی مسائل ہیں۔ اس سلسلے میں حتمی فیصلہ نہ تم کرسکتے ہو نہ میں۔ ہمیں کسی دین دار شخص سے رجوع کرنا ہوگا لیکن ایک ایسے شخص سے جو خود اپنا سینہ فراخ رکھتا ہو ورنہ کچھ اور گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن ہم اصل حقیقت بتائیں گے ہی نہیں۔ ہمیں یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ خزانہ کتنی بڑی مالیت کا ہے۔ یہ شرعی مسئلہ تو تھوڑی سی دولت کے لیے بھی وہی صورت رکھتا ہے جو بڑی دولت کے لیے۔''

''ہاں یہ درست ہے۔ بہر طور اگر تم یہ مناسب سمجھتے ہو تو پھر کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرلو جو صحیح طور پر ہماری رہنمائی کرسکے۔''

''میں کل ہی اس سلسلے میں معلومات حاصل کروں گا۔ بس آپ سے مشورہ کرنا افضل سمجھتا تھا۔ جب آپ کی بھی یہی ہدایت ہے تو میرا خیال ہے ہمیں اس سلسلے میں قدم اٹھا لینا چاہیے۔ اچھا ہے کچھ ثواب ملے گا۔ ویسے بھی یہ قربت شاہ صاحب وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ایسے وقت میں ہمیں سنبھالا جب ہمارے سامنے خدا کی ذات کے سوا کچھ نہیں تھا۔'' شرافت حسین عقیدت سے بولے اور ملت علی سر ہلانے لگے۔

''ان کا جتنا احسان تم پر ہے اتنا ہی مجھ پر بھی ہے۔ مجھے تو انہوں نے تم جیسے فرشتہ صفت کے پاس بھیجا اور تم نے مجھے سر آنکھوں پر قبول کیا ہے اب یہ حکم الٰہی ہے کہ اس نے ہمارے لیے رزق حلال مہیا کردیا اور نہ تمہاری نیت میں فتور آیا اور نہ ہی میں نے کبھی کسی غلط انداز میں سوچا۔''

''جی...... جی بے شک۔'' شرافت حسین نے گردن ہلائی اور بولے۔ ''تو پھر یہ

بات طے ہوگئی کہ میں اس سلسلے میں فتویٰ حاصل کرلوں؟ آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔'' شرافت حسین اٹھ گئے۔

◇◇◇

گھنی مونچھوں والے نوشہ میاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''قسم ولیوں کی انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ تلاش کرکے رہوں گا۔ سو دیکھ لو' کیسا پایا۔ اے جی کہاں رہ رہی ہو' کہیں نظر نہیں آئیں۔''

شاہ جہاں بیگم نے گھبرائی ہوئی نظروں سے سلطانہ کو دیکھا اور پھر بدحواسی کے عالم میں بولیں۔

''وہ سامنے ہی تو کوٹھی میں رہتی ہوں۔''

''کون سی کوٹھی؟''

''وہ پہلی والی۔''

''اے سبحان اللہ۔ کوئی تیر دکھا دیا آتے ہی۔ واللہ کمال کیا' چلو دیکھیں تمہاری کوٹھی۔''

''کہاں کی ہانک رہے ہو نوشہ میاں۔ دماغ خراب ہوا ہے تمہارا۔ جاؤ میاں اپنی راہ لو اب ہمارا کیا واسطہ؟''

''ایں۔ قسم ولیوں کی ایسی بے مروتی کے لیے تو سوچا بھی نہ تھا۔ ارے لڑکیوں دیکھ رہی ہو ان کی بے وفائی۔''

''آگے بڑھو نوشہ میاں۔ کیا سرِ راہ بک بک لگائی ہے۔ دیکھنے والے کیا کہیں گے؟''

''ہم بھی تو یہی کہہ رہے تھے۔ کیا عزیزہ بھی تمہارے ساتھ ہیں؟'' نوشہ میاں نے سلطانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آگے تو بڑھو بلائے جان ہی ہوگئے۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا اور نوشہ میاں ہنس کر آگے چل پڑے۔

سلطانہ کو یہ گفتگو بڑی عجیب لگی تھی۔ یہ شخص تو شکل سے ہی لفنگا نظر آرہا تھا اور پھر

اس کے گفتگو کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پائی جاتی تھی۔اس سے باتیں کرتے ہوئے شاہ جہاں بیگم کا لہجہ بھی کچھ بدل سا گیا تھا۔

شاہ جہاں بیگم کچھ تیز قدموں سے چل رہی تھیں اور نوشہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

سلطانہ نے نور جہاں اور ممتاز کو دیکھتے ہوئے کہا۔''کون ہے یہ بیہودہ آدمی؟''

''اماں۔اماں کا کوئی ملنے والا ہے۔نور جہاں نے ہراساں لہجے میں کہا۔سلطانہ چونک کر دونوں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ایک منٹ میں اسے احساس ہوگیا کہ دونوں کے چہرے دھواں ہو رہے ہیں۔اس کے بعد سلطانہ نے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

انیکسی میں داخل ہو کر شاہ جہاں بیگم نے کہا۔''نور جہاں نوشہ میاں کے لیے چائے بنالاؤ۔میں ان سے باتیں کر رہی ہوں۔چائے لاؤ تو آواز دے کر آنا۔''

''جی اماں۔''نور جہاں نے آہستہ سے کہا۔

شاہ جہاں بیگم نوشہ میاں کو لے کر دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی تھیں۔نوشہ میاں نے ان کا کمرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو یہ مزے ہو رہے ہیں' جگہ تو اچھی ہے۔''

''ایک خدا ترس خاتون نے رہنے کے لیے عارضی طور پر یہ جگہ دے دی ہے۔''

''کتنے دن ہوئے یہاں آئے ہوئے؟''

''بہت عرصہ گزر گیا' نوشہ میاں۔''

''تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ٹھکانے پر کیوں نہیں گئیں؟''

''کون سے ٹھکانے پر؟''

''لو......اسی ٹھکانے کی بات کر رہا ہوں جو ہمارا ہوتا ہے۔گلزار بائی نے کیا شاندار جگہ بنائی ہے۔چھمن خان اور گلنار بیگم نے بھی کوٹھے جمائے ہیں اور تمہیں یاد کرتے ہیں۔''

''خدا کے لیے نوشہ میاں آہستہ بولو۔کیوں عزت خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہو۔''

''سمجھا نہیں' شاہ جہاں بیگم؟''

''میں اب دھندہ نہیں کروں گی۔''

''تو پھر کیا کر رہی ہو آج کل؟''نوشہ میاں حیرت سے بولے۔

''پاک وطن کی خاک پیشانی سے لگا کر پاک بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔کاش اس میں کامیاب ہو جاؤں۔''

''راستے اتنے ہی کٹھن ہوتے ہیں۔''شاہ جہاں بیگم نے کہا۔

''کیا کہہ رہے تھے نوشہ میاں؟''

''کہہ رہے تھے پرانے دھندے میں آ جاؤ۔''

''اللہ نہ کرے اماں۔اللہ کے واسطے اب ایسا نہ کرنا۔''نور جہاں نے عجیب سے لہجے میں کہا اور شاہ جہاں اسے دیکھنے لگیں۔پھر انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''آج یہ بات نکل ہی آئی ہے نور جہاں تو تم سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں میں۔''

''کیسا سوال' اماں؟''

''اس بارے میں کبھی تم نے اور ممتاز نے اپنا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا۔''

''کس بارے میں اماں؟''

''ہم وہاں جمے ہوئے تھے۔کاروبار کر رہے تھے' جو میرا ماضی تھا وہی تم دونوں کا مستقبل۔اس وقت ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہم اس پیشے سے نکل سکیں گے۔حالات بدلے اور ہم یہاں آ گئے۔اس روز سے تم نے ایک بار بھی یہ سوال نہیں کیا کہ زندگی کیسے گزرے گی' کیوں؟''

''میں کیا بتاؤں اماں۔''

''میں نور جہاں بچی نہیں ہوں۔کچھ تو سوچا ہوگا تم نے اس بارے میں۔''

''دل کی بات بتا دوں۔''

''ہاں دل کی بات ہی تو جاننا چاہتی ہوں۔''

''اماں ہم اس لیے طوائف تھے کہ طوائف کے گھر پیدا ہوئے تھے اور کوئی بات عام لوگوں سے ہٹ کر نہیں تھی ہمارے اندر۔''

''ہاں یہی بات تھی۔''

''کیا طوائفوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے؟''

''نہیں۔''

''بے عزتی کی زندگی کون جینا چاہتا ہے اماں۔ مگر مجبوری سوچنے کا موقع بھی نہیں دیتی۔ یہاں حالات بدل گئے۔ یہ جگہ مل گئی تم نے بھی کبھی ایسے نہ سوچا۔ اماں عورت تو ہر حال میں عورت ہوتی ہے اسے اس مقام کی تلاش ہوتی ہے جو اس کا مقام ہے۔ ہم اس نگری کے باسی ہیں جو عورت کے خوابوں کی نگری ہوتی ہے لیکن ہماری آنکھوں میں بھی تو اس نگری کے خواب ہو سکتے ہیں اماں۔''

''بیٹی۔ تم نے میرے اندر مضبوطی پیدا کر دی ہے۔ کوشش کروں گی آخری حد تک کوشش کروں گی کہ میرے قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔ باقی ہم سب کی تقدیر۔ ہاں یہ تو بتاؤ سلطانہ نے نوشہ میاں کے بارے میں کچھ پوچھا تو نہیں۔''

''راستے ہی میں پوچھا تھا اماں اور چونکہ ہم لوگ بھی گھبرائے ہوئے تھے اس لیے کوئی صحیح جواب نہیں دے سکے اور خاموش ہو گئے۔''

''خیر خدا نے ایک اور کٹھن وقت ڈال دیا ہے اب وہی پار لگائے گا۔ فیصلے تو اسی کے ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے کیا فیصلہ کرتا ہے۔ نوشہ میاں اس بات پر مصر تھے کہ ہم دھندے پر آ جائیں۔ میں نے انہیں سختی سے منع کر دیا۔ برے راستوں کا راہی ہے جو کچھ بھی نا کر ڈالے کم ہوگا۔ لیکن تقدیر سے لڑیں گے۔ ہاں ایک بات میں سوچ رہی ہوں کہ ہمارا واسطہ بیگم ارباب سے تو زیادہ عرصہ نہیں رہے گا لیکن سلطانہ سے زندگی موت کا ساتھ ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس سے بھی چھپائے رکھا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ سلطانہ سے اپنے آپ کو زیادہ عرصہ چھپائے رکھنا ممکن نہیں ہوگا کیوں نہ اسے ساری صورت حال بتا دی جائے۔''

''یہ بہت اچھا ہوگا۔ اماں۔ سلطانہ کو اب چھوڑا نہیں جا سکتا۔''

''تو پھر میں اس کام میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ طوائف تھیں اور خاندانی طوائف تھیں۔ یہ کاروبار انہیں ورثے میں منتقل ہوا تھا اور انہوں نے کبھی اس رشتے کو چھوڑنے کا تصور ہی نہیں کیا تھا۔

نور جہاں اور ممتاز ان کی بیٹیاں تھیں۔ ناچنے گانے کا فن انہیں اچھی طرح سکھایا گیا تھا اور ان کا کاروبار ان دونوں لڑکیوں کی وجہ سے جاری تھا۔ پھر ان کے محلے پر بھی حملہ ہوا۔ مسلمان طوائفوں کو مارا پیٹا گیا۔ گھر جلائے گئے اور شاہ جہاں بیگم افراتفری کے عالم میں سب کچھ چھوڑ

چھاڑ کر اپنی بیٹیوں کو لے کر وہاں سے نکل آئیں۔ اور کیمپ میں پہنچ گئیں۔ زندہ سلامت پہنچ گئیں۔ افراتفری کے اس عالم میں انہیں سلطانہ کو سہارا دینے کا موقع ملا اور انہوں نے اسے عبادت سمجھا۔ انہوں نے سلطانہ سے دل کھول دیا اور تقدیر انہیں بیگم ارباب تک لے آئی۔ بلاشبہ بیگم صاحبہ صاحب ظرف تھیں لیکن انسان ہی تھیں۔ سلطانہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد یا پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کے بڑھنے کے احساس نے انہیں تھوڑا سا کھینچ دیا تھا لیکن اس کھچاوٹ کو بھی شاہ جہاں بیگم نے برا نہیں سمجھا تھا۔

ابھی تو سلطانہ کا معاملہ تھا۔ اسے پار لگانا تھا اور اس پر جو افتاد پڑی تھی اس میں اس کا ساتھ دینا تھا۔ نہ جانے یہ موذی نوشہ میاں کہاں سے آن مرا۔

ان کا پرانا سازندہ تھا اور طویل عرصے سے ان کا ساتھی تھا۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے وہ مری کا لیا کچھ کر کے ہی رہے گا۔ سلطانہ کے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے شاہجہاں بیگم یہی سوچ رہی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ کیا اس حقیقت کو جان کر سلطانہ ان کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرے گی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ خود اس کی زندگی سے ایک حادثہ چمٹ گیا تھا۔

نور جہاں چائے کے برتن اٹھا لائی تھی۔ سلطانہ کے کمرے میں پہنچ کر اس نے وہ برتن رکھ دیئے۔ سلطانہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاہ جہاں بیگم کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر چائے بنانے لگی۔ نور جہاں بھی خاموش خاموش بیٹھ گئی تھی۔

''چائے لیجیے امی! آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟''

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں سلطانہ۔''

''جی فرمائیے۔''

''تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا جو ہمیں ملا تھا؟''

''جی ہاں۔''

''وہ ہمارے ماضی کا راز دار ہے۔ میں طوائف ہوں سلطانہ ایک طوائف کی بیٹی اور میری ماں بھی ایک طوائف کی بیٹی ہی تھی اور میرے بعد میری دونوں بیٹیاں بھی طوائف ہی بنتیں اور شاید ان کی بیٹیاں بھی۔ پھر پاکستان وجود میں آیا اور ہم یہاں کے لیے چل پڑے۔''

''تقدیر کچھ اور فیصلے کر رہی ہے۔ نوشہ ہمارے ماضی کو دفن نہیں ہونے دے گا اور لوگ ہمیں پھر طوائف کہنا شروع کر دیں گے۔ وہ وقت شاید اب دور نہیں ہے۔''

سلطانہ بڑے صبر سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس پیشے میں آپ کو کوئی مالی پریشانی تو نہ ہوتی ہوگی؟''

''ہاں غلاظت کے انباروں میں ہی دولت کے درخت اگتے ہیں۔ محنت مزدوری زیادہ سے زیادہ دو وقت کی روٹی دے دیتی ہے۔'' شاہ جہاں نے کہا۔

''آپ نور جہاں اور ممتاز دولت کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں؟''

''دل کے داغ سونے کے پانی سے صاف نہیں ہوتے' سلطانہ! معاف کرنا اب میں تمہیں بیٹی نہیں کہوں گی کیونکہ میرے چہرے کا نقاب الٹ چکا ہے۔'' شاہ جہاں ایک سسکی لے کر بولی اور اپنا کرب چھپانے کے لیے چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی۔

سلطانہ خاموشی سے شاہ جہاں کو دیکھ رہی تھی۔ شاہ جہاں نے دو تین گھونٹ لے کر چائے کی پیالی نیچے رکھی اور دوپٹے سے آنسو خشک کرنے لگی۔

''تمہیں یہ سب کچھ بتانا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ سلطانہ! کون جانے بات کس وقت بگڑ جائے۔ تمہاری فکر تو رہے گی۔'' سلطانہ اپنی جگہ سے اٹھی' آگے بڑھی اور پھر اس نے شاہ جہاں کی چائے کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی اور اسے خالی کر دیا۔

''بچپن سے مجھے ایک عادت رہی ہے امی' میں کسی کا جھوٹا نہیں کھاتی پیتی۔ آج میں نے پہلی بار آپ کی جھوٹی چائے پی ہے۔ تبرک سمجھ کر۔ میری نگاہ میں آپ کا درجہ اتنا بڑھ چکا ہے آپ نے مجھے بیٹی کہنا چھوڑ دیا لیکن میں آپ کو امی کہہ کر فخر محسوس کرتی ہوں۔''

''سلطانہ۔'' شاہ جہاں بلک بلک کر رو پڑی۔

''آپ عظیم ہیں امی۔ آپ سرزمین پاک کو اپنی پاکیزگی کا تحفہ دینا چاہتی ہیں' آپ سے بڑا کون ہو سکتا ہے۔''

''زمانہ ہمیں وہ مقام کہاں دے گا بیٹی؟''

''ہم زمانے سے اپنا مقام حاصل کریں گے امی۔ جو کچھ میں چاہتی ہوں اس کی ابتدا تو آپ نے کر دی ہے۔ میرے لیے کس قدر خوشی کا مقام ہے میں آپ کی بیٹی ہونے پر فخر کرتی ہوں۔

مہر النساء ہانپی کانپتی رابعہ بیگم کے کمرے میں گھسی تھیں۔ رابعہ بیگم چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

''خیر تو ہے مہر' کیا بات ہے؟''

''رابعہ! ایک بات تو بتاؤ۔ بتادو گی یا چھپاؤ گی؟''

''تمہارا کیا خیال ہے بتادوں گی یا چھپاؤں گی؟'' رابعہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چھپائی تو کوئی بات نہیں ہے تم نے آج تک۔ ہو سکتا ہے شرافت بھائی نے خود ہی تم سے تذکرہ نہ کیا ہو۔'' مہر النساء نے پرخیال انداز میں کہا۔

''ایسا کون سا تذکرہ ہے؟''

''اے رابعہ بیگم! تم کسی خزانے کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' مہر النساء نے رازداری سے کہا اور رابعہ بیگم بری طرح چونک پڑیں۔ ایک عظیم الشان خزانہ ان کے علم میں تھا لیکن اس کے ساتھ ہی قربت شاہ صاحب کی نصیحتیں بھی گرہ میں تھیں۔ حیرانی اس بات پر ہوئی تھی کہ مہر النساء کو کسی خزانے کی بھنک کیسے مل گئی تھی۔ حیران تو ہوئی تھیں لیکن سنبھل گئیں۔

''بہت سے خزانوں کے بارے میں جانتی ہوں لیکن تم کون سے خزانے کی بات کر رہی ہو؟''

''قربت شاہ کے خزانے کی۔ بہر طور یہ تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہے کہ قربت شاہ ولی تھے' بزرگ تھے اور ہم نے انہیں نہیں ان کی روح کو دیکھا تھا لیکن وہ کوئی خزانہ تمہارے حوالے کر گئے تھے' یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا۔''

رابعہ بیگم پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو گئی تھیں۔ عورت ضرور تھیں لیکن صاحب ظرف بھی تھیں اور صاحب ضمیر بھی۔ یہ جاننے کے لیے بے چین ہوئیں کہ مہر النساء کو یہ راز کہاں سے معلوم ہو گیا۔ بلکہ اس نصیحت کو انہوں نے مدنگاہ رکھا جو قربت شاہ نے انہیں کی تھی' چنانچہ وہ بولیں۔

''بزرگوں اور ولیوں کی باتوں میں راز ہوتا ہے مہر النساء' ان کا ہر جملہ ایک خزانہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیں جس خزانے کے بارے میں بتایا تھا وہ سونے چاندی کے سکوں اور زیورات کا خزانہ نہیں تھا' ان نصیحتوں کا خزانہ تھا۔''

''اللہ کی پناہ! تم نے تو میرا بھیجا ہلا کر رکھ دیا۔ اے بوا میں ایسے کسی خزانے کی بات نہیں کر رہی۔''

''پھر......''

''وہ خزانہ جو سونے چاندی اور زیورات کی شکل میں ہوتا ہے۔ قربت شاہ کا خزانہ۔''

''یہ کہانی تم کہاں سے سن کر آئیں؟''

''تمہارے میاں سے۔ وہ ابامیاں کو اس خزانے کے بارے میں بتا رہے تھے۔''

''اے بوا میں ابامیاں کے کمرے میں جا رہی تھی۔ اسی وقت بھائی شرافت اندر داخل ہو گئے۔ میں انتظار کرنے لگی کہ وہ بات کر کے باہر آئیں تو میں اندر جاؤں۔ بس اس وقت یہ باتیں ہوئیں اور میرے کانوں تک آ گئیں۔ مہرالنساء نے واقعی وہ پوری گفتگو سن لی تھی جو شرافت حسین اور ملت علی خان کے درمیان ہوئی تھی۔ رابعہ بیگم نے گہری سانس لی تھی۔ واقعی شرافت حسین نے اس نقطہ نگاہ سے زبان کھولی ہوگی ورنہ شاید وہ کبھی اس کا تذکرہ یہاں پر نہ کرتے۔ مہر النساء مکمل عورت تھیں۔ ذرا سی لچک راز کو طشت ازبام کر سکتی تھی اس لیے انہوں نے کہا۔

''مجھے تمہاری زبانی یہ کہانی معلوم ہوئی ہے مہر' ورنہ میرے علم میں کچھ نہیں تھا۔''

''اگر وہ خزانہ ہمیں مل جائے تو ہماری تو زندگی سدھر جائے' نواب بن جائیں' نواب۔''

''نواب کسی نواب سے کم ہو تم۔ اتنی بڑی کوٹھی میں رہتی ہو کہ بہت سے نواب بھی نہ رہتے ہوں گے۔ عیش سے کھا رہی ہو' پہن رہی ہو' نوابی اور کیسی ہوتی ہے؟''

''نہیں رابعہ۔ یہ بھی کوئی نوابی ہے۔ ابامیاں بے چارے سارا سارا دن دھوپ میں سبزی منڈی میں کھڑے رہتے ہیں۔ یہ ان کی عمر ہے کمائی کرنے کی۔ کئی روز سے سینے میں درد بتا رہے ہیں۔ بہت سے ایسے مسائل ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ ثمر جوان ہو رہی ہے۔ اے تم بھائی شرافت سے بات تو کرو۔''

''کیا بات کروں؟''

''یہی کہ اگر خزانہ سچی مچی ہے تو ہم خود اسے کیوں نہ استعمال کریں۔''

''تو مہر اگر واقعی کوئی خزانہ ہوا تو ہم اسے استعمال کرنے کے حقدار کیسے ہو گئے۔ وہ تو قربت شاہ کی ملکیت ہے۔''

''تو وہ بے چارے اس دنیا میں کہاں ہیں؟''

''تم یہ بھول گئیں کہ انہوں نے خود تمہیں یہاں تک بھیجا تھا۔''

''وہ تو ان کی پاک روح تھی۔''

''اگر کوئی ایسا خزانہ تھا تو وہ تمہیں یہ بتا سکتے تھے کہ تم وہ خزانہ نکال لو۔''

''بھول گئے ہوں گے۔'' مہرالنساء نے معصومیت سے کہا اور رابعہ بیگم ہنس پڑیں۔

''میری پیاری بہن! چھوڑو ان فضول باتوں کو۔ کن چکروں میں پڑی ہوئی ہو۔ اللہ محنت سے جو کچھ دے رہا ہے وہی کافی ہے۔''

''میری ایک رائے ہے رابعہ۔''

''کیا؟''

''تم ایسے ہے بہلا پھسلا کر بھائی شرافت سے اس خزانے کے بارے میں معلوم کر لو۔ ہم دونوں مل کر اسے نکال لیں گے اور پھر آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔''

''میں شرافت حسین کو دھوکہ دوں؟'' رابعہ بیگم نے کہا۔

''لو! اس میں دھوکے کی کیا بات ہے؟ یہ مرد تو بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ موٹی عقل کے مالک۔ بارش اور دھوپ میں سڑتے رہیں گے یہ نہیں کہ اگر ایسی کوئی چیز نظر آ گئی ہے تو اسے استعمال کریں۔ آخر کسی نہ کسی کے کام تو آئے گا وہ۔ اگر ہم اسے نکال لیں گے تو کوئی اکیلے تو نہیں کھا جائیں گے۔ انہیں کے کام آئے گا۔ ہمارے بچوں کے کام آئے گا اور پھر اپنی گرہ بھی مضبوط ہونی چاہیے۔ دیکھو ثمر کے ابا کو کیسی طوطا چشمی دکھائی ہے۔ دوستوں کے ساتھ ولایت چلے گئے اور لوٹ کر ہماری خبر نہ لی۔ بھول گئے سب کو۔'' مہرالنساء کے الفاظ سسکی بن گئے۔

''خدا پر بھروسہ رکھو مہر۔ وہ سب ٹھیک کر دے گا۔ کل تمہارے بچے جوان ہو جائیں گے اور کمائی کر کے تمہارے سامنے دولت کے انبار لگا دیں گے۔ تمہیں کس بات کی پرواہ۔'' رابعہ بیگم' مہرالنساء کے دکھ کو جانتی تھیں۔

''ابا میاں بے چارے کب تک ہمارے لیے اپنی بوڑھی ہڈیاں پیستے رہیں گے۔

کافی دنوں سے سینے میں درد بتا رہے ہیں۔کوئی آئی گئی ہو گئی تو کیا ہو گا؟''

''سب کا نگہبان خدا ہے۔تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔مگر چچا جان کے سینے کے درد کے بارے میں شاید شرافت حسین کو کچھ نہیں معلوم۔''

رابعہ نے میری بات نہیں مانی۔ہو سکتا ہے انہوں نے من میں کچھ اور سوچا ہو۔ہاں ٹھیک تو ہے۔ان کے تو اولاد بھی نہیں ہے سوچا ہو گا خزانہ بڑھاپے میں کام آئے گا۔یہ تو خود غرضی ہے۔رابعہ سے ایسی امید نہیں تھی۔رات کو انہوں نے سجاد اور جواد سے کہا۔

''اے سجاد! اے جواد! سو گئے کیا؟''

''نہیں اماں۔تم کیوں جاگ رہی ہو؟''

''ایک بات سوچ رہی ہوں''

''کیا؟''

''دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں بتادوں۔مگر ڈرتی ہوں بچے ہو کہیں منہ سے نہ نکال دو۔''

''کیا چیز اماں؟'' جواد بولا۔

''وہ راز جو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔''

''صندوق کا راز۔'' سجاد بولا۔

''نہیں تابوت کا راز'' جواد نے جواب دیا۔''اماں کیا تم نے ناول بہرام کی خالہ پڑھ لیا ہے؟''

''تمیز سے سنو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں۔خبردار اسے کہیں باہر زبان پر لائے۔''

''ایسا کون سا راز ہے اماں؟''

''خزانے کا راز۔'' مہر النساء پر اسرار انداز میں بولیں۔

''بائیو کٹرنیل بائیڈ لے فرانس۔'' سجاد بولا۔

''کیا بک رہے ہو؟''

''ان دونوں نے خزانے کا راز کھولا ہے۔تم کون سے خزانے کی بات کر رہی ہو اماں؟''

''وہ خزانہ جو اس کوٹھی میں موجود ہے۔''

''اس کوٹھی میں......!'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

''ہاں اس کوٹھی میں۔''

''خواب میں نظر آیا تھا اماں؟''

''نہیں جاگتے میں؟'' مہر النساء نے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' جواد نے پوچھا۔

''دیکھو تم دونوں میرا مذاق مت اڑاؤ۔جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سنجیدگی سے سنو۔میں تمہیں ایک بہت بڑے خزانے کا راز بتانا چاہتی ہوں۔''

''بھیا بس اب خاموش ہو جاؤ' خزانے کا راز سن لو۔مگر اماں ذرا منظر کشی کے ساتھ ہو۔چلو یونہی سہی۔رات کی گھور تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔آسمان پر گیارہویں رات کا چاند جگمگا رہا تھا' کیا تاریخ ہے آج......؟''

''بارہ!'' سجاد بولا۔

''چلو ٹھیک ہے' آسمان پر بارہویں رات کا چاند جگمگا رہا تھا۔مگر چاندنی رات میں گھور تاریکی؟'' جواد رک گیا۔

''کٹ کٹ۔یہ اسکرپٹ غلط ہے۔'' سجاد بولا۔

''ایک جملے کی ردوبدل سے بات بن سکتی ہے۔پورا اسکرپٹ کیوں خراب کر رہے ہو بھیا؟''

''بارہویں رات کا چاند نکال دو۔''

''نکال دیا۔ہاں تو چاروں طرف گھور تاریکی چھائی ہوئی تھی اور بارہویں رات کا چاند نہیں نکلا تھا۔بادلوں کے غول کے غول اس طرح آسمان پر جمع ہو رہے تھے جیسے پانی پت کے میدان میں بابر کی فوجیں۔''

''ہمایوں کی۔'' سجاد بولا۔

''نہیں بابر کی۔''

''سو فیصدی ہمایوں کی۔''

''میں کہتا ہوں بابر کی۔'' جواد ضد کرتا ہوا بولا۔

''اُفوہ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے ہو۔یہ ان باپ بیٹے کا معاملہ ہے' ہم کیوں دخل

دیں؟ آگے بڑھو۔''

''ستارے سہمی ہوئی نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یوں۔ یوں ٹوئیں۔''

''اے اے پھر پٹری سے اتر گئے۔ بادلوں سے چاند کو نکلنے نہیں دیا' ستارے کہاں سے آ گئے؟''

''ماں کے چہرے پر کسی گہرے پراسرار راز کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں پراسرار چمک نظر آ رہی تھی۔'' جواد پھر شروع ہو گیا۔ ''اور اسی وقت' اسی وقت ماں نے بیٹوں کو دیکھا۔ بیٹوں نے ماں کو دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اچانک۔ اچانک دروازے پر دستک سنائی دی۔ پہلے آہستہ...... پھر تیز' پھر اور تیز۔ ارے باپ رے۔'' جواد کی بکواس اچانک رک گئی دروازے پر واقعی دستک سنائی دی تھی۔ پہلے آہستہ پھر تیز اور پھر تیز۔

جواد نے سہمی ہوئی نظر سے سجاد کو دیکھا۔ خود سجاد کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا۔ ''یہ تو...... واقعی آواز ہے۔'' اس نے کہا۔

مہر النساء بھی خوف زدہ ہو گئیں۔ آواز انہوں نے بھی سنی تھی۔ کوئی چیز دروازے سے رگڑ بھی کھا رہی تھی۔

''یہ تو...... یہ تو سچ مچ آ گیا۔'' جواد آہستہ سے بولا۔

''کون ہو سکتا ہے اس وقت...... دیکھوں؟ سجاد بستر سے نیچے پیر رکھتا ہوا بولا۔

''ارے او موذی' رکو تو۔ ہائے اللہ کون ہے یہ؟'' مہر النساء دہشت کے عالم میں بولیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ یہ نہ ان کا وہم تھا نہ ہوا کی آواز۔ پھر دستک دینے والا کون تھا' رات کے اس حصے میں؟

دروازے پر مسلسل یہ احساس ہو رہا تھا کہ کوئی موجود ہے۔ دستک دینے کی کوشش بھی کی جا رہی تھی لیکن یہ باقاعدہ دستک نہیں تھی۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی دروازے سے اپنا بدن رگڑ رہا ہو۔ مہر النساء بیگم تو جل تو جلال تو پڑھنے لگی تھیں۔ جواد اور سجاد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ پھر سجاد نے کہا۔

''چھوٹے بھائی......''

''بڑے بھائی......'' جواد فوراً بولا۔

''یار کچھ گڑبڑ ہی لگتی ہے۔ کیا کیا جائے؟ یہ سگ تو سچ مچ زندہ و جاوید ہو گیا۔''

''کون جاوید؟'' جواد حیرت سے بولا۔

''ابے مذاق مت کر۔ سچ مچ کوئی گھس آیا تو کیا ہو گا؟ کیا خیال ہے دیکھا جائے؟''

''ایسے نہیں کوئی چیز ہاتھ میں لے لو اور ہاں سنو ذرا پوزیشن بنا لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فوراً ہی حملہ ہو جائے اور ہم مار کھا جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سجاد آگے بڑھ کر میز کا پایہ نکالنے لگا اور پھر پایہ اس نے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''چلو۔'' اس نے جواد کو آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''اماں کمال کرتے ہو یعنی ہتھیار تمہارے ہاتھ میں ہے اور آگے مجھے بڑھا رہے ہو۔''

''ارے کم بختو! ابھی تک مذاق کیے جا رہے ہو۔ میں کہتی ہوں کوئی ہے دروازے پر' کچھ کرو۔ چیخ پکار مچاؤ تاکہ دوسرے لوگ بھی جاگ جائیں۔''

''اور چیخ و پکار سن کر وہ اندر گھس آیا تو کیا ہو گا؟''

''ہائے اللہ یہ...... یہ کیا ہو گیا؟'' مہر النساء بیگم خوف سے چارپائی پر سمٹتی ہوئی بولیں۔

''آؤ سجاد بھائی تم بھی کیا یاد کرو گے کہ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے لیے قربانی دے دی۔ آؤ ہم تو ہیں ہی قربان ہو جانے والوں میں۔ تو پھر بسم اللہ چل رہا ہوں میں دروازے کی طرف۔ لیکن ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں یوں نہ ہو کہ میں دروازہ کھولوں اور اس کا شکار بن جاؤں۔''

''ارے سنو تو سہی رک جاؤ......''

جواد اور سجاد دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ جواد نے دونوں ہاتھ سیدھے کیے۔ کنڈی پر ہاتھ رکھا اور دوسرے لمحے کھڑاک سے کنڈی کھول کر سجاد کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ سجاد دہشت سے چیخ پڑا۔ اسے جواد سے یہ امید نہ تھی۔ اس کے منہ سے خوف بھری آواز نکلی۔

''دلہن...... جواد...... سجاد میں...... میری حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ میرے سینے میں...... میرا سینہ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔'' یہ بھرائی ہوئی آواز ملت علی خان کی تھی۔

جواد اور سجاد بھی چونک پڑے اور ایک دوسرے کو دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہر النساء بیگم کی بھی کچھ ہمت پڑی۔ چونک کر دیکھا تو سسر سامنے موجود تھے۔ ان کے دونوں

ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور بدن اینٹھا جا رہا تھا۔

"ارے موذیو! اٹھو تو سہی۔ دادا جان ہیں...... دادا جان۔"

"وہ تو ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ دادا جان ہیں۔ دادا جان آپ! اس وقت کیسے آ گئے۔"

"بیٹا کچھ کرو...... کچھ کرو۔ میرے سینے میں بہت درد ہے۔ ذرا جلدی۔ شرافت حسین کو جگاؤ۔ ہائے میں مرا جا رہا ہوں۔" ملت علی خان درد سے کراہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئے۔

"ارے ملت علی خان۔" شرافت حسین یونہی ننگے پاؤں دوڑے چلے آئے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر ملت علی خان کی کیفیت دیکھی تو دہشت زدہ ہو گئے۔ ملت علی خان کی کیفیت یہ اظہار کر رہی تھی کہ ان کی حالت حد سے زیادہ بگڑ چکی ہے۔ ملت علی خان نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہیں سینے کے درد کے بارے میں بتایا اور شرافت حسین باہر دوڑ گئے۔ ہسپتال لے جانا ضروری تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ رات کا انتہائی وقت تھا اور اس وقت کسی سواری کا مل جانا بھی ذرا مشکل ہی تھا۔ پھر انہیں قربت نگر کا ایک ایسا گھر یاد آیا جن کے پاس موٹر تھی اور بے چارے شرافت حسین اسی جانب دوڑ پڑے۔ دروازہ زور زور سے بجایا گیا اور کافی دیر کے بعد دروازہ کھل سکا۔ جن صاحب نے دروازہ کھولا وہ اس گھر کے مالک تھے۔ اور ان کی تیوریاں غصے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ شرافت حسین کو دیکھ کر ان کا غصہ تھوڑا سا کم ہوا تو شرافت حسین نے عاجزی سے کہا۔

"بلاشبہ آپ کو اس تکلیف دہی کے لیے جتنی معافی مانگوں کم ہے۔ ظاہر ہے رات کا آخری پہر ہے لیکن ایک مصیبت کا شکار ہو گیا ہوں اور آپ سے مدد کا طالب ہوں۔"

"آپ تو...... ہاں شرافت حسین ہیں نا آپ؟ اس سامنے والے گھر میں رہتے ہیں۔"

"جی...... جی۔"

"جی فرمائیے...... خیریت؟" ان صاحب نے اب کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

"وہ ہمارے گھر میں جو بزرگ ملت علی خان رہتے ہیں ان کے سینے میں شدید درد ہے۔ مجھے شبہ ہے کہیں دل کی تکلیف نہ ہو۔ اس وقت کوئی سواری تو مل نہیں سکتی آپ کی موٹر یاد کر کے دوڑا چلا آیا ہوں۔"

"ارے میاں، کمال کیا آپ نے، اتنی دیر لگا دی۔ ابھی آیا دو منٹ میں۔ اطمینان

رکھیے ابھی پہنچ رہا ہوں۔" وہ صاحب انسانی ہمدردی اور پڑوس کا فرض ادا کرنے میں شاید پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ چند ہی لمحات کے بعد وہ آ گئے اور اپنی موٹر اسٹارٹ کر کے چل پڑے۔ جواد اور سجاد نے سہارا دے کر ملت علی خان کو گاڑی میں لٹا دیا پھر خود بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ شرافت حسین بھی پیچھے ہی بیٹھ گئے۔ موٹر والے صاحب نے موٹر اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور پھر خدا خدا کر کے ملت علی خان کو ہسپتال لے جایا گیا۔ اب ان پر غشی طاری تھی۔ ہسپتال میں فوری طور پر ان پر توجہ دی گئی اور انہیں دل کے امراض کے شعبے میں پہنچا دیا گیا۔ شرافت حسین، جواد اور سجاد پریشانی سے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ موٹر والے صاحب نے بھی حق انسانیت ادا کیا اور ان کے ساتھ کافی دیر ان کے ساتھ گزاری۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹروں نے باہر آ کر کہا کہ ملت علی خان دل کے دورے سے جانبر نہ ہو سکے۔ شرافت حسین صاحب پر گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ اچانک حادثہ ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟

وہ رات ان کے بڑے غم و اندوہ کی رات تھی۔ شرافت حسین، رابعہ بیگم، مہر النسا، جواد سجاد اور ثمر کو تسلیاں دے رہے تھے۔ شرافت حسین گلوگیر آواز میں بولے۔

"بہن مہر النساء یہ نہ سمجھنا کہ ملت علی خان صرف تمہارے لیے بہت کچھ تھے۔ انہوں نے مجھے اس وقت میں سہارا دیا جب کہ میں اپنی پشت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ ارے تمہیں کیا معلوم میرا کیا بگڑ گیا۔ کیا نقصان ہو گیا میرا؟ اکیلا رہ گیا ہوں میں لیکن تم اکیلی نہیں ہو۔ میں موجود ہوں۔"

مہر النسا بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

قربت نگر کے تقریباً تمام ہی گھروں میں ملت علی خان صاحب کے بارے میں چرچے تھے۔ زیادہ ملنا جلنا تو نہیں تھا محلے والوں سے۔ بے چارے سبزی منڈی ہی میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن فرصت کے لمحات جب بھی ہوتے باہر محفلیں جم جاتیں اور پھر ملت علی خان کی گرجدار آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ اب یہ آوازیں قبر کی تاریکیوں میں جا سوئی تھیں اور وہ بھی اس طرح اچانک۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور تھا ان کا۔ وہ بچانوے سالہ بزرگ جو ڈھاکہ مشرقی پاکستان سے یہاں اپنے نواسے کے گھر آئے ہوئے تھے، گلوگیر لہجے میں بولے۔

''بھئی میری تو زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئیں لیکن آدمی جنتی تھا۔ لوگ اتنی تعریفیں کررہے تھے اس کی کہ مجھے سوچنا ہی پڑا۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی نصرو۔'' انہوں نے اپنے نواسے یعنی نصرت بیگ سے کہا۔

''کیا نانا میاں؟'' نصرت بیگ نے پوچھا۔

''یہ قربت شاہ جو تھے نا بہت بڑے آدمی تھے۔ بڑی دولت تھی ان کے پاس اور ان کی دولت کے دور دور تک چرچے تھے۔ سنا ہے کوئی وسیع خزانہ بھی تھا ان کے پاس باپ دادا کا چھوڑا ہوا۔ جس کی کہانیاں کافی سنی جاتی تھیں ان دنوں۔ جانتے ہو مان جی ڈھولا جی سے ٹکر تھی ان کی۔''

''مان جی ڈھولا جی سے؟''

''ہاں بھئی، بہت بڑا بنیا تھا۔ کروڑ پتی، بڑی دھوم تھی اس کی۔ لیکن قربت شاہ کے گھرانے کے سامنے اس کی کچھ نہ چلتی تھی۔''

''اچھا!'' نصرت بیگ عرف نصرو نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ قربت شاہ شہید ہوگئے مگر ان کی دولت کہاں گئی؟''

''بہت بڑی دولت تھی نانا ابا؟'' نصرت بیگ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہاں میاں چرچے تو تھے۔ ویسے کبھی سامنے نہیں آئی یہ دولت۔ دراصل قربت شاہ جو تھے نا وہ کچھ درویش قسم کے آدمی تھے۔ بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے اس لیے کبھی ان کی دولت کے مظاہرے نہیں ہوسکتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر وہ دولت گئی کہاں؟'' نصرت بیگ نے پرخیال انداز میں داہنا گال کھجاتے ہوئے کہا۔

''اللہ ہی جانے بھیا۔ ہمیں کیا معلوم؟'' پچانوے سالہ بزرگ نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی۔

لیکن نصرت بیگ کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت نمودار ہوگئی تھی۔ نصرت بیگ کا خاندان میرٹھ کا رہنے والا تھا۔ قینچی چھریوں کا بہت بڑا کاروبار ہوتا تھا میرٹھ میں۔

نصرت بیگ کے ذہن میں خزانے کا تصور کچھ ایسا جڑ پکڑ گیا کہ اپنی خلوت میں

آنے کے بعد وہ بیگم سے کہنے لگے۔

''اری سن تو اللہ کی بندی۔''

اور اللہ کی بندی سننے لگی۔

''تجھے پتا ہے آج نانا ابا نے کیا انکشاف کیا ہے؟''

''کیا کیا ہے؟ وہ تو انکشاف ہی کرتے رہتے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ لوگ جائیں گے کتنے دن میں؟ ہمارا تو پٹرا ہوا جارہا ہے۔''

''تیرا ستیاناس۔ ہمیشہ ہی غیر مذہبی باتیں کرتی ہے۔ اری بے وقوف مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ بدبختوں کے گھر کبھی مہمان نہیں آتے اور تجھے جب دیکھو ان لوگوں کا شکوہ رہتا ہے۔ اتنی دور سے آئے ہیں۔ سات سمندر پار کرکے۔ ابھی کچھ دن رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ جلدی کیا ہے؟''

''ہاں یہ رہیں گے مگر ہم نہ رہیں گے۔'' بیگم نصرت بیگ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''اللہ دے گا...... اللہ دے گا۔ پریشان کیوں ہوتی ہو؟ مہمان خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ جس نے انہیں بھیجا ہے وہی ان کے لیے رزق بھی بھیجے گا۔''

''اچھا چلو چھوڑو۔ سناؤ کیا سنا رہے تھے؟''

''یہ بتا کبھی ان لوگوں کے گھر میں بھی آنا جانا رہا ہے؟''

''کن لوگوں کے گھر میں؟''

''ارے وہی جہاں آج میت ہوگئی ہے۔ میرا مطلب ہے ملت علی خان کے ہاں۔''

''دو چار بار ہی گئی ہوں۔ کیوں کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''کچھ پوچھنا چاہتا تھا تجھ سے۔''

''تو پوچھو۔''

''کیسا گھر ہے؟''

''بے چارے بڑے اچھے لوگ ہیں۔ سیدھے سادے۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا۔ نہ الٹ نہ پھیر۔ نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں۔''

''دھت تیرے کی۔ میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ کسی کے لینے دینے میں ہیں۔ گھر کی

حالت کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے۔ شرافت حسین صاحب سبزی منڈی میں آڑھت کا کام کرتے ہیں۔ بے چارے بڑے میاں بھی انہی کے ساتھ تھے۔ اچھی خاصی آمدنی لگتی ہے گھر کے حالات بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"صرف اس آمدنی سے یہ حالات ٹھیک ٹھاک ہیں یا کچھ اور بھی نظر آتا ہے؟"

"مطلب...... میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"گھر کے ساز و سامان کی کیا کیفیت ہے؟" نصرت بیگ نے پوچھا اور بیگم صاحبہ اچھل پڑیں۔

"اے خدا کی مار' کسی کے گھر کے سامان پر کیوں نظر دوڑا رہے ہو۔ کیا دیوار پھلانگنے کا ارادہ ہے؟"

"جوتی اٹھاؤں گا اور منہ پر دوں گا تڑ سے۔ اب چوٹوں کے خاندان سے ہوں کیا؟ اس کی کمائی کھلائی ہے تجھے زندگی بھر؟ ہیں' تو نے کیا سوچ کر یہ بات کہی۔

"او مذاق کا بھی برا مان جاتے ہو۔ میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ تم سوال ہی ایسے کر رہے ہو۔"

"سوال ہی ایسے کر رہے ہو۔ بالکل کوڑھ مغز ہے۔ دماغ پھری کم بخت کہیں کی۔"

"اب گالیاں دینے پر اتر آئے۔ میں کہتی ہوں مطلب کیا ہے؟ کیوں پوچھ رہے ہو یہ سب کچھ؟"

"پانی پلا ایک گلاس۔ دماغ ٹھنڈا کروں۔ سب کچھ دماغ سے نکال کر پھینک دیا۔"

نصرت بیگ نے کہا اور بیگم صاحبہ پانی لینے باہر نکل گئیں۔

نصرت بیگ خاموشی سے بیٹھے کچھ سوچتے رہے تھے۔ اتنی دیر میں بیگم صاحبہ پانی کا گلاس لیے اندر آ گئیں اور نصرت بیگ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئے۔

"ان کے گھر کے بارے میں پوچھنے کی ایک وجہ تھی۔"

"خیر تو ہے' کیا وجہ تھی؟" بیگم صاحبہ نے ابھی تک شوہر کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔

"نانا ابا بتا رہے تھے کہ مرحوم قربت شاہ کے پاس ایک بہت بڑا خزانہ تھا۔ بڑے

دولت مند آدمی تھے وہ اور ان کے خزانے کے چرچے عام تھے۔"

"دوسرے کے گھر میں تم کیسے کوشش کر سکتے ہو؟"

"کوئی ترتیب نکالیں گے اللہ کی نیک بندی۔"

"ابا جی اللہ قسم اس سلسلے میں تم مجھ پر بھروسہ کر لو۔ اسی وقت ایک گوشے سے آواز آئی۔

نصرت بیگ بری طرح اچھل پڑے تھے۔ یہ آواز اس گوشے سے آئی تھی جہاں ایک فالتو چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

"یہ کون ہے؟"

"شمشو ہے۔ شمشو۔" بیگم نصرت بیگ نے بتایا۔

"یہ بھوتنی کا یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"سو گیا تھا۔ کہہ رہا تھا اماں سر میں درد ہو رہا ہے۔ تھوڑا سا تیل ڈال دو سر میں۔ میں نے وہیں بیٹھ کر تیل ڈالا تو چارپائی پر پڑے پڑے سو گیا۔ آنکھ کھل گئی ہوگی۔" بیگم نصرت بیگ نے بتایا۔

"ستیاناس...... ہو گیا ستیاناس۔" نصرت بیگ سر پر ہاتھ مار کر بولے۔

اسی وقت شمشاد بیگ عرف شمشو اٹھ کر ان کے پاس آ گیا تھا۔

"ابا جی یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں خزانہ تلاش کر کے دکھاؤں گا۔ قبوتروں کے ذریعے۔"

"ابے قبوتروں کے بچے' نکلتا ہے یہاں سے یا لگاؤں دو ہاتھ۔"

"جا رہا ہوں ابا...... مگر وہ خزانہ......!"

"ہاں بیٹا خزانہ...... کبھی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔ تم ہی جیسے لوگوں کو خزانہ ملتا ہے۔ مگر جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اسے گرہ میں باندھ لیجیو۔ بات اگر باہر نکلی تو تیری گردن ضرور دبا دوں گا۔"

شمشو برا سا منہ بنا کر باہر نکل گیا تھا۔ بیگم نصرت بیگ پریشان نظروں سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں کہتی ہوں یہ خزانہ تم پر کہاں سے سوار ہو گیا؟"

"بیوی ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ سنو یہ عمر آ گئی اور ابھی تک گدھوں کی طرح محنت کرتا ہوں۔ ارے اللہ کی ذات سے ناامیدی کفر ہے۔ ہو سکتا ہے بگڑی بن ہی جائے۔ تم

بس یہ کام کرو ذرا ان لوگوں کے گھر زیادہ آنا جانا شروع کر دو۔ دوستی بڑھاؤ ان سے اور ذرا اندر کے حالات معلوم کرو۔''

''ٹھیک ہے کل کھیر پکاؤں گی اور خاص طور سے ان کے ہاں دینے جاؤں گی۔ اس طرح دو چار چیزیں اور پہنچاؤں گی تو میل جول اور بڑھ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جو مرضی آئے کرو۔ مگر ذرا احتیاط سے۔'' نصرت بیگ نے کہا اور اس کے بعد کسی خیال میں ڈوب گئے۔

بیگم نصرت بیگ بھی سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ کتنے دودھ کی کھیر پکائی جائے جو گھر میں پوری ہو جائے اور محلے میں بانٹ دی جائے۔ چاہے صرف ایک گھر ہی میں کیوں نہ سہی۔

سارا گھر اداسیوں میں ڈوب گیا تھا اور چاروں طرف موت کا سناٹا طاری تھا۔ جواد اور سجاد بہت خوش مزاج تھے لیکن ان دنوں وہ بھی کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ درحقیقت ملت علی خان کی کمی کا احساس اب ہو رہا تھا۔ سب کچھ ہی تو سنبھال رکھا تھا انہوں نے اپنے بوڑھی ہڈیوں پر اور کبھی ان لوگوں کو یہ احساس نہ ہونے دیا تھا کہ وہ کسی سرپرستی سے محروم ہیں یا باپ کا سایہ نہیں ہے۔

اس وقت بھی دونوں میاں بیوی بیٹھے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ شرافت حسین کسی قدرے بے چینی سے بولے۔

''ایک بات بار بار میرے ذہن کو چبھتی ہے۔''

''کیا؟'' رابعہ بیگم نے سوال کیا۔

''رابعہ بیگم تھوڑی سی غلطی ہوئی ہے شاید ہم سے۔ پتا نہیں اس سلسلے میں مجھے معافی ملے گی یا نہیں۔''

''ایسی کیا بات ہے...... خیریت تو ہے؟''

''بس ایک حماقت ہوئی تھی اس دن۔ میں نے ملت علی خان سے اس دن قربت شاہ کی امانت کا تذکرہ کر دیا تھا یہ سوچتے ہوئے کہ قربت شاہ اب چونکہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں تو یہ سب کچھ ہمارے لیے چھپائے رکھنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ میں نے دل میں سوچا تھا کہ قربت شاہ کی اس امانت کو ان کی ذات کے لیے وقف کر دوں اور کوئی ایسا کام کر دوں جس سے

ان کی یادگار قائم ہو جائے۔ ملت علی خان سے مشورہ کیا تھا میں نے اور ان سے کہا تھا کہ کسی سے فتویٰ لے لیتے ہیں اگر اس کا محفوظ رکھنا مناسب ہے تو اسے یونہی پڑا رہنے دیا جائے اور اگر اسے کسی نیک کام میں لگا دیا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ بہر طور ہم نے طے کیا تھا کہ ہم کسی اچھے مفتی سے ملاقات کریں گے مگر اس رات ملت علی خان اس حادثے کا شکار ہو گئے۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کر یہ خیال میرے دل میں آتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔''

رابعہ بیگم کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ چونک کر بولیں۔

''اے ہاں' خدا کی مار میری یادداشت پر۔ مجھے تو یاد ہی نہ رہا۔ آپ نے جو باتیں ملت علی خان سے کی تھیں وہ مہر النساء بہن نے سن لی تھیں۔''

''کیا مطلب؟'' شرافت حسین چونک پڑے۔

''ہاں۔ مجھ سے بات کر رہی تھیں خزانے کے بارے میں۔ کہنے لگیں کہ اگر آپ کو اس خزانے کے بارے میں معلوم ہو تو کیوں نہ ہم اس خزانے کو نکال لیں اور اپنی بگڑی بنائیں۔''

''ارے تو یہ کیا ہوا؟ تم نے مجھ سے تذکرہ بھی نہ کیا۔''

''لیجیے' ان حالات میں بھلا گنجائش ہی کہاں تھی دوسری باتیں کرنے کی؟ درود فاتحہ اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں الجھی رہی۔ بے چارے ملت علی خان کا غم ایسا تو نہیں تھا کہ دوسری باتیں یاد رکھی جاتیں۔''

شرافت حسین کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر گردن جھٹک کر بولے۔

''اپنی اس حماقت کا کبھی ازالہ نہیں کر سکوں گا۔ مجھے تذکرہ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ بات یاد کر کے کہ قربت شاہ نے اس کے لیے منع کیا تھا۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔ شرافت حسین اب یہ سوچ رہے تھے کہ سبزی منڈی کے کام کے علاوہ اب انہیں اور کوئی کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ سبزی منڈی جاتے ہوئے تو دل دکھتا تھا۔ بہر طور خدا نے اتنا دے دیا کہ کسی قسم کی پریشانی نہیں رہی تھی۔ لیکن پھر بھی ہاتھ پاؤں ہلاتے رہنا ہی مناسب ہوگا۔ جواد اور سجاد تو ابھی اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ ان کے بارے میں کچھ سوچا جاتا۔ مہر النساء بیگم کی ذمہ داری بھی اب شرافت حسین پر ہی تھی لیکن ایک بات ان کے دل کو تقویت دیئے ہوئے تھی۔ قربت شاہ صاحب کی وہ اجازت کہ اگر یہ مال ضرورت مندوں پر

خرچ ہو جائے تو اس کا کوئی حساب نہیں۔ چنانچہ اگر واقعی کوئی مشکل پیش آ گئی تو پھر اس میں سے کچھ لینا مناسب ہوگا۔ کم از کم انہیں اچھا مستقبل مل ہی جائے گا۔ بہر طور دوسرے دن صبح وہ گھر سے نکل گئے۔ گھر کے معمولات میں کچھ تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ جواد' سجاد کالج نہیں جا رہے تھے۔ ثمر بھی نہیں جا رہی تھی۔ ابھی ملت علی خان کا سوگ ختم نہیں ہوا تھا۔ ہر قسم کی نیاز نذریں ہو چکی تھیں۔ بے چاری وحیدہ آپا اکثر آ جایا کرتی تھیں اور جب بھی آتیں اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ لے کر آتیں۔ وحیدہ آپا گھر نمبر ایک سو بائیس بٹہ دو میں رہتی تھیں اور ان کے شوہر کا نام نصرت بیگ تھا۔ میرٹھ کے رہنے والے اور اچھے لوگ تھے۔ ایک بیٹا تھا ان کا جس کا نام شمشاد بیگ تھا۔ لیکن شمشاد بیگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ دن بھر چھت پر کھڑے ہو کر کبوتر اڑانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ تاہم ابھی تک کسی کو اس پر ایسا اعتراض نہیں ہوا تھا جب شمشاد بیگ کی شخصیت داغ دار ہو جاتی۔ بس اس کا نکھٹو پن ہی محلے والوں کو پسند نہیں آیا تھا۔ وحیدہ آپا آج آئیں تو ان کے ہاتھ میں پایوں کا برتن دبا ہوا تھا۔ گرم گرم پائے جو رات کو پکائے گئے تھے۔

''ارے یہ بچے کہاں ہیں؟ جواد' سجاد آ جاؤ' بھئی گرم گرم پائے کھالو۔''

مہر النساء بیگم اپنے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ بہت دکھی رہتی تھیں بے چاری۔ بہر طور وحیدہ آپا کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور پھر دوسری باتیں ہونے لگیں۔ رابعہ بیگم باورچی خانے میں چلی گئی تھیں۔ گرم گرم روٹیاں پکائیں اور پھر پائے برتنوں میں نکال کر بچوں کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ وحیدہ آپا کو یہ عادت تھی کہ وہ کھلا پلا کر بہت خوش ہونے والوں میں سے تھیں۔ ویسے بھی بڑی نفیس خاتون تھیں۔ ان کے گھر میں آتیں تو بھی کبھی جھاڑو لے کر پورے گھر کی صفائی کر ڈالتیں اور ایک ایک جگہ سے کوڑا نکال کر باہر پھینک دیتیں۔ کئی بار رابعہ بیگم نے منع بھی کیا تھا مگر وہ کہتی کہ بوا ہاتھ پاؤں کا کیا اگر کسی کے کام آ جائے تو آخر حرج ہی کیا ہے۔ اپنا گھر سمجھ کر یہ سب کچھ کرتی ہوں۔ منع کرو گی تو دکھ ہوگا۔ لیکن ایسے لمحات میں کسی نے بھی وحیدہ آپا کی آنکھوں پر غور نہیں کیا تھا جو ایک ایک کونے کھدرے کا اس طرح جائزہ لیتی رہتی تھیں جیسے کسی خزانے کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ بارہا انہیں مشکوک انداز میں چیزیں ٹٹولتے ہوئے بھی دیکھا گیا تھا۔ وہ دیواروں کو ٹھونکتی بجاتی رہتی تھیں لیکن سادہ دل رابعہ بیگم یا مہر النساء نے کبھی ان کی اس حرکت پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ تو بس اسی بات سے ممنون تھیں کہ

وحیدہ آپا اپنی ذات سے کتنی اچھی اور ملنسار خاتون ہیں۔ بہر طور بیگم نصرت بیگ اپنے کام میں مصروف تھیں اور نصرت بیگ کو مسلسل رپورٹیں دی جا رہی تھیں۔ ان رپورٹوں میں بیگم نصرت بیگ کی جھنجھلاہٹیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

''تم نے مجھے اس گھر کی نوکرانی بنا کر رکھ دیا ہے۔ کب تک جھاڑوئیں دیتی رہوں اس لمبے چوڑے گھر میں۔ ہر جگہ تو ٹٹول کر دیکھ لی۔ نہ کہیں زمین کھدی ہوئی نظر آئی ہے نہ دیوار میں کوئی پوشیدہ دراز ہے۔ اوپر سے خرچا الگ ہو رہا ہے۔ میں کہتی ہوں کب تک اپنا مال لگاتے رہو گے خزانے کے چکر میں اچھا خاصا سامان جا چکا ہے ان کے گھر میں۔'' نصرت بیگ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

اسی وقت شمشو کی آواز سنائی دی۔

''ہار مان لو ابا۔ میں کہہ رہا ہوں ہار مان لو۔ یہ کام تم لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔ سنا ابا جی زمانہ نئی قیادت کا ہے۔'' نصرت بیگ چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ شمشو تھوڑے فاصلے پر ہی بیٹھا تھا۔

''تو پھر یہاں آ مرا۔ کیا کر رہا ہے؟''

''لو ابا جی میں بھی تو اسی گھر میں رہتا ہوں۔ اماں اب تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ابا میری صورت سے ہی نفرت کرتے ہیں۔ میں ان کے بھلے کے لیے سوچتا رہتا ہوں اور یہ ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ ابا جی تم ایک بات لکھ لو میری تم کبھی اس خزانے کو تلاش نہیں کر سکو گے اگر تلاش کر کے دکھائیں تو تو بس میاں شمشو۔ زمانہ نوجوان قیادت کا ہے' سمجھے ابا جی۔''

''ابے او قیامت' او قیامت۔'' نصرت بیگ دانت پیس کر غرائے۔

''لو صحیح لفظ تو کہنا آتا نہیں۔ قیامت نہیں قیادت' قیادت۔''

''ابے قیادت کوئی ڈھنگ کا کام کر لے بیٹا۔ دیکھ کوئی ڈھنگ کا کام کر لے۔ بڑوں کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑایا کرتے۔ محلے میں پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں۔ یہ کبوتر ہمارا مذاق اڑواتے ہیں پورے محلے میں۔ کسی اور کے گھر میں کوئی کبوتر دیکھا۔ ہماری ہی چھت سے اڑتے ہیں اور تو سسرے چھت پر کھڑا اونٹ کی طرح بلبلاتا رہتا ہے جب تو چھت پر کھڑے ہو کر جوکروں کی طرح اچھل کود مچاتا ہے اور منہ سے ہو ہا کی آواز نکالتا ہے تو قسم اللہ کی لوگ رک رک کر دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ باؤلا کہاں سے آ گیا۔''

"لو اباجی۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتے تم۔ وہ تو قبوتروں کی بہار دیکھتے ہیں۔ اماں سمجھاؤ نانا ابا کو میرا ایک ہی شوق ہے اس کے پیچھے لگ گئے ہیں۔"

"خدا ہی تم دونوں کو سمجھائے۔" نصرت بیگ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر باہر چلے گئے۔ شمشو چند لمحات دروازے کو دیکھتا رہا پھر ماں کی طرف مڑ کر بولا۔

"ابا جی سے کہو کہ اب وہ اپنی چادر سمیٹ لیں۔ اب میں دکھاؤں گا کبوتروں کا نظام جاسوسی۔ کیا سمجھیں اماں۔"

"اے بیٹا کوئی ایسی ویسی مت کر بیٹھو۔ خواہ مخواہ میرے سر آئے گی۔ یہ نانا میاں کا خدا بھلا کرے پتا نہیں کس چکر میں ڈال گئے ہم سب کو۔ ہائے میں تو سینکڑوں روپوں سے لٹ گئی۔ اتنا مال پہنچایا ہے ان کے گھر کہ......"

"اب یہ تیری غلطی ہے اماں، ابا کے کہنے میں آجاتی ہے ہمیشہ۔ ارے کبھی میرا تو کہنا مان کر دیکھ۔ میں کیا دکھاتا ہوں تجھے۔"

"اچھا اچھا۔ بے کار بات مت کر۔ اپنے کام سے کام رکھ کوئی خزانہ وزانہ نہیں ہے وہاں بس۔ سب نانا میاں کے دماغ کی خرابی تھی۔ ہماری جان کو مصیبت لگا گئے۔ خدا نہیں عقل دے۔"

"اب اس عمر میں کیا عقل دے گا۔ عقل جو دی تھی وہ تو ختم کر بیٹھے۔" شمشو نے کہا اور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔

◇◇◇

وقت سے بہت سی کہانیاں منسوب کر دی جاتی ہیں۔ لاتعداد کہاوتوں کا محور وقت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے اور انسان کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صبر آجاتا ہے۔ لیکن صبر کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہی صبر معمول بن جاتا ہے۔

اس گھر میں مجبوری اپنا کھاتا کھول چکی تھی۔ ملت علی خان چلے گئے تھے۔ یادیں باقی رہ گئیں تھیں اور رفتہ رفتہ یہ یادیں بھی دھندلاتی جا رہی تھیں۔ جواد اور سجاد نے اپنی تعلیم پھر سے شروع کر دی تھی۔ ثمر بھی کالج جانے لگی تھی اور شرافت حسین نے اپنا پرانا کام پھر سے شروع کر دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ جب بھی سبزی منڈی جاتے ملت علی خان کی ایک ایک یاد ان کے ساتھ رہتی لیکن آنسو پی کر کام کرتے رہتے۔ بالآخر ان کے ذہن میں بھی ملت علی خان دھندلا گئے۔ ان کا کام بدستور جاری تھا اور زندگی کی گاڑی پھر سے چل پڑی تھی۔ مہر النساء بیگم کو ملت علی خان بہت کچھ دے گئے تھے جو کچھ کمایا تھا اور اس میں جوان کا حصہ بنتا تھا وہ مہر النساء ہی کو دے دیا جاتا تھا۔ مل جل کر گزارا ہو رہا تھا۔ کبھی شرافت حسین نے یہ نہ کہا کہ گھر کے اخراجات کی کیا کیفیت ہے۔

مہر النساء بیگم کے دل میں ایک خلش ہمیشہ سے باقی رہی تھی۔ وحدت علی خان اب ایک خواب بن کر رہ گئے تھے اور کبھی کبھی ان کا تصور ذہن میں آتا تو غم اور جھنجھلاہٹ دونوں ہی کا شکار ہو جاتی تھیں لیکن کہنے کے لیے کوئی نہ تھا جس کے سامنے دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ شرافت حسین اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد آچکے تھے اور وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے چھت پر چلے گئے تھے۔ دن بھر کے سوکھے ہوئے کپڑے الگنی پر ٹنگے ہوئے تھے اور ثمر ان کپڑوں کو اتارنے کے لیے چھت پر چڑھی تھی۔ جھٹپٹا پھیل چکا تھا۔ چھت کے کچھ گوشے تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔ اس خیال کے تحت کہ بادل چھائے ہوئے ہیں کہیں بوندا باندی نہ شروع ہو جائے۔ ثمر جلدی جلدی کپڑے اتار رہی تھی پھر اسی طرح کپڑے اتارتی ہوئی وہ ایک گوشے میں پہنچی تو دفعتاً اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

یہاں کوئی موجود تھا۔ ثمر الٹے قدموں دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ شرافت حسین سلام پھیر چکے تھے۔ ثمر کی چیخ پر وہ چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔ ثمر کے حلق سے خوف زدہ آوازیں نکل رہی

تھیں۔

''ماموں جان چور۔ ماموں جان چور۔''

''کہاں ہے بھئی چور۔ کہاں ہے؟'' شرافت حسین نے پاس پڑی ہوئی لوہے کی سلاخ اٹھائی اور ثمر کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ اتنی دیر میں انہوں نے اس ہیولے کو دیکھ لیا جو اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شرافت حسین اس کے قریب پہنچ گئے اور سلاخ ہاتھ میں تولتے ہوئے بولے۔

''کون ہے بے تو۔ یہاں کیسے آیا؟''

''قسم اللہ کی جی۔ ایک سو بائیس بٹادو میں رہتا ہوں۔ شمشو ہے میرا نام' شمشو۔'' ہیولے کی گھگھیائی ہوئی آواز سنائی دی اور شرافت حسین چونک پڑے۔

''ایک سو بائیس بٹادو۔ ایک سو بائیس بٹادو میں تو نصرت بیگ رہتے ہیں۔''

''انہی کا لونڈا ہوں جی۔ شمشاد بیگ ہے میرا نام۔ ابا اماں پیار سے شمشو کہتے ہیں۔''

''مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''قبوتر پکڑنے آیا تھا جی' میرا قبوتر یہاں آ گیا تھا۔''

''کہاں سے آئے تھے کبوتر پکڑنے؟'' شرافت حسین نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''وہ جی پیچھے پایپ لائنیں ہیں نا' ان سے چڑھ آیا تھا۔''

''پایپ لائنوں سے؟''

''جی۔ قبوتر آ گیا تھا جی۔''

''لیکن تمہیں بلا اجازت اوپر نہیں آنا چاہیے تھا۔ کم از کم کسی سے پوچھ تو لیتے۔''

''قبوتر بھی تو بلا اجازت ہی آ گیا تھا جی۔'' شمشو نے سادگی سے کہا اور شرافت حسین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے ثمر سے کہا۔

''نہیں ثمر بیٹی' یہ چور نہیں ہے کبوتر باز ہے۔ کبوتر پکڑنے آ گیا تھا اپنا۔'' پھر وہ شمشو کی طرف رخ کر کے بولے۔

''سنو۔ آج تو معاف کیے دیتا ہوں' آئندہ اس طرح اوپر نہ آنا۔ جاؤ نصرت بیگ سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں ورنہ تمہاری مرمت کر دیتا۔''

''جاتا ہوں جی۔ وہ بس سرا قبوتر۔'' شمشاد نے جان بچی لاکھوں پائے کے مصداق کہا اور واپس پایپ لائنوں کی طرف پلٹا۔

''ادھر سے نہیں ادھر سے۔'' شرافت حسین غرائے اور شمشو چونک کر رک گیا۔

''ادھر سے جی۔''

''ہاں ادھر سے چلو۔'' شرافت حسین نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا اور شمشو مرے مرے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ثمر غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر شمشو سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آیا۔ اتفاق کی بات جواد' سجاد یا اور کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ شمشو کو خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر نکال دیا گیا۔ ثمر اب بھی خوف زدہ تھی۔

◇◇◇

شاہ جہاں بیگم کا کلیجہ گز بھر کا ہو گیا تھا۔ وہ بہت فکر مند تھیں اس سلسلے میں اور جانتی تھی کہ ان کی حقیقت سلطانہ کو معلوم ہو گی تو وہ سخت پریشان ہو جائے گی۔ لیکن سلطانہ نے جس بڑائی کا ثبوت دیا تھا اس نے شاہ جہاں بیگم کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ انسانوں کی اس بستی میں ان کا بھی کوئی مقام ہے۔ بہر طور اس مرحلے سے بخوبی نکل گئی تھیں اور سلطانہ کے اعتماد میں آ جانے کے بعد اب انہیں بیگم ارباب کی کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ ویسے انہیں حیرت تھی کہ بیگم ارباب نے اپنا رویہ اچانک کیوں تبدیل کر لیا۔ کچھ احساسات تھے ذہن میں لیکن ان کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ زبردستی تو نہیں تھی ظاہر ہے کوئی کسی کو زندگی بھر تو اپنے گھر رکھنے سے رہا۔ برے وقت میں اتنا ہی ساتھ دے دیا تھا انہوں نے تو بہت تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی خاص وجہ ہو لیکن انہیں اب یہ فکر ہو گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ انتظام کر لینا ضروری ہے۔ کم بخت نوشہ میاں کے بارے میں جانتی تھیں کہ ڈھیٹ ہڈی کا مالک ہے۔ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا اور پھر گھر دیکھ گیا ہے۔ عذاب ہی بن جائے گا۔ اس سے پہلے کہ دھکے مار کر نکالی جائیں بہتر ہے خود ہی

یہ جگہ چھوڑ دیں۔ جہاں سلائی کرنے جاتی تھیں وہاں بھی اب جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ نوشہ میاں وہاں بھی پہنچ جائے گا۔ طویل عرصہ شاہ جہاں بیگم کا اور اس کا ساتھ رہا تھا اور نوشہ میاں کی کمینگی کو ان سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔ چنانچہ اب فکر ہوئی کہ سب سے پہلے سر چھپانے کے ٹھکانے کا بندوبست کرلیا جائے۔ کم از کم آنکھ کی ہی شرم رہ جائے گی۔ مگر اس افراتفری کے عالم میں ......اس نازک دور میں کسی گھر کا تصور ہی دل کی دھڑکنیں بند کردینے کے لیے کافی تھا۔ دولت مندوں کو گھر نہیں مل پاتے تو ان بے سہارا عورتوں کے لیے گھر کا بندوبست کہاں سے ہوتا؟ تاہم لڑکیوں کو سمجھا بجھا کر دوسرے دن گھر سے نکل گئیں اور ایسی جگہوں کو تلاش کرنے لگیں جہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ مل جائے۔ شناساؤں میں بھلا کون تھا جو ان کی اس سلسلے میں مدد کرتا۔ ہر ایرے غیرے کی شکل دیکھ رہی تھیں اور نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں۔ پھر اتفاق کی بات کہ ایک خاتون سے ملاقات ہوگئی۔ بازار سے سودا ترکاری خرید کر لا رہی تھیں اور تھک کر ہانپ گئی تھیں۔ ایک جگہ بیٹھیں تو شاہ جہاں بیگم نے قریب پہنچ کر ہمدردی سے کہا۔

"اگر آپ کہیں تو آپ کا بوجھ میں بانٹ لوں؟"

خاتون نے شاہ جہاں بیگم کو دیکھا اور ممنونیت سے بولیں۔ "بہن کیا بوجھ بانٹو گی میرا؟ یہ تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ ایک دن تم مل گئیں' بس وہ سامنے والی کوٹھی تک جانا ہے۔ یہ تھیلا وہاں تک پہنچا دو۔" خاتون نے شاہ جہاں بیگم کی طرف سامان کا تھیلا بڑھاتے ہوئے کہا اور شاہ جہاں بیگم نے بخوشی وہ تھیلا اٹھالیا۔

"اس کوٹھی میں کھانا پکاتی ہوں۔ بڑی مشکل سے اللہ نے یہ وسیلہ لگایا ہے۔"

"اچھا......اچھا۔ کہاں رہتی ہیں' اس کوٹھی میں؟"

"نہیں بہن' رہتی تو بہت دور ہوں۔ ایک بیرک میں پناہ ملی ہے۔ بس وہیں گزارا کر رہی ہوں۔ ایک بیٹی ہے' دو بیٹے ہیں مگر چھوٹے اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ کا حکم' سہارے چھن گئے۔"

"بڑا افسوس ہوا۔ واقعی بڑے دکھ اٹھائے ہیں آپ نے۔"

"بس بی بی تقدیر کی بات ہے۔ جو بھی قسمت میں لکھا جائے' سانسوں کی یہ ڈور تو

گھسیٹنی ہی پڑتی ہے۔ ویسے تم کہاں رہتی ہو؟"

"ایک عارضی جگہ پر سر چھپانے کا ٹھکانہ مل گیا تھا اب وہ بھی چھننے والا ہے۔ سر چھپانے کے ٹھکانے کی تلاش میں ہوں۔ اس سلسلے میں پاگل ہو رہی ہوں۔"

"اے بوا کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"تین بیٹیاں ہیں آپا۔ کوئی مرد ساتھ نہیں ہے۔"

"ہوں! ایسا کرو میرے ساتھ بیرک میں چل کر رہو۔ کئی بیرکیں ابھی خالی پڑی ہوئی ہیں۔ میرے برابر والی جگہ بھی خالی پڑی ہے۔ پچیس روپے کی پرچی بنتی ہے۔ اگر آج ہی میرے ساتھ چلو تو میں پرچی بنوادوں' کم از کم عارضی ٹھکانہ تو مل جائے گا۔"

"اگر آپ یہ کام کردیں تو میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔"

"نہیں بہن! اس وقت تو ہم بے سہارا لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنی ہی چاہیے۔ اس میں کوئی احسان نہیں ہے۔ تم یوں کرو کہ شام کو چھ بجے میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ہی لے چلوں گی۔ ذرا لمبا راستہ ہے مگر کام بن جائے تو کیا حرج اور سنو پچیس روپے لیتی آنا۔"

"آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔" شاہ جہاں بیگم نے کہا اور خاتون کو کوٹھی تک پہنچا آئیں۔

امید تو نہیں تھی کہ ان کے پہلے دن کی کوشش ہی اس طرح بارآور ہوجائے گی لیکن آس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ وہاں سے گھر واپس آگئیں۔ کسی سے کچھ نہ کہا البتہ ساڑھے پانچ بجے تیار ہوکر ہانپتی کانپتی اس جگہ پہنچ گئیں جہاں ان خاتون کو چھوڑا تھا۔ ٹھیک چھ بجے خاتون باہر نکلیں تو شاہ جہاں بیگم ان کے انتظار میں تھیں۔

"اے میں سوچ رہی تھیں کہ کہیں تم بھول نہ جاؤ راستہ۔"

"نہیں' آپ نے اتنا بڑا سہارا دیا ہے۔ یہ کوئی بھولنے کی بات ہے۔"

خاتون انہیں ساتھ لے کر چل پڑیں اور پھر ایک بس میں بیٹھ کر واقعی کافی لمبا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا۔ پہلی بار شاہ جہاں بیگم نے وہ بیرک دیکھی۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں' چھت پر

کھپریل پڑے ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے روشن دان نیچے روشنی بکھیر رہے تھے۔ فضا میں جھٹپٹے چھاتے جا رہے تھے۔ خاتون اپنی بیرک میں جانے کے بجائے انہیں ساتھ لیے ہوئے ایک چھوٹے سے دفتر میں پہنچیں جو بیرک ہی کے ایک حصے میں بنا ہوا تھا۔ وہاں انہوں نے کسی سے بات کی۔ پچیس روپے دیئے اور شاہ جہاں بیگم کو ایک پرچی مل گئی۔ اس پرچی پر بیرک کا نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ بیرک وہ تو نہیں تھی جہاں وہ خاتون رہتی تھیں بلکہ ان سے کچھ فاصلے پر ایک اور بیرک تھی۔ اس کا نمبر تلاش کرنے میں خاصی رات ہو گئی۔ بالآخرہ چھوٹی سی جگہ شاہ جہاں بیگم کو مل گئی۔ وہ خاتون جنہوں نے اپنا نام رقیہ بیگم بتایا تھا' کہنے لگیں۔

"بوا آج رات میں تمہاری اس بیرک میں رہ جاتی ہوں۔ تم کل اپنی لڑکیوں کو لے کر صبح صبح ہی یہاں پہنچ جاؤ اور قبضہ لے لو۔ سب کچھ ہوتا ہے بی بی۔ اگر کسی اور نے پچیس کے بجائے پچاس دے دیئے تو کل وہ یہاں نظر آئے گا۔"

"کیا رات کو میں یہاں رکوں؟"

"ارے نہیں۔ آج رات میں نکلوا دوں گی تمہاری۔ گھر میں بچوں کو چھوڑ دوں گی میں یہاں رہ جاؤں گی۔ کل صبح تڑکے پہنچ جانا۔"

"ٹھیک ہے' میں آپ کا یہ احسان......"

"پھر وہی بات۔ جو بھی ضرورت ہو بتا دینا مجھے۔" رقیہ بیگم نے کہا۔

شاہ جہاں بیگم پتا پوچھتی ہوئی بس میں بیٹھیں اور پھر لمبا سفر طے کر کے کسی نہ کسی طرح گھر واپس پہنچ گئیں۔ بیگم ارباب اب ذرا ان لوگوں سے کم ہی واسطہ رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے سلطانہ سے بھی ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ ایسی ہی ذہن میں بیٹھ گئی تھی۔ سلطانہ نے بھی ان کا یہ رویہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اور خود کو سنبھال لیا تھا۔ وقت جب ناسازگار ہوتا ہے تو اسی قسم کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ تو بہت پکی ہو گئی تھی اور اب اس دنیا کو ضرورت سے زیادہ ہی سمجھنے لگی تھی چنانچہ اسے بیگم ارباب کے اس رویے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ البتہ اس کی سوچوں میں نہ جانے کیا کیا تصورات رہتے تھے۔ عارض کا خیال بھی آتا تھا۔

اس وقت جذباتی ہو گیا تھا۔ لیکن دنیا پہلے اپنے بارے میں سوچتی ہے اس کے بعد اسے دوسروں کا خیال آتا ہے۔ عارض نے سوچا ہو گا کہ یہ بلا اپنے سر لگانا مناسب نہیں ہے اور پھر اس کا ایسا سوچنا ٹھیک بھی تھا۔ ظاہر ہے میں اب اس قابل نہیں ہوں تو کسی دوسرے کو داغ دار کیوں کروں؟ عارض ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے حالانکہ اس کا باپ میرے باپ سے بُرا نہیں تھا لیکن یہ بیتے وقتوں کی بات تھی اب صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ چنانچہ عارض کو قصوروار قرار دینا مناسب نہیں تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے رات کا کھانا سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"چلو بچیو کھانا کھا لو اور ہاں کھانے کے بعد تم سے کچھ باتیں بھی کرنی ہیں۔"

"کیا اماں؟"

"کہا ناں کھانے کے بعد۔" شاہ جہاں نے ممتاز کو جواب دیا۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ اب یہ کھانا بیگم ارباب کے ذریعے نہیں ملتا تھا بلکہ جو کچھ بھی ہوتا شاہ جہاں بیگم خود ہی کر لیتی تھیں۔ پچھلے دنوں سلائی کے کام سے جو پیسے ہاتھ لگے تھے وہ اب کام آ رہے تھے۔ پچیس روپے بھی اس میں سے دے دیئے تھے ورنہ بیگم ارباب سے مانگنے پڑتے اور یہ کوئی بہتر کام نہ ہوتا۔ ابھی کچھ عرصے کا گزارا تو ہو سکتا تھا لیکن اس کے بعد دوسرے مسائل بھی منہ پھاڑے ہوئے کھڑے تھے۔ کیونکہ جتنے فاصلے پر وہ بیرک واقع تھی وہاں سے سلائی کی جگہ آنا ممکن نہیں تھا اور پھر ویسے بھی نوشہ میاں کی وجہ سے اس طرف آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں شاہ جہاں بیگم۔ کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ تینوں بچیوں کے سامنے بیٹھ گئیں اور پھر انہوں نے کہا۔

"کہنے کی بات نہیں ہے۔ انسان ایک احسان کر دے تو کبھی اس کے احسان کو نہیں بھولنا چاہیے۔ بیگم ارباب نے جس طرح ہمیں اپنے کلیجے سے لگا کر رکھا' ان کے اس احسان کو ہم کبھی نہیں بھول سکتے لیکن کیا اب تم لوگوں نے یہ بات محسوس کر لی ہے کہ وہ پہلے جیسی نہیں رہیں؟"

"ہاں اماں۔ اب تو وہ ہمارے سلام کا جواب تک نہیں دیتیں۔" نور جہاں نے کہا۔

"نہیں بیٹی۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ دیکھا نہیں ہو گا انہوں نے سنا نہیں ہو گا ورنہ

ایسی تو نہیں ہیں لیکن رویہ ضرور بدلا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کہاں تک کسی کا ساتھ دے سکتا ہے؟ ان کے اپنے ملنے جلنے والے ہیں۔ پتا نہیں کیا کیا ضرورتیں ہوں۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ کچھ اور مہمان آنے والے ہیں اس لیے انیکسی کی ضرورت ہے۔''

''اماں تو کیا ہم یہ جگہ خالی کر دیں گے؟''

''کر دیں گے نہیں، کر رہے ہیں۔'' شاہ جہاں نے نور جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اب کہاں جائیں گے؟'' نور جہاں پریشان لہجے میں بولی۔

''ایک جگہ میں نے تلاش کر لی ہے۔ بیرک ہے۔ بہت سے لوگ وہاں رہتے ہیں۔ سارے کے سارے پناہ گزین ہیں اور بے چارے وہاں اپنا وقت کاٹ رہے ہیں۔ بیٹی تقدیر کے فیصلے تو اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے ہماری تقدیر میں ہمیں صبر و سکون کے ساتھ اسے قبول کر لینا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے امی۔ وہ بیرک ہے کہاں؟'' سلطانہ سے پوچھا اور جواب میں شاہ جہاں بیگم نے وہ پرچی نکال کر سلطانہ کے ہاتھ میں تھما دی۔

سلطانہ نے جگہ کا نام وغیرہ پڑھا۔ بیرک کا نمبر دیکھا اور مسکراتی ہوئی بولی۔

''لیجیے آپ تو باقاعدہ خریداری بھی کر آئیں۔''

''کیا کرتی بیٹی، ضروری تھا۔ عزت اس کائنات میں سب سے قیمتی شے ہے اور میں اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔'' شاہ جہاں بیگم نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا اور سلطانہ نے آگے بڑھ کر ہتھیلیوں سے ان کی آنکھوں کے آنسو پونچھ لیے۔

''جو ماں اپنی تین بیٹیوں کو عزت کا مقام دینے کے لیے سرگرداں ہو جائے اس سے زیادہ باعزت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

شاہ جہاں بیگم نے سلطانہ کو گلے سے لگا لیا اور کہنے لگیں۔ ''ایسے الفاظ کہہ کر تم مجھے نہ جانے کیا سے کیا بنا دیتی ہو؟ میرا خیال ہے ہم اگر اس وقت بیگم صاحبہ سے اپنی روانگی کے لیے کہہ دیں تو مناسب ہوگا۔ اس وقت وہ گھر میں موجود ہیں اور کہا نہیں جا سکتا کہ صبح کو وہ ملیں یا نہ

ملیں۔ ہر چیز انہیں بتانی ہے۔ جو کچھ ان کا یہاں موجود ہے ان کی نگاہوں کے سامنے لانا ہے۔ کہیں یوں نہ ہو کہ کل کو کوئی الزام لگ جائے۔''

''ٹھیک ہے امی۔ آپ ابھی ان سے ملاقات کر لیں۔''

''ہاں میں جاتی ہوں۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا اور اس کے بعد انیکسی سے باہر نکل آئیں۔

رات کے تقریباً پونے دس بج رہے تھے۔ بیگم ارباب اپنی خواب گاہ میں ملیں۔ ابھی جاگ رہی تھیں اور شاید کچھ کام کر رہی تھیں شاہ جہاں کو دیکھ کر انہوں نے سنجیدگی سے گردن اٹھائی اور بولیں۔

''خیریت شاہ جہاں کوئی خاص بات......؟''

''جی بیگم صاحبہ ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' بیگم ارباب کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ حالانکہ کچھ دن پہلے ان کے انداز میں بڑی نرمی، بڑی ہمدردی اور محبت ہوا کرتی تھی لیکن اچانک ہی ان کا رویہ بے حد سخت ہو گیا تھا۔

''جی وہ اللہ نے ہمارے لیے ایک بندوبست کر دیا ہے بیگم صاحبہ۔ میں کل صبح یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔''

بیگم ارباب چونک پڑیں۔ ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں ہمدردی کی ایک لہر نظر آئی لیکن دوسرے لمحے انہوں نے خود کو سنبھال لیا اور بولیں۔

''کہاں بندوبست کیا ہے تم نے اپنی رہائش کا؟''

''جی وہ بیگم صاحبہ پناہ گزینوں کی بیرکیں بنی ہوئی ہیں، وہیں پر ایک جگہ مل گئی ہے۔''

''بیرکیں تو بہت فاصلے پر ہیں۔'' بیگم ارباب نے کہا۔

''جی ہاں، یہاں سے بہت دور ہیں۔''

''اور تمہارے کام کا کیا ہوگا جو تم کر رہی ہو؟''

"یہ وہاں جا کر سوچا جائے گا بیگم صاحبہ۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ تو ضروری ہے۔ اب بعد کے معاملات بعد ہی میں دیکھے جائیں گے۔ میں دراصل یہ سوچ کر حاضر ہوئی تھی کہ صبح کو چلی جاؤں گی۔ وعدہ کر کے آئی ہوں۔ اگر انیکسی کا سامان چیک کر لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ کسی نوکر کو حکم دے دیجیے۔"

"ارے تمہیں شاہ جہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اگر صبح کو جا رہی ہو تو ٹھیک ہے۔ آرام سے چلی جانا۔ مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔ اور سنو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔"

"آپ کی محبتوں سے سب کچھ لے جا رہی ہوں۔ کسی شے کی ضرورت نہیں ہے بیگم صاحبہ۔"

"ہوں! پھر بھی لو یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو۔ ابتدائی طور پر کچھ دن کام آ جائیں گے۔ ورنہ پریشانی ہو گی۔" بیگم صاحبہ نے پانچ پانچ کے کچھ نوٹ نکال کر شاہ جہاں کی طرف بڑھائے۔

"آپ یقین کیجیے بیگم صاحبہ اگر ضرورت ہوتی تو ضرور لے لیتی۔ آپ ہی سے مدد ملی ہے آج تک۔ میرے پاس کچھ پیسے موجود ہیں۔" شاہ جہاں نے کہا۔

"رکھ لو شاہ جہاں۔ رکھ لو۔"

"نہیں بیگم صاحبہ، غیر ضروری طور پر تکلیف نہیں دینا چاہتی میں آپ کو۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔" بیگم ارباب نے نوٹ واپس رکھ لیے اور شاہ جہاں اسے سلام کر کے واپس پلٹ آئی۔ اب یہ ان کا مسئلہ تھا کہ وہ اس قدر اعتماد کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس میں شاہ جہاں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ دوسری صبح سبھی تڑکے جاگ گئے تھے۔ سامان وغیرہ کی پوٹلیاں رات ہی کو باندھ لی گئی تھیں اور پھر سامان ہی کیا تھا۔ انیکسی کو صاف ستھرا کر دیا گیا تھا اور پھر چاروں خواتین باہر نکل آئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بس میں بیٹھی اس علاقے میں جا رہی تھیں جہاں بیرکیں بنی ہوئی تھیں۔ سب کے سب خاموش تھے۔ راستے بھر کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شاہ جہاں بیگم بالآخر اس جگہ اتر گئیں۔ بس اسٹاپ سے ان بیرکوں کا

فاصلہ کافی طویل تھا۔ وہ یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس جگہ پہنچ گئیں جہاں ان کی اپنی بیرک تھی۔ رقیہ بیگم ابھی وہیں موجود تھیں اور ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے یہاں صفائی ستھرائی کر دی تھی۔ بیرکوں میں دونوں سمت ٹاٹ کے پردے لٹکے ہوئے تھے جن سے پارٹیشن کر دیے گئے تھے اس کے علاوہ ان میں کچھ نہ تھا۔ ایک دروازہ سامنے کی سمت تھا دوسرا عقبی حصے میں۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی ان بیرکوں میں بے شمار انسان رہ رہے تھے۔ رقیہ بیگم نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آ گئیں شاہ جہاں؟"

"جی آپا جی۔ آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نے میری وجہ سے ساری رات یہیں گزاری۔"

"نہیں بی بی، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ دکھی کا درد دکھی ہی جان سکتا ہے۔ یہ تمہاری بیٹیاں ہیں؟"

"جی ہاں، یہ نور جہاں ہے، یہ ممتاز ہے اور یہ سلطانہ۔"

"خدا ان کی حفاظت کرے۔ بہر طور احتیاط رکھنا بی بی جوان بچیوں کا ساتھ ہے اور زمانہ بہت نازک۔ میں چلتی ہوں پھر آؤں گی۔" رقیہ بیگم باہر نکل گئیں اور شاہ جہاں بیگم اپنی اس نئی رہائش گاہ کو دیکھنے لگیں انہوں نے دکھ بھری نگاہوں سے ممتاز، نور جہاں اور سلطانہ کو دیکھا لیکن سلطانہ کی آنکھوں میں ایک بھرپور چمک نظر آ رہی تھی۔

"بہت اچھی جگہ ہے زندگی سے بھرپور۔ مجھے ایسی ہی کسی جگہ کی تلاش تھی۔ امی۔" سلطانہ بیگم نے کہا اور شاہ جہاں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"خدا تیرے حوصلوں کو بلند کرے بیٹی کہ تو اس دنیا کو تسخیر کر لے۔ میرا دل رکھنے کے لیے تو جس انداز میں گفتگو کرتی ہے میں اس کا کوئی صلہ نہیں دے سکتی تھی۔"

"امی پھر وہی غیریت کی باتیں۔ ماں کا صلہ یہی کافی نہیں ہے کہ وہ ممتا بھری نگاہوں سے اپنی اولاد کو دیکھتی ہے؟ اور کسی بھی مصیبت کے وقت اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہے۔"

ممتاز اور نور جہاں مسکرانے لگیں پھر بولیں۔ ''بھئی یہ ہماری تیسری بہن ہم پر بازی لے گئی ہے۔ اب تو کبھی حسد ہونے لگتا ہے اس پر۔ اس نے تو ہماری اماں کو ہم سے چھین ہی لیا ہے۔''

''ناز نہیں کرتیں اپنی اس تیسری بہن پر؟ کیسی عظیم ہے یہ۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا۔

''کرتے ہیں' کرتے ہیں مگر کسی کو بتانا ضروری تو نہیں ہے۔'' ممتاز ہنستے ہوئے بولی پھر کہنے لگی۔ ''اور یہ رقیہ آپا کون تھیں؟''

''انہی نے تو یہ بیرک دلوائی ہے۔ ایک لفظ نہیں سنا تھا ان کا تم نے دکھی کا درد دکھی ہی سمجھتا ہے۔ بس راستے میں ہی مل گئی تھیں۔ بے چاری ایک گھر میں کھانا پکانے کا کام کرتی ہیں۔ بہت دور جانا پڑتا ہے انہیں بھی۔ اب میرا خیال ہے چلی گئی ہوں گی۔''

''اماں اب ہم یہاں آ تو گئے ہیں لیکن کریں گے کیا؟''

''تم لوگ آرام سے بیٹھو میں ذرا باہر کا چکر لگاتی ہوں۔ حال چال دیکھوں یہاں کے اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔'' شاہ جہاں بیگم باہر نکل گئیں۔ بیرک کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے۔ انسانی زندگی بہت بیمار بیمار لگ رہی تھی۔ بیرکوں کے درمیان ہی چھوٹے موٹے خوانچے لگے ہوئے تھے۔ شاہ جہاں بیگم کو اسی جگہ کی تلاش تھی۔ انہوں نے تھوڑی سی پوریاں اور ترکاری وغیرہ خریدی اور اس کے بعد وہاں کا ماحول دیکھتی ہوئی واپس آ گئیں۔ صبح کا ناشتا ان لوگوں نے کیا اور شاہ جہاں بیگم کہنے لگیں۔

''اس کے بعد مجھے چند اور انتظامات بھی کرنے ہیں۔ مثلاً پانی کے مٹکے چاہئیں۔ یہ تمام چیزیں میں ابھی مہیا کیے دیتی ہوں۔ تم لوگ آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

''اماں کھانا پکانے کے لیے چولہا بھی تو چاہیے ہوگا۔''

''مٹی کا چولہا بنائیں گے بیٹی' لکڑیاں میرے خیال سے یہاں مل جائیں گی۔ ٹال میں نے دیکھ لی ہے۔''

''کیا یہاں دکانیں بھی ہیں؟''

''ہر چیز موجود ہے۔ جہاں انسان رہتے ہیں وہاں کیا نہیں ہوتا؟'' شاہ جہاں بیگم

نے کہا اور اس کے بعد درحقیقت وہ مردانہ وار ہر کام کرنے لگیں۔ پانی کے مٹکے خریدے' سرکاری نلکوں سے انہیں بھرا۔ بیرک میں رکھنے کی جگہ بنائی' دوسری چیزیں بھی جو بہت معمولی قسم کی تھیں' حاصل کر لی گئی تھیں۔ پوری گرہستی کی ضرورت تھی۔ کچی مٹی لائیں' چولہا بنا کر لکڑیاں جمع کیں' ماچس' مٹی کا تیل' غرض زندگی گزارنے کے تمام لوازمات یہاں جمع کر لیے گئے۔ تھوڑا بہت سامان تھا اسے بیرک میں سجا دیا گیا' بستر تو بچھا لیے گئے تھے اور بس یہی کل کائنات بھی۔

رات کو تقریباً ساڑھے سات بجے رقیہ بیگم آئیں اور اپنے ساتھ کھانے پینے کی کافی چیزیں لے آئیں۔

''ارے یہ آپ نے کیا کیا رقیہ آپا؟''

''کیوں برا کیا ہے کیا؟ بس لے آئی۔''

''مم...... مگر؟''

''بوا میری اتنی حیثیت کہاں تھی کہ میں یہ سب کچھ تمہارے لیے لے کر آتی۔ بس جہاں کام کرتی ہوں وہاں ایک تقریب تھی۔ کچھ کھانا بچا تو مجھے دے دیا گیا۔ میں نے تھوڑا سا بچوں کو دیا اور باقی یہاں لے آئی۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اپنے بچوں کو بھی تو ہم سے ملایئے۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا۔

بیرکوں کے پردوں کی آڑ سے دوسری طرف کی تمام آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی جا رہی تھی۔ انیکسی بہت شاندار تھی اور وہاں کی زندگی کے بعد یہ ہولناک زندگی نہ جانے ان کے ذہنوں پر کس طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ لیکن کسی نے اس کا اظہار نہ کیا اور رات کے کسی حصے میں سب کی سب سو گئیں۔ دوسری صبح سے پھر زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔

ابھی تک ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی البتہ سب سے بڑی پریشانی شاہ جہاں بیگم کو تھی کیونکہ ان کے پاس جو کچھ تھا ختم ہوتا جا رہا تھا اور مزید آنے کی ابھی کوئی آس نہیں بندھی

تھی ہر جگہ کوشش کر رہی تھی۔ رقیہ بیگم سے تذکرہ کیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں بھی کہیں کوئی کام وغیرہ دلوا دیا جائے حالانکہ یہ تصور ہی موت کے مترادف تھا کہ اتنا لمبا سفر طے کر کے روزانہ کوٹھی میں جائیں۔ کھانا وغیرہ پکائیں اور رات کو واپس آئیں۔ رقیہ بیگم تو کمال کی عورت تھیں کہ اپنی عمر کے باوجود یہ ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھیں اور سچ بھی تھا زندگی کی گاڑی کو دھکیلنے کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی محنت کرنا پڑتی ہے ورنہ زندگی معطل ہو کر رہ جائے۔ تاہم ابھی تک شاہ جہاں بیگم کو اس کا موقع نہیں ملا تھا.......... اب وقت خوفناک سے خوفناک تر ہوتا چلا گیا اور بلا آخر وہ دن آ گیا۔ جب شاہ جہاں کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ گھر میں کھانے پینے کی کسی شے کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ بے چاری رقیہ بیگم بھی زیادہ سے زیادہ کیا مدد کر سکتی تھیں۔ چند بار کھانے پینے کی کچھ اشیاء ہی لے آئی تھیں۔ ان کے بھی اپنے تین بچے تھے اور ان کی تنہا ذات تھی جو ان کی کفالت کر رہی تھی۔ لیکن یہ خوش بختی ابھی تک شاہ جہاں بیگم کے حصے میں نہیں آ سکی تھی۔ شاہ جہاں بیگم رات ہی سے پریشان تھیں۔ صبح ہی صبح گھر سے نکل گئیں۔

اور آج ان کے پاس سلطانہ کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ دھوپ سخت تھی اور یہ پوری دھوپ انہوں نے اپنے سر سے گزاری تھی۔ پھر اس وقت دوپہر کے تقریباً ڈھائی بجے تھے جب ایک گاڑی وہاں پہنچی جس میں دیگیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بیگم صاحبہ دوسری گاڑی میں اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔ خیرات کا کھانا لایا گیا تھا اور اسے تقسیم ہونا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے قریب آنے والوں سے قطار بنانے کو کہا اور شاہ جہاں بیگم کے پاؤں لرزنے لگے۔ بالآخر وہ بھی قطار میں جا کھڑی ہوئیں۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ رہا تھا۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا لیکن وہ ہمت و حوصلے سے اس وقت کو ٹالنا چاہتی تھیں۔ وہ قطار میں آگے بڑھتی رہیں پھر جب وہ گاڑی کے قریب پہنچیں تو انہوں نے کھانا لینے کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔

''ہاتھوں میں لو گی مائی؟'' کسی نے ان سے سوال کیا اور شاہ جہاں بیگم کے ہاتھ لرز گئے۔

وہ خاتون جو یہ کھانا تقسیم کرنے آئی تھیں خود بھی اس تقسیم کی نگرانی کر رہی تھیں۔ انہوں نے شاہ جہاں بیگم کو دیکھا اور پھر نرم لہجے میں بولیں۔

''آپ ذرا ادھر آ جایئے۔''

شاہ جہاں بیگم قطار سے باہر نکل گئیں تو خاتون نے کہا۔ ''آپ کے پاس کوئی برتن نہیں ہے؟''

''نہیں۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع ہے کہ میں یہ کھانا لینے پر مجبور ہوئی ہوں۔ عادی نہیں ہوں، اس لیے اس کا طریقہ بھی نہیں جانتی۔'' خاتون نے ہمدردانہ نگاہوں سے انہیں دیکھا پھر بولیں۔

''ایک منٹ۔ میں کسی چیز کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔ آپ انہی بیرکوں میں رہتی ہیں؟''

''جی۔''

''کیا نام ہے آپ کا؟''

''شاہ جہاں۔'' شاہ جہاں بیگم نے جواب دیا۔

''اور کون کون ہے آپ کے ساتھ؟''

''تین بیٹیاں ہیں اور بس۔''

''کوئی مرد نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' شاہ جہاں بیگم آہستہ سے بولیں اور خاتون گہری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں پھر انہوں نے کہا۔

''ملازمت کریں گی آپ؟''

''اسی کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔''

''تو پھر آپ کو میرے پاس آنا پڑے گا۔ کیا آپ میرے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں گی؟''

''ضرور پہنچ جاؤں گی بیگم صاحبہ۔ کچھ بھی کام دے دیں، آپ دیکھیں گی کہ میں کتنی مستعدی سے ہر کام انجام دیتی ہوں۔''

''آپ کو میں پتہ لکھ کر دے دیتی ہوں۔'' خاتون نے اپنی گاڑی میں سے ایک کاغذ

اور قلم نکالا اور پھر اس پر پتا لکھ کر شاہ جہاں بیگم کو دے دیا پھر بولیں۔

''کل صبح دس بجے تک میرے پاس آ جایئے' کچھ نہ کچھ کر دوں گی آپ کے لیے۔''

''جی بہت بہتر۔'' شاہ جہاں بیگم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور خاتون نے کھانا تقسیم کرنے والوں میں سے ایک کو آواز دی پھر اس سے کہا کہ وہ کسی بھی چیز میں کھانے کا بندوبست کر کے ان خاتون کو دے دے۔

''ان لوگوں کے ساتھ کچھ برتن بھی تھے۔ سلور کے برتن میں کھانا ڈال کر شاہ جہاں بیگم کو دے دیا گیا اور خاتون نے کہا۔

''دیکھئے کل دس بجے تک میں آپ کے لیے رکوں گی اور کوئی کام نہیں کروں گی۔ آپ ضرور تشریف لے آیئے۔''

''میں یہ بھی نہیں کہوں گی آپ سے کہ آپ کا یہ احسان میری زندگی بنا دے گا۔''

''نہ کہیں تو اچھا ہے۔'' خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا اور شاہ جہاں بیگم بھیک کا یہ کھانا لے کر بیرک کی طرف پلٹ پڑیں۔

ایک طرف دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہ آج یہ نوبت آ گئی تو دوسری طرف خوشی کی ایک لہر بھی تھی کہ یہ پہلا اور آخری موقع ہے۔ قدرت انہیں بھیک مانگنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتی۔ بھیک کے پہلے برتن کے ساتھ ساتھ اس نے دوسرا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ بہر طور لڑکیوں پر یہ بالکل بھی ظاہر نہ کیا کہ یہ کھانا خیرات کا مانگ کر لائی ہیں۔

کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہ جہاں بیگم نے ان لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ ہوسکتا ہے انہیں نوکری مل جائے اور اس سلسلے میں انہوں نے کاغذ کا وہ پرزہ سلطانہ کو دکھاتے ہوئے کہا کہ ذرا اسے یہ پتا سمجھا دے۔ سلطانہ نے پتا دہرا دیا۔ بہر طور شاہ جہاں بیگم کے لیے یہ مشکل کام نہیں تھا کہ وہ اس پتے کو معلوم کرتی ہوئی وہاں پہنچ جائیں جہاں انہیں بلایا گیا تھا۔ باقی وقت بڑا پر ہول گزرا تھا۔ شاہ جہاں بیگم کے ذہن میں بار بار یہ تصور آ جاتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں یہ ملازمت نہ مل سکے۔ نہ جانے کس طرح یہ رات گزری۔ دوسرے دن صبح ہی صبح وہ چل پڑیں تا کہ وقت سے پہلے وہاں پہنچ جائیں جہاں انہیں

جانا ہے۔ بہت سے لوگوں سے راستے میں پتا معلوم کیا اور بالآخر اس خوبصورت کوٹھی کے آگے پہنچ گئیں جہاں انہیں بلایا گیا تھا۔ جوان بیرکوں سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور اگر تھوڑی سی جلدی نکل آیا جائے تو وہاں تک پیدل سفر بھی کیا جا سکتا تھا۔ کوٹھی اچھی خاصی تھی اور بہت نفیس طرز سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی نے شاہ جہاں بیگم سے ان کی آمد کی وجہ پوچھی تو ساہ جہاں بیگم نے وہ پرچہ اس کے سامنے کر دیا اور کہنے لگیں۔

''مجھے بیگم صاحبہ نے بلایا تھا۔''

ملازم نے پرچہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اندر چلا گیا۔ شاہ جہاں بیگم ایک جانب کھڑی ہوئی لرز رہی تھیں اور تھوڑی دیر بعد انہیں اندر سے بلاوا آ گیا۔ خاتون نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا اور پھر انہیں بیٹھنے کی پیشکش کی تھی۔ شاہ جہاں جھجکتی ہوئی کرسی کی جانب بڑھ گئیں اور پھر بیٹھ گئیں۔

''نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ آپ...... آپ کا تعلق کسی بہت بڑے خاندان سے ہے۔''

''جی نہیں بیگم صاحبہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرا کوئی خاندان نہیں ہے۔''

''آہ! کیسی کیسی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ سچ ہے جو بے خانماں ہو کر یہاں آئے ہیں اب ان کا کوئی خاندان نہیں رہا۔ تاہم میں یہ تو نہیں کہتی کہ میں آپ کی بہت زیادہ خدمت کر سکوں گی لیکن تھوڑا بہت کام میرا کر دیا کریں اور اس کے بدلے میں آپ کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کروں گی۔''

''بہت بہت شکریہ بیگم صاحبہ۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ درکار بھی نہیں ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے آپ کل سے آ جایئے اور براہ کرم یہ دس روپے رکھ لیجئے۔ آپ کے کام آئیں گے۔''

شاہ جہاں بیگم تھوڑی سی جھجکیں تو بیگم صاحبہ نے دس روپے کا نوٹ زبردستی ان کے لباس میں رکھ دیا اور شاہ جہاں بیگم دعائیں دیتی ہوئی چلی آئیں۔ زندگی نے ایک بار پھر ایک

بہتر موقع دیا تھا اور انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب اس موقع کو ہاتھ سے نہیں گنوائیں گی۔ واپس آ کر لڑکیوں کو نوکری مل جانے کی خوش خبری سنائی۔ دس روپے کے نوٹ نے بہت سے مسائل حل کر دیئے۔ چنانچہ دوسرے دن سے انہوں نے باقاعدہ بیگم صاحبہ کے گھر جانا شروع کر دیا۔

ابھی انہیں اس گھر کے بارے میں ذرا بھی معلومات نہیں تھی وہاں کون ہے؟ بیگم صاحبہ کا کیا نام ہے؟ ان کے شوہر کیا کرتے ہیں؟ اور یہ باتیں جاننے کے لیے تھیں بھی نہیں۔ اپنا کام انجام دے لیا جائے بس اتنا ہی کافی ہے۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اپنے فرائض انجام دینے لگیں اور ادھر اس چھوٹی سی بیرک میں ممتاز، نور جہاں اور سلطانہ وقت گزارتی رہیں۔ شاہ جہاں بیگم دس بجے چلی جاتیں اور شام کو چھ ساڑھے چھ بجے تک واپس آ تیں۔ اس دوران لڑکیاں بیرک ہی میں رہتیں۔ انہوں نے ایک بار بھی اس بیرک کے دروازے سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسی ہی ایک دوپہر کو جب کہ سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ پڑ رہی تھی اور لڑکیاں زمین پر بستر بچھا کر لیٹی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں کہ برابر کے پردے کے نیچے سے ایک ہاتھ نکلا جس میں کٹورا پکڑا ہوا تھا اور پھر ایک آواز سنائی دی۔

''اے بی! ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو دے دیجیو۔''

تینوں بری طرح چونک پڑیں۔ ٹاٹ کا پردہ تھوڑا اٹھا اور ایک مکروہ شکل نظر آئی۔ سیاہ چہرہ، بڑی بڑی موچھیں، سونے کا دانت جو مسکراہٹ سے نمایاں ہو گیا تھا۔ تینوں کچھ سہم سی گئیں۔

''بی پانی پلانا تو ثواب ہے۔ ایک کٹورا دیجیو ذرا بھر کے میرے گھر میں ٹھنڈا پانی ختم ہو گیا ہے۔'' آواز آئی۔

''پیچھے ہٹو۔ پردے کے نیچے سے جھانکنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔''

''لو بی پیاسا ہوں۔ کوئی بری بات تو نہیں کی میں نے۔ ایک کٹورا پانی دے دو گی تو کیا غضب ہو جائے گا۔'' ''ثواب کماؤ بی...... ثواب۔''

''میں کہتی ہوں پیچھے ہٹو ورنہ میں تمہارے منہ پر ٹھوکر لگاؤں گی۔'' ممتاز ذرا تیز بھی۔ وہ آگے بڑھی اور اپنا پاؤں اٹھا لیا۔ چہرہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

تینوں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ممتاز نے یہ ہمت کر تو ڈالی تھی لیکن اب خوف زدہ تھی۔

دوسرے دن گنڈیریوں سے بھرا ہوا پڑا پردے کے نیچے سے کھسک آیا اور آواز سنائی دی۔

''اے بی گنڈیری کھالو۔ تمہارے لیے لایا ہوں۔ تر گلاب کیوڑہ ہو رہی ہیں۔''

''نہیں ہمیں گنڈیری نہیں چاہئیں۔'' سلطانہ نے جواب دیا۔

''تکلف مت کرو۔ پڑوسی کا پڑوسی پر حق ہوتا ہے۔ لے لو۔ تمہیں ہماری قسم۔''

سلطانہ نے ایک لمحے تک کچھ سوچا پھر آہستہ سے بولی۔

''آپ گھوم کر دروازے سے آیئے۔''

''ابھی آئے۔ قسم اللہ کی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر وہ مکروہ شکل دروازے میں نظر آئی۔

''کون ہیں آپ؟ کیا نام ہے آپ کا؟''

''نام تو ہمارا قمر الدین ہے مگر یار دوست قمرو کہتے ہیں۔ آپ کون ہیں؟ سلطانہ، ممتاز یا نور جہاں؟''

''دیکھیے ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ سب ہی مصیبتوں کا شکار ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے کہ آپ اس طرح ہمیں تنگ کریں؟''

''اے لو، قسم اللہ کی تنگ کس بھوتنی والے نے کیا ہے؟ ہم تو پڑوسی کا حق نبھار ہے ہیں۔''

''تو پھر میں دوسرے پڑوسیوں کو یہ بات بتائے دیتی ہوں کہ آپ پردے کے نیچے سے جھانک کر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا جو حشر ہو گا وہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''اے بی، لو! نیکی کری تھی ہم نے تو۔ اس میں کون سی برائی کر ڈالی؟ بلاوجہ ہمیں دوسروں کے سامنے ذلیل کروانا چاہتی ہو۔ لاؤ واپس دے دو ہماری گنڈیریاں۔'' قمر الدین

عرف قمرو نے کہا اور سلطانہ نے گنڈیریوں کا پڑا اس کے منہ پر دے مارا۔ قمرالدین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بڑی پارسا بن رہی ہو۔ رہتی بیرک میں ہو۔ نخرے دکھا رہی ہو کوٹھیوں والے جیسے۔ ہنہ! ہمیں کون سی پروا ہوگی تمہاری۔" قمرالدین بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

◇◇◇

شمشاد ان دنوں دیوداس بنا ہوا تھا۔ داڑھی بڑھا رکھی تھی۔ تین دن سے گھر میں کھانا نہیں کھایا تھا اور بیگم نصرت بیگ کی پٹاری سے بیس روپے غائب ہو چکے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ ان دنوں شمشو باہر کھانا کھا رہا ہے۔ دل مسوس کر خاموش ہو گئی تھیں ورنہ طوفان اٹھا دیتیں۔ اس وقت بھی چھت سے شمشو کے درد بھرے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے' قسم اللہ کی
اب شمشو بھری دنیا میں تنہا رہ گئے' ہائے ہائے"

بیگم نصرت بیگ نے سیڑھیوں سے یہ آواز سنی اور جلبلاتی ہوئی اوپر پہنچ گئیں۔

"میں کہتی ہوں کب تک تو یہاں مرتا رہے گا۔ میرے ساتھ بھی کچھ کرائے گا کم بخت مارے۔"

"تمہارے ساتھ؟" شمشو چونک کر بولا۔

"ارے الٹے دماغ کے آدمی ہیں تیرے ابا۔ کہیں مجھ پر بھی تین بول نہ بول ڈالیں۔"

"ان کا ظلم حد سے بڑھ چکا ہے اماں' قسم اللہ کی اور جب ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو انقلاب آتا ہے۔ تو لکھ لے اماں انقلاب بہت دور نہیں ہے۔"

"میرے بیس روپے۔ سب خرچ کر ڈالے کم بخت' پان چھالیہ کو ترس رہی ہوں۔"

"تیری پان چھالیہ میرے پیٹ سے زیادہ ہو گئی۔ تندور پر روٹی کھا رہا ہوں تین دن سے۔ کیا مفت ملتیں؟"

"ارے تجھے گھر میں کھانے کو کس نے منع کیا تھا۔"

"حرام ہے اس گھر کی روٹی مجھ پر۔ ابا نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو اکبر بادشاہ نے انارکلی کے ساتھ بھی نہ کیا ہوگا۔ اماں خانہ برباد کر دیا مجھے۔ ہائے تو نہیں جانتی خالی چھت دیکھ کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ کان ترس گئے غٹرغوں غٹرغوں سننے کے لیے۔ قسم اللہ کی ڈربے بھی نہ چھوڑے۔ ارے تو نے ان ہلاکو خان سے شادی ہی کیوں کر لی تھی اماں۔" شمشو بین کرنے والے انداز میں بولا۔

"بھاڑ میں گئے تیرے ڈربے اور کبوتر۔ دیکھ ہوش میں آ جا' بہت ہو گئی۔"

"کچھ نہیں ہوئی اماں۔ ابھی تو ہو گی۔ میں بھی...... میں بھی اماں......"

"ہاں ہاں بول کر۔ کیا کرے گا۔ تو باپ کے سامنے آئے گا' بول؟"

"کوئی دماغ خراب ہوا ہے میرا۔ مگر اماں تو خود سوچ کتنے قیمتی کبوتر تھے میرے۔"

"جہنم میں گئے تیرے کبوتر۔ خواہ مخواہ پیسا برباد کر رہا تھا تیری۔ بڑی دولت ملتی ہے نا مجھے۔ قسم اللہ کی ایک بھی خریدا ہوا نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پکڑے تھے میں نے۔"

"تو کم بخت دوسروں کے گھروں میں گھسنا کیوں شروع کر دیا تو نے۔ وہ تو شرافت حسین شریف آدمی تھے۔ کوئی اور ہوتا تو سیدھا پولیس میں جاتا۔"

اب تو خزانہ کس نے میرے سر میں گھسیڑا تھا۔؟"

"ارے میں نے گھسیڑا تھا جیسا تو ویسا تیرا باپ اور ویسے ہی تیرے خاندان والے۔ میاں جی ویسے ہی باؤلے ہیں اور انہیں خزانے کے پھیر میں ڈال گئے۔" بیگم نصرت بیگ منہ ٹیڑھا کر کے بولیں۔

"لمبا سفر کر رہی ہے اماں' لمبا سفر کر رہی ہے۔ خاندان والوں تک پہنچ رہی ہے۔ ابا کے کان میں پڑ گئی تو جھٹکا ہو جائے گا تیرا۔"

بیگم نصرت بیگ فوراً سنبھل گئیں۔ انہوں نے شمشو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو کرائے گا میرا جھٹکا' تو کرے گا اپنے ابا سے میری شکایت۔ یہ باتیں بتائے گا تو انہیں؟"

''خیر سے میرے تو ان سے تعلقات ہمیشہ کے لیے خراب ہو گئے اماں۔ قبوتروں سے دشمنی انہیں راس نہیں آئے گی۔ قسم اللہ کی' کہہ دیا میں نے۔ میری دنیا اجاڑ کے وہ ظالم چین سے نہیں بیٹھ سکیں گے۔''

''ظالم کہہ رہا ہے اپنے باپ کو؟''

''آ گئی نا اوقات پر۔ اصل بات بول نا اماں کہ پیسوں کے چکر میں ہے' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری بھی ایک دنیا ہے۔ مجھے بھی جینا ہے۔ تین دن سے گھر میں کھانا نہیں کھا رہا۔ کہاں سے آ رہے ہوں گے یہ پیسے۔ ایک پیسہ نہیں بچا میرے پاس۔ بس تو ہاتھ دھولے ان پیسوں سے۔ اب تو ایسا ہی ہوگا۔ قبوتروں کی پوری قیمت وصول نہ کرلوں تو شمشو نام نہیں ہے۔''

''تیرا ستیاناس' ہائے مردار مجھ سے وصول کرے گا ساری قیمت؟''

''اے بی کہاں مرگئیں؟ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی کیا؟'' شمشو کے ساتھ ساتھ بیگم نصرت بھی ہل گئی تھیں۔

''آ گئے تیرے ابا۔''

''ارے ابا......!'' شمشو نے منڈیر کی طرف چھلانگ لگائی اور منڈیر پر چڑھ گیا۔

''ہائے ہائے کم بخت مرنے کا ارادہ ہے کیا۔ پاؤں پھسل گیا تو نیچے جا پڑے گا۔''

''جا رہا ہوں اماں۔ اللہ کی امان۔ اللہ بیلی۔''

''ارے ارے پاگل ہو گیا کیا بالکل۔ کہاں جا رہا ہے؟'' بیگم نصرت بیگ بولیں۔

''تو ابا کو بتا دے گی کہ میں یہاں چھت پر موجود ہوں اور وہ ادھر آ جائیں گے۔ کیا فائدہ موت تو دونوں طرف ہے۔'' شمشو نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

قربت نگر میں اس کے بہت سے شناسا تھے۔ ایک دو کو کبوتر بازی کا شوق بھی تھا۔ لیکن شمشو جیسا پائے کا کبوتر باز اس علاقے میں کوئی نہیں تھا۔ بے شمار مکانات بن چکے تھے اور ان مکانات میں بھانت بھانت کے لوگ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ چند دکانیں بھی تھیں جن پر بعض اوقات بے فکرے بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ شمشو ایک دکان کے سامنے سے گزرا تو کسی

نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''ابے او راج کپور' کدھر جا رہا ہے۔ ادھر آ میرے یار۔'' شمشو نے پلٹ کر دیکھا تو اسے دکان پر شدن میاں عرف دلیپ کمار نظر آئے۔ شکل وصورت سے تو وہ بڑی نسل کے الو نظر آتے تھے لیکن اپنے آپ کو دلیپ کمار ثانی تصور کرتے تھے۔ شمشو کو انہوں نے بتایا تھا کہ اس کے کٹس راج کپور سے بہت ملتے جلتے ہیں اور اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ اگر پاکستان فلم انڈسٹری نے کبھی ان کی جانب توجہ دی تو راج کپور کی حیثیت سے انہیں فلمی دنیا میں لانے کی کوشش ضرور کی جائے گی۔

شمشو ان کی جانب بڑھ گیا اور شدن بھیا نے اسے بیٹھنے کے لیے تختے پر جگہ چھوڑ دی۔

''کہاں جا رہا ہے میرے یار' آوارہ بادلوں کی طرح یوں۔ تیرا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ کئی دن سے چھجے پر بھی نظر نہیں آیا۔ اپنا تو دل اداس ہو گیا تھا۔

''میرے اوپر جو بپتا پڑی ہے' کیا وہ تمہیں نہیں معلوم شدن بھائی؟''

''جو اولاد نا خلف ہو اسے بھول جانا ہی اچھا ہے' راج کپور۔'' شدن کمار نے بھاری لہجے میں کہا۔

''دیکھ معاملہ قبوتروں کا ہے۔ اس میں کسی کو معاف نہیں کروں گا' قسم اللہ کی۔ میرے دل پر بیت رہی ہے اور تو اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔''

''اے نہیں' مذاق کون اڑا رہا ہے۔ میں تو ڈائیلاگ بول رہا ہوں۔ شدن کمار نے نرم پڑتے ہوئے کہا اور شمشو کے چہرے پر پھر اداسی چھا گئی۔

''آ یار' تھوڑی سی چہل قدمی کرتے ہیں۔ بڑی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں' پہلوان کے پاس۔ تو سنا کیسی گزر رہی ہے۔'' دونوں دکان کے تختے سے اتر کر ٹہلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

''یوں سمجھ لے بس جان سے گزر رہے ہیں' قبوتروں کے بغیر۔ کچھ ہوگا نہیں گھر سے بھاگنا پڑے گا۔''

''ابے بے وقوف گھر سے بھاگنا بھی کوئی عقل مندی ہے۔ کچھ کر کے دکھا اس دنیا میں۔ اس سنسار کو اپنے چرنوں میں ڈال لے۔ جوان اتنا بد دل ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا' اللہ کے فضل سے۔ دیکھ میری یہ ہتھیلی دیکھ۔'' شدن کمار نے اپنا پنجہ شمشو کے سامنے پھیلا دیا۔ ''پیارے ان لکیروں کو غور سے دیکھ مگر تو کیا دیکھے گا۔ تیری آنکھوں میں وہ روشنی کہاں ہے جوان لکیروں کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ دیکھ یہ دل کی لکیر ہے' اور یہ دیکھ یہ ایک جزیرہ ہے۔'' شدن کمار نے ایک نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور شمشو اسے تمسخرانہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''کون سا جزیرہ ہے یہ بھائی۔ یہ جزیرہ ہے' یہ پہاڑ ہوں گے اور یہ جنگل۔ ابے کھسکتا جا رہا ہے بالکل۔ کون سا تیل لگا رہا ہے آج کل سر میں۔ بہت سے تیل خراب ہوتے ہیں اور دماغ خراب کر کے رکھ دیتے ہیں۔'' شمشو نے کہا لیکن جواب میں شدن کمار کا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا پھر اس نے کہا۔

''تو نہیں جانتا اس جزیرے میں کیا پوشیدہ ہے۔ بات میری کہی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ نجومی نے بتائی تھی اور ان بزرگ نجومی نے جس کو جو بتایا وہ پورا ہو کر رہا۔ ابے مجھ سے زیادہ تو میرے اماں ابا اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ بالآخر ایک دن ایک بہت بڑا خزانہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔ بیٹے یہ خزانے کا جزیرہ ہے۔'' شمشو کے منہ سے ہنسی نکل گئی لیکن دوسرے لمحے اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔

''کسی سوچ میں ڈوب گیا شمشو؟''

''شدن کمار تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ آج تم نے خزانے کا تذکرہ کر کے میرے دماغ کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ آؤ میں تمہیں ان دروازوں کے اندر کی سیر کراؤں۔''

''ابے کسی کے گھر میں مت جا گھسیو' مجھے بھی جوتے پڑوائے گا۔''

''کسی کے گھر کی بات نہیں کر رہا' اپنے دماغ کے دروازوں کی بات کر رہا ہوں' کسی سنسان جگہ چلو۔''

''قبرستان چلیں۔'' شدن کمار نے کہا۔ بات مذاق میں کہی گئی تھی لیکن شمشو سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں وہیں چلتے ہیں۔''

''ابے ابے دماغ خراب ہو گیا ہے کیا' کیا قصہ ہے؟''

''چلو چلتے رہو میرے ساتھ' میرا خیال ہے قدرت ہم لوگوں کو راستہ دکھا رہی ہے۔''

''ابے میرے بھائی کدھر ہے خزانہ آخر؟''

''میں تمہیں وہی راز بتانے جا رہا ہوں۔ خزانہ قربت شاہ کی حویلی میں ہے۔''

''کیا؟'' شدن کمار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ہاں۔'' ''اس خزانے کا راز بڑی مشکل سے میرے پاس پہنچا ہے۔ ایک بہت ہی بزرگ شخصیت کے ذریعے۔'' شمشو نے آہستہ آہستہ شدن کمار کو اس بارے میں تفصیلات بتانا شروع کر دیں اور آخر میں یہاں تک بتا دیا کہ اس خزانے کے حصول کے لیے وہ دوبارہ حویلی کی چھت پر پکڑا گیا ہے اور اسی کی وجہ سے اسے کبوتروں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں۔'' شدن کمار بھی کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''اگر یہ اطلاع سچ ہے تو پھر تو واقعی وہ خزانہ ہمارے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہم خزانہ حاصل کریں گے اور آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ وہ کوئی معمولی خزانہ نہیں ہے۔ ایسا کرو شدن بھائی تم بھی ایک دفعہ اس گھر کا جائزہ لے لو اور اس کے بعد ہم دونوں فیصلہ کریں گے کہ کس طرح اس گھر میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔''

''چلو پھر ادھر ہی چلتے ہیں۔''

''مم...... میں۔'' شمشو بوکھلا کر بولا۔

''ہاں' کیوں میرا ساتھ نہیں دو گے؟''

''نہیں شدن بھائی۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں تو دو دفعہ ان کی چھت پر جا چکا ہوں۔''

''ہوں۔ ایک بات بتاؤ شمشو بھیا۔ اس گھر سے ایک لڑکی نکلتی ہے' سفید کپڑوں میں ملبوس۔ یوں چٹکتی مٹکتی خوبصورت سی۔ وہ کون ہے؟''

"اسی نے تو کباڑا کرایا تھا اپنا۔ بھیے وہ اسی گھر میں رہتی ہے اور شرافت حسین کی بیٹی ہے۔"

"ہوں۔ جاتی کہاں ہے؟"

"ابے میرے کو کیا معلوم۔ کوئی میں اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہوں۔"

"جانا پڑے گا۔ جانا پڑے گا کچھ کرنا پڑے گا۔ خیر ٹھیک ہے۔ تم یہ ذمے داری مجھ پر ڈال دو۔ میرے بغیر کام ہونا مشکل ہے اور میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے تم اس سلسلے میں کارروائی کرو۔ یہ راز میں نے تمہیں دے دیا ہے اور اب یہ ہم دونوں کا مشترکہ راز ہے۔"

"فکر مت کرو میرے دوست۔ خزانہ ہماری مٹھی میں ہے۔"

◇◇◇

قدرت نے ایک بار پھر شاہ جہاں بیگم کو ان حالات کے باوجود سہارا دے دیا تھا۔ بیگم صاحبہ بہت نرم دل خاتون تھیں اور اکثر وہ شاہ جہاں بیگم کو مختلف چیزیں دیتی رہتی تھیں جن میں کپڑے بھی شامل ہوتے تھے اور کھانے پینے کی اشیاء بھی۔ دس روپے جو انہوں نے دیئے تھے انہوں نے بھی شاہ جہاں بیگم کو کافی سہارا دیا تھا۔ شاہ جہاں بیگم کافی مطمئن ہوگئی تھیں اور اب انہیں اس بات کی امید تھی کہ ان کے حالات بہتر سے بہتر ہوتے چلے جائیں گے۔ بیگم صاحبہ مالی حیثیت سے کافی مضبوط نظر آتی تھیں۔ ویسے شاہ جہاں بیگم نے اس گھر پر تھوڑا بہت غور بھی کیا تھا۔ ملازم تھے سب کچھ تھا لیکن کوئی مرد کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ ایسا جسے بیگم صاحبہ کا شوہر سمجھا جاسکے لیکن شاہ جہاں بیگم نے کوئی کرید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا۔ یہ سہارا بہت غنیمت تھا اس وقت ان کے لیے اور وہ اسے اپنی کسی معمولی سی لغزش سے کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر ایک شام وہ واپس آئیں تو سلطانہ کی طبیعت خاصی خراب محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ہلکا ہلکا بخار بھی ہوگیا تھا۔ دن میں بھی طبیعت بگڑی رہی

تھی۔ شاہ جہاں بیگم نے اسے دیکھا اور تشویش کا شکار ہوگئیں۔ سلطانہ کے لیے اب بہت سے اقدامات ضروری تھے۔ وہ سوچنے لگیں کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ اور پھر رقیہ بیگم ذہن میں آئیں۔ ان سے مدد لینا اچھا ہوگا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ نلکے سے پانی بھرنے کے بعد وہ رقیہ بیگم کے پاس جائیں گی۔ چنانچہ پانی کے برتن اٹھا کر نلکے پر پہنچ گئیں اور دونوں برتن نل کے نیچے لگا دیئے۔ چند لمحات کے بعد جب سرکاری نلکے سے پانی کے یہ برتن بھر گئے تو انہوں نے ان میں سے ایک برتن اٹھایا اور اسی وقت ایک نوجوان ان کے پاس پہنچ گیا۔

"ارے ارے اماں کیا کر رہی ہو۔ یعنی ڈوب مرنے کا مقام ہے ہمارے لیے۔ ہم موجود ہیں اور تم پانی کے برتن اٹھا رہی ہو۔"

"کہاں رہتے ہو تم؟"

"لو اماں تمہاری نظر اتنی کمزور تو نہیں لگتی۔ ارے تمہارے قدموں ہی میں رہتا ہوں۔ ایک پردے کی آڑ ہے میرے اور تمہارے بیچ۔"

"اچھا میں نے کبھی دیکھا نہیں۔" قمرو نے مٹکے رکھے۔ مسکراتی نگاہوں سے ان تینوں کو دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

"اماں اب کوئی تکلف نہ کرنا۔ میرا اس گھر میں آنا جانا ہوگیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔ شاہ جہاں بیگم دروازے کو تکتی رہ گئی تھیں پھر انہوں نے نور جہاں اور ممتاز سے کہا۔

"کیا یہ پہلے بھی کبھی تم لوگوں سے بات کر چکا ہے؟"

"ہاں اماں ایسے ہی بس کبھی پانی مانگتا ہے اور کبھی کچھ کھانے پینے کی چیزیں دینے کی کوشش کرتا ہے۔"

"ہائے اللہ۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔" شاہ جہاں بیگم نے پریشان لہجے میں کہا۔

شاہ جہاں بیگم اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہیں اور تھوڑی دیر کے بعد رقیہ بیگم کی بیرک پر پہنچ گئیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ رقیہ بیگم اپنی نوکری سے واپس آگئی ہوں گی۔ شاہ جہاں بیگم کی نوکری کا سن کر رقیہ بیگم نے جس طرح خوشی کا اظہار کیا تھا وہ کوئی اپنا ہی کر سکتا تھا۔ وہ بہت مطمئن ہوگئی تھیں اکثر ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی لیکن یہ ملاقات بہت مختصر ہوتی

تھی۔ دونوں ہی بے چاریاں اپنے اپنے گھروں کی ذمہ دار تھیں اور دن بھر کی تھکن سے چور چور ہو جاتی تھیں۔ اس وقت بھی رقیہ بیگم گھر پر موجود تھیں' کھانا پک رہا تھا۔ شاہ جہاں بیگم کو دیکھ کر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور انہیں بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھایا۔ پھر پٹاری سامنے کھسکا کر پان لگانے لگیں۔

''کہو شاہ جہاں کیسی چل رہی ہے تمہاری نوکری۔''

''تم نے آج تک مجھ سے میرے بارے میں کبھی نہیں پوچھا' رقیہ بیگم۔''

''بی بی دل کٹتا ہے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ ہم سب کی کہانی تو ایک جیسی ہے' بس نام اور جگہ کا فرق ہے۔''

''ہاں بہن ٹھیک کہتی ہو۔ اس میں شک بھی کیا ہے۔ مجھ پر ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے' رقیہ بیگم۔ پہلے تو اس کا شبہ ہی تھا لیکن اب وہ شبہ یقین میں بدل گیا ہے۔ اور میں پریشان ہوں کہ الٰہی کیا کروں؟''

''لیکن ہوا کیا' تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''تمہیں میری تینوں بیٹیوں کے بارے میں معلوم ہے۔ اتفاق سے یہ تذکرہ ابھی تک کبھی نہیں ہوا کہ ہم پر کیا گزری۔ میں تو بہت عرصے سے بیوہ ہوں۔ تینوں بچیوں کو نہ جانے کس طرح پرورش کیا اور اس کے بعد سلطانہ کی شادی کر دی۔ شادی کیے ہوئے سال سوا سال بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ قیامت ہم پر ٹوٹ پڑی اور ہم وہاں سے بھاگے جہاں ہم رہتے تھے۔ راستے میں سلطانہ بیگم کا میاں ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گیا اور ہم اپنا یہ پہلا اور آخری سہارا کھو بیٹھے۔ سلطانہ سلطانہ بہت غم زدہ تھی ابھی تو اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں چھوٹی تھی کہ بے چاری کو بیوہ ہونا پڑا نہ جانے کس کس طرح میں نے اس کے دل سے یہ غم دھوئے لیکن مرنے والا اپنی ایک نشانی چھوڑ گیا اور اب میں پریشان ہوں کہ اس بارے میں کیا کروں؟''

''اے ہے خدا رکھے کیا......؟'' رقیہ بیگم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں۔ رقیہ بیگم وقت بھی زیادہ دور نہیں معلوم ہو رہا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا کروں؟''

''لو بہن پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ اللہ سب انتظام کر دیتا ہے۔ میرے علم میں ایک ایسا زچہ خانہ ہے جو یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ ہم کل ہی چل کر نام لکھوا دیں گے۔ کل تم بھی چھٹی کر لو۔ میں بھی کیے لیتی ہوں۔ دونوں جائیں گے اور یہ کام بھی آسان ہو جائے گا۔''

''رقیہ بیگم آپ میرے لیے کس قدر فرشتہ صفت ثابت ہوئی ہیں۔ اس کا میں زبان سے بیان نہیں کر سکتی۔''

''اللہ تمہاری ہر مشکل حل کرے اور تمہارے طفیل ہماری بھی۔'' رقیہ بیگم نے خلوص سے کہا اور اس کے بعد شاہ جہاں بیگم کو ان کے سامنے کچھ اور جھوٹ بولنے پڑے۔ رقیہ بیگم جیسی نیک خاتون کے سامنے یہ جھوٹ بولتے ہوئے انہیں دکھ ہو رہا تھا لیکن زمانہ شناس تھیں جانتی تھیں کہ زمانہ سچائیاں قبول نہیں کرے گا اس لیے مجبوراً یہ جھوٹ بولنے پڑے تھے۔ بہر حال دوسرے روز رقیہ بیگم انہیں اور سلطانہ کو ساتھ لے کر چل پڑیں۔ پیدل ہی راستہ طے کیا گیا تھا۔ بھلا اور کیا ذریعہ ہو سکتا تھا۔ وہ زچہ خانے کی جانب جا رہی تھیں۔ ادھر وہ بیرک سے باہر نکلیں اور ادھر قمرو نے آج ایک نیا تماشا دیکھا۔ سلطانہ بھی ان دونوں کے ساتھ گئی تھی اور اب گھر میں یقینی طور پر ممتاز اور نور جہاں اکیلی ہوں گی۔ قمرو چند لمحات کچھ سوچتا رہا پھر اس کی نظر دور ایک شخص پر پڑی جو کوئلوں پر بھٹے بھون بھون کر بیچ رہا تھا۔ قمرو نے جیب میں پیسے دیکھے۔ بھٹے والے کے پاس پہنچا اور پھر چند عمدہ قسم کے بھٹے بھنوا لیے اور انہیں پتوں میں لپیٹے ہوئے اس بیرک پر پہنچ گیا جہاں نور جہاں اور ممتاز موجود تھیں۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے آواز لگائی۔

''ہم اندر آ رہے ہیں بھئی۔ کون کون ہے۔'' ممتاز اور نور جہاں چونک پڑی تھیں۔ قمرو کی آواز انہوں نے پہچان لی تھی۔ نور جہاں نے خوف زدہ نگاہوں سے ممتاز کو دیکھا اور ممتاز کہنے لگی۔

''کیا خیال ہے باجی۔ آج اس کی حجامت بنا دی جائے؟''

''ارے نہیں بھئی۔ خواہ مخواہ کا ہنگامہ مول لینے سے کیا فائدہ۔ اماں اور سلطانہ بھی

گھر پر نہیں ہیں۔''

''بھئی جواب تو دو ہم آ رہے ہیں اندر۔'' قمرو نے اندر قدم رکھ دیا۔ نور جہاں اور ممتاز اسے دیکھنے لگیں۔ نور جہاں کی آنکھوں میں غصے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

''تم اندر کیوں چلے آئے؟''

''لو۔ کیا پہلی بار آئے ہیں۔ اماں نے ہمیں بیٹا بنایا ہے' کیا سمجھیں۔''

''اوہو۔ اچھا اچھا' اس لحاظ سے تم ہمارے بھائی ہوئے۔'' ممتاز چہک کر بولی اور قمرو چونک کر سیدھا ہو گیا پھر بے حیائی سے مسکراتا ہوا بولا۔

''ہاں۔ خالہ زاد بھائی۔''

''اماں کو تو تم اماں کہتے ہو' خالہ تو نہیں کہتے۔''

''تو کیا ہوا اماں ہیں تو نہیں۔ خالہ بی ہوئیں۔ چلو چھوڑو اس اماں اور خالہ کے چکر کو' لو بھٹے کھاؤ موسم کا میوا ہے۔''

''مجھے تو تم بھی شکل سے بھٹے ہی لگتے ہو۔ اگر یہاں سے ایک منٹ کے اندر نہیں نکل گئے تو پھر تمہاری شکل چھلے ہوئے بھٹے جیسی بنا دوں گی۔'' نور جہاں نے قریب رکھا ہوا چمٹا اٹھاتے ہوئے کہا اور قمرو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''دیکھو بی بی۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر ممکن نہیں ہے۔ ارے حد سے ہی آگے بڑھ رہی ہو۔ ہمیں بھی ہاتھ دکھانے ہی پڑیں گے لیکن اس وقت معاف کیے دیتے ہیں۔ اماں گھر پر نہیں ہے۔ پہلے اس سے بات کریں گے پھر تم سے نپٹ لیں گے۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور ممتاز قہقہے لگانے لگی۔

شاہ جہاں بیگم کی واپسی کافی دیر میں ہوئی تھی۔ سلطانہ کی طبیعت واقعی کچھ نڈھال سی نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیاں لکھ کر دے دی تھیں جو ابھی بازار سے منگوانی تھیں۔ جب رقیہ بیگم چلی گئیں تو شاہ جہاں بیگم نے کہا۔

''تم لوگ ذرا آرام کرو۔ میں جا کر یہ دوائیں لے آتی ہوں۔ آج ہی سے استعمال شروع ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''ارے رہنے دو اماں۔ کل چلی جانا۔'' نور جہاں نے کہا اور سلطانہ کہنے لگی۔

''ہاں امی' اس وقت ضروری نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں اب کچھ کھاؤں گی' پیوں گی تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

تین چار دن تک قمرو کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اس کی شکل بھی اس دوران نظر نہیں آئی تھی لیکن پھر ایک رات اس نے ایک اور بدتمیزی کی۔ بیرکوں میں فاصلے ہی کتنے زیادہ تھے تھوڑی سی جگہ سب کے پاس تھی۔ بستر کے طور پر زمین پر چادریں بچھالی جاتی تھیں اور سب ایک دوسرے میں گھس کر سو جایا کرتے تھے۔ اس رات بھی وہ سب کی سب اس طرح سو رہی تھیں کہ ممتاز کروٹ بدل کر ٹاٹ کے پردے کے بالکل نزدیک پہنچ گئی۔ لیکن دفعتاً ہی وہ اچھل پڑی۔ پردے کے نیچے سے ایک ہاتھ اس تک پہنچا ہوا تھا اور غالباً اسی ہاتھ کی تحریک نے ممتاز کی آنکھ کھول دی تھی۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے دہشت بھری چیخ نکل گئی اور ہاتھ غڑاپ سے پردے کے دوسری جانب چلا گیا۔ ممتاز اچھل کر شاہ جہاں بیگم پر آ رہی تھی اور شاہ جہاں بیگم بھی دہشت سے چیخ پڑی تھیں۔

''اماں۔ پردے کے نیچے سے۔ پردے کے نیچے سے قمرو کا ہاتھ.....'' ممتاز نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

''میں اماں۔ میں سوتے میں کروٹ بدل کر پردے کے نزدیک پہنچ گئی تھی شاید اور' اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔''

''خدا اسے غارت کرے۔ خدا اسے غارت کرے۔ چین نہیں لینے دے گا ہمیں۔ ٹھیک ہے اگر یہ بات ہے تو کل صبح کو دیکھ لوں گی۔ تو ادھر آ کر لیٹ جا۔ دیکھ لوں گی اسے۔ رات کا وقت ہے شور مچاؤں گی تو ادھر اُدھر کے لوگ جاگ جائیں گے لیکن قمرو تو سن لے' کان کھول کر سن لے کل تو جیتا رہے گا یا ہم۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی تجھے۔ زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ کمینے کتے' بس رات کا وقت ہے اس لیے خاموش ہوئی جاتی ہوں لیکن کل صبح تیرا فیصلہ نہ کیا تو شاہ جہاں بیگم نام نہیں ہے۔

رات کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ بھلا اس کے بعد کون سو سکتا تھا۔ دوسری طرف مکمل

خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قمرو کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ صبح کو شاہ جہاں بیگم غصے میں بھری ہوئی باہر نکلیں اور قمرو کی رہائش گاہ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

"قمرو باہر نکل۔ کتے کمینے' باہر نکل۔" انہوں نے چیخ کر کہا لیکن اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ شاہ جہاں بیگم غصے سے بھری ہوئی اندر پہنچ گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ قمرو کی بیرک خالی ہے اور وہ موجود نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئیں کہ قمرو فرار ہو گیا۔

◇◇◇

شدن کمار اور شمشو کی گاڑھی چھن رہی تھی۔ دونوں ایک ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ ساتھ اٹھنا بیٹھنا قربت نگر کے آخری سرے پر ایک ہوٹل بھی کھل گیا تھا جو غالباً کسی ایرانی نے کھولا تھا اور اب عموماً یہ ہوٹل ان دونوں کی نشست گاہ ہوتا تھا اور یہاں بیٹھ کر مستقبل کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ گھریلو معاملات تو کسی قدر بہتر ہو گئے تھے شمشو کے لیکن خزانہ اس کے ذہن میں اب بھی کلبلاتا رہتا تھا۔ جس سے نصرت بیگ اور بیگم نصرت بیگ شاید مایوس ہو گئے تھے کیونکہ اب بیگم نصرت بیگ کا قربت نگر میں یعنی شرافت حسین کے گھر میں آنا جانا تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی دونوں دوست ایک گوشے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

"مگر شدن بھیا' بڑا ٹائم لگا رہے ہو تم۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کام جس قدر جلد آگے بڑھے اچھا ہے۔" شمشو نے کہا اور شدن عرف دلیپ کمار پیشانی کو ہلکا سا جھٹکا دے کر تمسخرانہ نگاہوں سے شمشو کو دیکھنے لگا' پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

'راج کپور ذرا عقل سے کام لے۔ میرے یار ایسے کام اتنی جلدی میں تو نہیں ہوتے۔ میں ذرا جائزہ لے رہا ہوں حالات کا اور تجھے بتا چکا ہوں کہ لونڈیا کے گھر سے لے کر کالج تک کا راستہ دیکھ چکا ہوں مگر ابھی میں نے اس کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ایسے کام جلدی میں نہیں ہوتے میرے یار۔ ذرا سچویشن دیکھنی پڑتی ہے۔ ابے تو نے کسی فلم کی شوٹنگ دیکھی ہے آج تک؟"

"شوٹنگ......؟ کبھی نہیں بھیا۔ میرے کو ایسا چانس آج تک نہیں ملا۔"

"خیر یہ چانس بھی شدن کمار ہی دلائیں گے تجھ کو۔"

"ہاں...... ٹھیک ہے۔"

"بس یار اسی اسٹائل پر اپنا عشق بھی چلے گا۔ مگر اس کے لیے تھوڑی محنت کرنا پڑے گی۔"

"ہاں۔ ہاں شدن بھائی محنت کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ تیار ہوں۔ جیسے گدھے کے ساتھ اس کی پخ ہوتی ہے۔"

"ابے او پخ۔ منہ سیدھا نہیں ہے تو زبان تو سیدھی استعمال کر لیا کر یار۔ میں گدھا لگتا ہوں تجھے؟"

"نن......... نہیں شدن بھائی۔ وہ تو میں ایک مثال دے رہا تھا۔"

"مثال کا اٹھا۔ تو سن میں نے اس کا پیچھا کر کے اس کا کالج دیکھ لیا ہے۔ سارے ٹائم نوٹ کر لیے ہیں۔ بڑی محنت کر رہا ہوں ان دنوں۔ وہ صبح ساڑھے سات بجے گھر سے نکلتی ہے۔ کتابیں سینے سے لگی ہوتی ہیں اور اللہ نے چاہا تو ایک دن ان کتابوں میں ہماری تصویر بھی رکھی ہوگی۔ یہ ساری سچویشن ہم نے اچھی طرح ناپ لی ہے اور اب چائے پینے کے بعد یہاں سے اٹھیں گے مگر اس سے پہلے تیرے سپرد ایک کام کرنا ہے۔"

"میں حاضر ہوں شدن بھائی۔"

"جب شوٹنگ ہوتی ہے ناں تو فلم ڈائریکٹر ایک لمبا سا فیتا لے کر ایک ایک انچ زمین ناپتا ہے اور اسے نوٹ کر لیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کہاں سے کام شروع ہوگا' کہاں سے کیمرہ انٹر ہوگا اور کہاں سے کوئی اور کردار آئے گا۔ میں آج یہ ساری سچویشن کاغذ پر لے آتا ہوں۔ سمجھتا ہے۔ اسے کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں شدن بھائی؟"

"پیپر ورک...... پیپر ورک۔ تو آج پیپر ورک کر لیتے ہیں اس کے بعد دوسرے کام کریں گے۔ ایک کام تیری ذمہ داری ہوگی۔"

"وہ کیا شدن بھائی؟"

"چار لفنگے پکڑنے ہیں جو ہم سے فائٹ کریں گے۔"

"لفنگے؟"

"ابے ہاں۔ تین چار یار دوست پکڑ بیٹھو جو اس محلے کے نہ ہوں تو اچھا ہے اور اگر ہوں بھی تو ذرا دور کے ہوں وہ چاروں۔ مگر رک جا۔ پہلے تجھے پوری سچویشن تو بتائی نہیں۔ یوں سمجھ۔" شدن بھائی نے کاغذ کا پرزہ جیب سے نکال کر میز پر رکھا اور پھر ایک پینسل نکال کر اس پر جھک گئے۔

"ابے چائے کے پیسے دے۔ یہ ساری باتیں تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ یہ فلمی باتیں ہیں۔" شدن کمار نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا اور شمشو نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکال لیا جو تازہ تازہ بیگم نصرت بیگ کی پٹاری سے غائب کیا گیا تھا۔

چائے کا بل ادا کرنے کے بعد دونوں وہاں سے چل پڑے اور پھر قربت نگر کے مشرقی حصے میں پہنچنے کے بعد وہ اس علاقے میں آ گئے یہاں یہ ساری "شوٹنگ" کرنی تھی۔

جن لڑکوں کا انتخاب شمشو نے کیا تھا ان سے اس کی شناسائی کبوتر بازی کے سلسلے ہی میں ہوئی تھی۔ وہ بھی بس لفنگے قسم ہی کے لڑکے تھے لیکن ان کی تعداد تین تھی۔ چوتھے کا بندوبست بھی کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائے گا۔ چنانچہ شمشو ایک لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد قربت نگر کے قریب ایک اور چھوٹی سی آبادی میں پہنچ گیا۔ یہاں بھی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ان کی ملاقات ہو جاتی تھی اور اس وقت وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ شمشو کی باچھیں کھل گئیں اور وہ ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔ سلام دعا ہوئی اور پھر شمشو نے اپنا دلی مقصد ان لوگوں کو بتایا۔

"کریم بھائی تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ قسم اللہ کی اگر یہ کام ہو گیا تو یوں سمجھو زندگی بن جائے گی۔"

"کیا کام ہے شمشو بھائی؟"

"یار بس ایک موقع فٹ کرنا ہے۔ تھوڑی سی فائٹنگ اور اس کے بعد فوبارہ۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں شمشو بھائی۔ کس سے فائٹنگ کرنے جا رہے ہو؟" کریم نے پوچھا اور شمشو اسے تمام تفصیل بتانے لگا۔ بس اس تفصیل میں اس نے خزانے کا ذکر ہٹا دیا تھا

اور اپنے دوست کے عشق کا تذکرہ کر دیا تھا۔

آج کی رات شمشو کے لیے ذرا اہمیت رکھتی تھی کیونکہ اسے کم از کم پانچ روپے درکار تھے اور یہ روپے اسے اماں کی پٹاری میں یا کپڑوں کی الماری میں نہیں مل سکتے تھے۔ ہاں اس بات کے امکانات تھے کہ ابا قمیص اتار کر سوئیں تو شاید کوئی کام بن جائے۔ لیکن ابا کی جیب تک ہاتھ پہنچانے کی اسے آج تک جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اب چونکہ خزانے کا معاملہ تھا اس لیے تھوڑے سے خرچ سے بہت بڑا کام ہو سکتا ہے تو خطرہ مول لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ رات کو تقریباً بارہ ایک بجے وہ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ نصرت بیگ سو گئے ہیں اپنی جگہ سے اٹھا اور نصرت بیگ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ پانچ روپے اس نے جیب سے نکال کر اپنی تحویل میں لیے اور اس کے بعد اسے رات کو پرسکون نیند آئی تھی۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے گھر سے نکل جانا تھا ورنہ ظاہر ہے ابا جاتے ہوئے جیب ٹٹولیں گے اور اس کے بعد شمشاد کی تلاش شروع ہو جائے گی۔ اب چونکہ آج ہی کا دن کام کا بھی ہے۔ چنانچہ بدشگونی نہیں ہونی چاہیے ورنہ نوٹ چھپایا بھی جا سکتا تھا اور تھوڑی بہت مار کھائی جا سکتی تھی۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ لیکن آج کا دن چونکہ مصروف تھا اس لیے ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل جانا پڑا اور اس کے بعد وہ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ گھر میں کیا ہوا یہ تو اللہ جانے جو ہو گا وہ بھی بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے ایک کام مکمل ہونا چاہیے۔

ادھر یہ سلسلہ جاری تھا اور ادھر شدن کمار اپنی پوری آن بان اور شان کے ساتھ اس راستے پر چل پڑے تھے۔ وقت کا اندازہ کر لیا تھا انہوں نے اور اس کے علاوہ ثمر کو بھی صبح جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہر پوائنٹ محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ اس بات کو بھی مدنگاہ رکھا گیا تھا کہ کہیں آج ثمر کالج نہ گئی ہو۔ بہر حال وقت مقررہ سے بہت پہلے وہ "لوکیشن" پر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے چاروں طرف کا جائزہ لے لیا تھا۔ یہ فیصلے بھی کر لیے تھے کہ انہوں نے آج کی فائٹ کس طرح کرنی ہے اور تنہا ہی اس کی ریہرسل بھی کر ڈالی تھی۔ وقت قریب آتا گیا۔ شدن کمار نے شمشو سے کہہ دیا تھا کہ اسے بیک گراؤنڈ میں رہنا ہو گا۔ اس کا سامنے آنا مناسب نہیں ہے۔ بس وہ ان چاروں کو بھیج دے۔ وہ سمجھ لیں گے کہ کام کے آدمی آ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد

شدن کمار کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ ثمر آ رہی تھی۔ وہی کالج کا سفید یونیفارم، سینے سے لگی کتابیں، چلنے کا مخصوص انداز، قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ گویا قدرت حالات کو شدن کمار کی مواقفت میں کر رہی ہے۔ شدن کمار کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں جدھر سے شمشو کے آدمیوں کو آنا تھا اور یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں کہ وہ چاروں آ رہے تھے۔ اچھے خاصے ہٹے کٹے آدمی تھے اور لباس بھی بہت عمدہ پہنے ہوئے تھے۔ چاروں کا رخ اسی سڑک کی جانب تھا اور انداز ایسا ہی تھا کہ جب ثمر اس جگہ پہنچے گی تو وہ بھی یہاں تک آ جائیں گے اور یہی ہوا۔ شدن کمار نے اپنے آپ کو ایک جگہ محفوظ کر لیا تھا۔ جب ثمر وہاں پہنچی تو وہ چاروں سڑک سے اوپر آ گئے اور اس کے فوراً بعد ہی شدن کمار نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور ان چاروں کے سامنے آ گئے۔

''ہوں! جانتے ہو یہ کس کا علاقہ ہے؟ یہاں تمہاری جرأت کیسے ہوئی اس لڑکی کو چھیڑنے کی؟''

چاروں ٹھٹک کر شدن کمار کو دیکھنے لگے تھے۔ اچھی خاصی شکل و صورت کے جوان آدمی تھے۔ شدن کمار نے حقارت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ تب ان میں سے ایک بولا۔

''کیا ہوا بھائی، خیریت سے تو ہو؟''

''بھائی کے بچے تو شاید شدن کمار سے واقف نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو سنبھال۔'' شدن کمار نے ایک لات گھوم کر ان میں سے ایک کے پیٹ میں ماری اور وہ شخص پیٹ پکڑ کر اوندھا ہو گیا لیکن فوراً ہی عقب سے دوسرے آدمی نے شدن کمار کی گردن پکڑ لی۔

''اے...... اے کیا غنڈہ گردی ہے یہ؟ کیا تو لٹیرا ہے؟ اگر ہے تو آج تجھے بھی چھٹی کا مزہ یاد آ جائے گا۔'' اس نے پیچھے سے شدن کمار کی کمر پر لات رسید کی اور شدن کمار پوری قوت سے آگے والے آدمی سے ٹکرائے لیکن وہ بھی سنبھلا ہوا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے پیٹ پر شدن کمار کی لات پڑی تھی۔ وہ ایسے ہی جھلا گیا تھا اس نے اپنا گھونسا شدن کمار کے پیٹ پر مارا اور شدن کمار کے حلق سے ایک بکرے جیسی آواز نکل گئی۔ لیکن اس کے بعد وہ چاروں ہی ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ثمر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی اور بھاگتی ہوئی گھر

جا رہی تھی۔ ادھر وہ چاروں شدن کمار کو سنبھالے ہوئے تھے اور شدن کمار کی دلیپ کمار والی واسکٹ پھٹ گئی تھی۔ سر کے بال بگڑ چکے تھے۔ دلیپ کمار کے بالوں کا جو گچھا ان کی پیشانی پر ہمیشہ لہراتا رہتا تھا وہ نچ کر کھڑا ہو گیا تھا اور نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس وقت اس سے خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ لوگ انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ شدن کمار کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

''ابے بھھ...... بھائی کیا کھھ...... کھانا نہیں کھایا۔ ابے مم...... میرا کیا قصور ہے۔ شمشو...... ابے او شمشو، بیک گراؤنڈ سے نکل آ۔ یہ...... یہ کچھ گڑبڑ ہو گئی۔''

لیکن اس کی آوازیں کوئی نہیں سن رہا تھا۔ ان لوگوں نے اچھی خاصی مرمت کر ڈالی شدن کمار کی اور جب وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہ رہے تو انہوں نے ایک آخری ٹھوکر ماری اور اس کے بعد غرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

''اصولاً تو تجھے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ چلو اتنا سبق کافی ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا اور چاروں دوسری سمت اتر گئے۔ شدن کمار کی حالت بری ہو رہی تھی۔ ان کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ بائیں آنکھ متورم ہو گئی تھی۔ بال جگہ جگہ سے نچ گئے تھے۔ اسی وقت ذیلی سڑک سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں اور آدمی اوپر آ گئے۔ یہ کریم بھائی اور ان کے تین ساتھی تھے۔ انہوں نے یہاں کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر ان کی نظریں شدن کمار پر پڑ گئیں۔

''ابے یہ کون ہے؟ یہ کیا ہوا؟'' ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا اور شدن کمار کو اٹھایا۔

''مت مارو بھائی پہلے ہی بہت پٹ چکا ہوں۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔'' شدن کمار ہاتھ جوڑ کر گھگھیائے۔

''ابے شمشو بھائی...... اے شمشو بھائی۔ یہ کیا ہو گیا؟'' کریم بھائی نے چیخ کر دور کھڑے شمشاد کو آواز دی جسے بیک گراؤنڈ میں رہنے کے لیے کہا گیا تھا اور جو بیک گراؤنڈ میں

تھا۔ان کی آوازیں دینے پر شمشاد اپنی جگہ سے ہٹا اور پھر وہیں سے بولا۔

''کک......کیا ہو گیا......کیا بات ہے؟''

''ابے ادھر تو آؤ۔ ذرا دیکھو تو سہی کیا یہی ہے تمہارا دوست؟'' کریم بھائی نے کہا اور شمشاد دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ پھر شدن کمار کی حالت دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

◇◇◇

قمرو کئی دن تک نظر نہیں آیا۔شاہ جہاں بیگم کا دماغ غصے سے جلتا رہا۔ اگر قمرو ہاتھ آجاتا تو کچھ کر کے ہی دکھا دیتیں لیکن وہ وہاں سے بھاگ گیا تھا اور اس کی کوٹھری خالی پڑی ہوئی تھی۔ کئی بار شاہ جہاں بیگم وہاں جا کر دیکھ چکی تھیں۔لیکن کسی سے کچھ کہا نہیں تھا انہوں نے اپنی عزت اپنے ہی ہاتھ رکھنا ہوتی ہے۔ بات زبان سے نکلی تو پرائی ہوئی۔ یہاں اس ماحول میں جتنا وقت بھی عزت سے گزر جائے بہتر ہے۔

''شاہ جہاں بیگم......شاہ جہاں بیگم۔''

شاہ جہاں بیگم کا دل دھک سے ہو گیا۔ اگر ان کی سماعت دھوکہ نہیں دے رہی تو یہ آواز نوشہ میاں کے علاوہ کسی اور کی نہیں تھی۔

''آ رہی ہوں ......آ رہی ہوں۔'' شاجہاں بیگم کی پھنسی پھنسی آواز ابھری اور بمشکل تمام وہ سہارا لے کر کھڑی ہوئیں پھر دروازے پر پہنچ گئیں۔خیال غلط نہیں تھا۔ نوشہ میاں ہی تھا۔کم بخت اسی انداز میں کھڑا مسکراتی نگاہوں سے شاہ جہاں بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ یہ موا کالیا یہاں کیسے آمرا؟ اسے کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟ شاہ جہاں بیگم دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ نوشہ میاں نے کہا۔

''کمال ہو گیا ہے' قسم ولیوں کی۔ انسان کی بداخلاقی اب انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ ہم یہاں کھڑے ہیں اور آپ ہمیں اندر بھی نہیں بلا رہیں۔''

''کیا کام ہے نوشہ میاں؟''

''یہیں بتا دیں؟ باہر بتائیں گے تو تمام لوگ سنیں گے۔ یہاں کی آواز تو باآسانی ایک دوسرے کو ملتی ہیں۔ اندر بلا لو تو ذرا عزت سے بیٹھ کر بات کریں گے ہم بھی۔ احساس ہوگا کہ کوئی عزت دار دوسرے عزت دار کے گھر آیا ہے۔'' شاہ جہاں بیگم نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر پیچھے ہٹتے ہوئے بولیں۔

''آؤ اندر آ جاؤ۔'' نوشہ میاں اندر داخل ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اس چھوٹی سی مدقوق اور گندی کھولی کو دیکھا اور آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتا ہوا بولا۔

''تف ہے تم پر شاہ جہاں بیگم' کیا کر رہی ہو؟ کیا کرنا چاہتی ہو؟ یہ رہنے کی جگہ ہے؟ ارے لڑکیو کیا ان کے ساتھ تم بھی پاگل ہو گئیں؟ تم نہیں سمجھاتیں انہیں۔ انہیں تو کبھی عقل نہیں آئی اور نہ کبھی آئے گی۔''

''بیٹھ جاؤ نوشہ میاں۔ جو بکواس کرنا چاہتے ہو مجھ سے کرو۔ لڑکیوں سے مخاطب ہوئے تو قسم اللہ پاک کی سر کھول دوں گی تمہارا۔''

''دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا شاہ جہاں بیگم۔ تم کتنے راستے چھپاؤ گی ہم سے۔ بس نظر آ گئیں تم اور لگ گئے ہم تمہارے پیچھے۔ مگر سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے دوسرا ٹھکانہ بنایا ہوگا۔ وہاں کوٹھی پہنچے تھے۔ بیگم صاحب سے معلوم کیا تو وہ کہنے لگیں کہ وہ نہیں جانتیں کہ تم کہاں گئیں؟''

''بیگم صاحب کو ہماری حقیقت تو بتا دی ہوگی تم نے؟''

''نوشاہ جہاں بیگم۔ اب اتنا بے مروت سمجھتی ہو ہمیں۔ کوٹھی کیوں چھوڑی آخر؟''

''تمہاری وجہ سے۔''

''ایں!''

''ہاں۔ تمہارے منحوس قدم وہاں پہنچے تو ہماری سواری وہاں سے اٹھ گئی۔''

''خیر ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ تم نے خود ہی ڈر کر چھوڑ دی ہو تو اور بات ہے مگر میں کہتا ہوں شاہ جہاں بیگم کب تک ڈرتی رہوگی؟ ہمت کرو......میدان میں آؤ پھر دیکھو نوشہ کی مدد سے میدان تمہارا نہ ہو تو قسم ولیوں کی مونچھ منڈوا دیں گے۔''

''اے تم غارت ہو جاؤ۔ اپنی مونچھوں سمیت۔ میں کہتی ہوں آخر میری ہی جان سے کیوں لگ گئے ہو' جو کام باپ دادا کرتے آئے ہیں وہ تمہیں کہیں بھی مل جائے گا۔ میں اب ادھر جانا نہیں چاہتی تو کیوں میری جان کے پیچھے پڑے ہو؟''

''تمہاری ہمدردی میں شاہ جہاں بیگم۔ تمہاری محبت میں' کیا کرو گی ان لونڈیوں کا' اندھی ہو کیا؟ جانتی نہیں ہو دنیا کے بارے میں؟ کیا کھلاؤ گی انہیں' کیا پہناؤ گی؟ شریف زادیاں بنانے میں مصروف ہو۔ کیسے بنیں گی یہ شریف زادیاں؟ شادیاں رچاؤ گی ان کی؟ کون کرے گا ان سے شادی؟ کوئی مل کا مزدور' کوئی دفتر کا چپراسی۔ اس سے برا کوئی رشتہ مل سکتا ہے ان کے لیے؟ چار چوٹ کی مار مارے گا سسریوں کو نبھا سکیں گی یہ اس کے ساتھ؟ نہ تن بھر کپڑا ملے گا نہ پیٹ بھر روٹی۔ یہی زندگی دینا چاہتی ہو تم ان کو؟ کیسی ماں ہو تم آخر؟''

''اپنی منحوس شکل لے کر اتنی گہرائی میں چلے جاؤ کہ کبھی ہمیں تمہاری شکل نظر نہ آئے۔ ہاں اگر اس وطن کو کچھ دینے کے لیے ہے تمہارے پاس تو اسے اپنی نیکیاں دے دو۔ پیٹ بھرنے کو تو اور بھی بہت سے رستے ہیں نوشہ میاں۔ خدا کا واسطہ تم بھی کوئی اچھا راستہ اپناؤ۔''

''تم تو جیسے ولی ہی بن گئی ہو۔ قسم ولیوں کی۔ خیر تمہاری مرضی کوئی کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن شاہ جہاں بیگم تمہارا ٹھکانہ وہی ہے' آج نہیں تو کل۔ ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ صدیوں کا یہ ساتھ صدیاں ہی لگتی ہیں اتنا عرصہ گزرا ہے باقی رہے تو اچھا ہے۔ اب تم نوشہ کے ساتھ نہ سہی اور کے ساتھ۔ لیکن لکھ لو اس بات کو کہ ٹھکانہ وہیں ہو گا تمہارا۔'' نوشہ نے کہا اور بیرک سے باہر نکل آیا۔

شاہ جہاں بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں اور تینوں لڑکیاں عجیب سی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ نوشہ باہر نکل کر چند ہی قدم چلا تھا کہ بیرک کے عقب سے ایک شخص نکل کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ یہ قمرو تھا پیچھے سے اس نے نوشہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور نوشہ چونک گیا۔ اس نے قمرو کی شکل دیکھی۔ اپنی ہی برادری کا کوئی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چہرے مہرے سے بھی اندازا ہو رہا تھا۔

''قمرو ہے ہمارا نام...... نام تو قمرالدین ہے مگر کیا کریں یہ وقت اچھے اچھوں کے حلیے بگاڑ دیتا ہے۔ چنانچہ قمرو رہ گئے ہیں۔''

''کیا بات ہے قمرو؟''

''کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے۔ آؤ تمہیں چائے پلائیں۔ یہاں تو تمہیں چائے ملی نہیں۔''

''ایں! تمہیں کیسے معلوم؟'' نوشہ میاں نے کہا اور قمرو ہنس پڑا۔

میاں دس دن سے بھاگے ہوئے ہیں اس کھولی سے' شاہ جہاں بیگم کی وجہ سے۔ لیکن صرف دن کی روشنی میں پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں۔ شاہ جہاں بیگم کو پتا بھی نہیں چلتا کہ ہمارا کام وہیں سے چل رہا ہے۔ اب ظاہر ہے اپنی کھولی چھوڑ تو نہیں سکتے۔''

''کیوں چل گئی تھی؟'' نوشہ میاں نے سوال کیا اور چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق میں انڈیل لیا۔

''بس جی وہی پارسائی کا چکر۔ بات اصل میں یہ ہے نوشہ میاں کہ ہمارا بھی دل آ گیا تھا اور ہم نے ذرا ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ شاہ جہاں تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ بڑی ہی شریف زادی ہیں۔ کسی نواب گھرانے کی' انداز ایسے ہی دکھا رہی ہیں۔''

''طوائف ہیں میاں طوائف۔ خاندانی طوائف اب یہاں آ کر شریف زادی بننے کے چکر میں پاگل ہو گئی ہے۔ یہ دونوں بیٹیاں ناچتی تھیں کوٹھے پر اور خوب کماتے تھے۔ اچھے عیش تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت اچھا وقت دیکھے ہوئے ہیں۔ بس پاکستان آ گئیں اور اب بڑی مشکل سے مجھے ملی ہیں تو نخرے دکھا رہی ہیں۔ مجھے ایک طرح سے دھکے دے کر نکال دیا۔ بے عزتی خراب کر دی میری۔ مگر میرا نام بھی نوشہ ہے۔ ایک ایک لفظ کا بدلہ نہ لے لوں تو زندہ رہنے پر لعنت ہے۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''میاں سیدھی سیدھی سی بات ہے۔ یہ سارے بے چارے خانماں برباد ہیں جگہ

جگہ سے آئے ہیں لیکن بہرطور اشراف ہیں۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اپنے درمیان اس قسم کے لوگوں کو بھی برداشت کرلیں۔ آخر بیرکوں میں بھی عزت کی زندگی گزاری جاتی ہے۔ نوجوانوں کا اخلاق خراب کر کے دولت کمانا کیا یہاں ممکن ہو سکے گا؟''

''قسم ولیوں کی اس دماغ کی تو بڑی قدر تھی کسی زمانے میں۔ بس وقت بگڑ گیا ہے مگر کوئی بات نہیں، سنبھل جائے گا۔ تو پھر بتاؤ کیا کام شروع کر رہے ہو اور کب شروع کر رہے ہو؟''

''ایک آدھ دن نکال لیتے ہیں۔ ذرا تھوڑی سی پبلسٹی کر ڈالتے ہیں اور اس کے بعد ہنگامہ کر دیں گے۔ بڑی بی پر یہی الزام لگائیں گے کہ وہ یہاں نوجوانوں کو وہ دیتی ہیں۔ وہ جو دعوت ہوتی ہے نا' کا ہے کی ہوتی ہے۔''

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے...... بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے عمدہ اور کوئی ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔'' نوشہ میاں نے پرجوش انداز میں کہا اور پھر آنکھ دبا کر بولے۔

''بات یہیں ختم نہیں ہو جائے گی۔ پیارے نوشہ میاں کے دوست رہو گے تو عیش ہی کرتے رہو گے۔''

''لو وہ تو ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔'' نوشہ میاں نے اجازت چاہی اور قمرو نے بڑے تپاک سے ان سے مصافحہ کر کے انہیں بڑی عقیدت سے رخصت کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔

◇◇◇

شمشاد بیگ عرف شمشو کی یہ اسکیم بھی فی الحال ناکام ہو گئی تھی۔ شدن کمار بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ شمشو اسے سہارا دے کر ان کے ٹھیے تک لایا تھا اور وہ راستے بھر کراہتا اور شمشو کو گالیاں دیتا ہوا آیا تھا۔

''اس میں میرا کیا قصور ہے استاد۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ سالے اصلی ولن وہاں پہنچ جائیں گے۔''

''ولن کی اولاد یہ تو تجھے ٹھیک ہو کر بتاؤں گا کہ تجھے کیا کیا معلوم تھا۔ اللہ جی سارے کپڑے بھی پھٹ گئے۔'' شدن کمار نے کراہتے ہوئے کہا۔

''سارا قصور سالے کریم بھائی کا ہے ٹھونسنے بیٹھے تو ایسے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟''

''دفع ہو جا یہاں سے قسم ایمان کی کھوپڑی گھوم گئی تو خون ہو جائے گا تیرا میرے ہاتھوں سے۔ ہائے ریڑھ کی ہڈی۔'' لیکن سارا قصور شمشو کا بھی تو نہیں تھا' شدن کمار اس اسکیم میں برابر کا شریک تھا۔ اگر کامیاب ہو جاتی تو ثمر سے عشق بھی چلتا اور پھر دولت الگ ہاتھ آتی۔ ارے ہاں خطرہ تو اصل میں' میں نے مول لیا ہے۔ وہ ظالم جادوگر عرف ابا جان اب تک پانچ روپے کی گمشدگی سے واقف ہو گئے ہوں گے اور اس کے بعد ایسی ہی کوئی اسکیم بنا رہے ہوں گے جس کے تحت ہڈیاں چٹخانے میں آسانی ہو۔ شمشو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا' چنانچہ جان' ہتھیلی پر رکھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد گھر میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اماں کی صورت دیکھی' جائزہ لینا چاہتا تھا کہ کام کہاں تک ہوا ہے لیکن اماں کے چہرے پر ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی جو باعث تشویش ہوتی۔ نرم اور ملائم لہجے میں اس سے بات کی۔

''دیکھ بیٹا' تیرے ابا تو ہمیشہ کے کھسکے ہوئے ہیں اور خدا غارت کرے ان لوگوں کو جو ہمیں اس خزانے وغیرہ کے چکر میں پھنسا گئے۔ بیٹا' خزانے تو انسان کی محنت میں پوشیدہ ہوتے ہیں' محنت کر اور خزانے حاصل کر لے۔''

''لے اماں' اس سے زیادہ کیا محنت کر سکتا ہوں۔ دو دفعہ پائپ کے ذریعے ان لوگوں کی چھت پر جا چکا ہوں' ایک دفعہ تو سالوں نے پٹائی بھی کر دی تھی اور اس کے بعد اماں اس کے بعد......'' شمشو کی زبان کھلتے کھلتے رہ گئی۔ وہ غالباً آج کا واقعہ ماں کو سنانا چاہتا تھا لیکن وقت پر ہوش آ گیا۔ اس واقعے میں پانچ روپے کی چوری بھی شامل تھی مگر اسے شدید حیرت ہوئی صبح کو ابا نے کرتے کی جیب دیکھی ہوگی' کیا پانچ روپے کا معاملہ آسانی سے ٹل گیا۔ بہرطور اپنے بیڈروم میں جا گھسا اور بستر پر لیٹ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ گہری نیند سو گیا تھا۔

دوسری صبح وقت مقررہ پر آنکھ کھلی یا شاید وہ وقت مقررہ نہیں تھا کیونکہ باہر سورج کی تیز روشنی کے بجائے ہلکا ہلکا جھٹپٹا چھایا ہوا تھا۔ شمشو نے ایک گہری سانس لے کر کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن دوسرے لمحے حیرت سے اچھل پڑا۔ چار پائی ہی پر تھا لیکن بدن رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ چار پائی کی پٹیوں سے باندھ دیئے گئے تھے اور باقی رسی سے اسے چار پائی ہی سے کس دیا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شمشو پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ یہ کیا ہو گیا' یہ کس نے کیا ہے' کیا گھر میں چور آ گئے اور ان لوگوں کو اس طرح چار پائی سے باندھ کر سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ شمشو نے چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز گلے میں پھنس گئی۔ باہر آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ نصرت بیگ ویسے ہی صبح جلدی جاگنے کے عادی تھے اور ان کی وجہ سے بیگم نصرت بیگ بھی جاگ جاتی تھیں۔ پھر بدی کا فرشتہ اندر داخل ہو گیا۔ پیچھے پیچھے بیگم نصرت بیگ بھی تھیں۔ شمشاد نے خوف زدہ نگاہوں سے نصرت بیگ کو دیکھا' جن کے ہاتھ میں رسی کا ایک موٹا ٹکڑا دبا ہوا تھا اور اس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ شمشو کی جان حلق میں آ کر اٹک گئی۔ ابا جان کا یہ خوف ناک روپ اسے بہت ہول ناک محسوس ہوا تھا اور اسے فلم ''جیک دی جائنٹ کلر'' یاد آ گئی تھی جس میں ایسے ہی ایک خوفناک اور ظالم جادوگر کا کردار بھی تھا اور وہ اپنے حریف کو ایسی ہی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ نصرت بیگ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور بیوی کی طرف رخ کر کے بولے۔

''دیکھو اگر تو نے زبان کھولی تو آج تیری بھی خیر نہیں ہے جو کچھ ہو گا تیرے اپنے ہاتھوں ہو گا' میں تجھے پہلے سے بتائے دے رہا ہوں۔'' بیگم نصرت نے کوئی جواب نہیں دیا اور نصرت بیگ شمشو کے قریب آ گئے۔

''اب بھاگ کے چڑھ جا چھت پر بھوتنی کے لنڈن' اب چڑھ کے دکھا مجھے چھت پر' اب نکل جا ذرا کمرے سے میں بھی سمجھ لوں کہ تو بہت بڑا چالاک ہے۔''

''پپ...... پیارے ابا جان...... کک...... کیا ہوا......؟'' ''پیارے بیٹے پانچ روپے کا نوٹ کہاں ہے؟'' نصرت بیگ نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''کک...... کون سا...... پپ...... پانچ روپے کا نوٹ ابا جان؟''

''وہ جو میرے کرتے کی جیب میں تھا۔''

''ابا جان کرتے کی جیب میں ہو گا۔''

''نہیں ہے' کل کی رنگ رلیوں کے بارے میں بھی ذرا کچھ تفصیلات بتا دو میرے نوجوان پوت۔''

''کک...... کیسی رنگ رلیاں؟''

''ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ کھانا جو اڑایا جا رہا تھا اور جس کا بل آپ نے ادا فرمایا تھا۔'' نصرت بیگ نے کہا اور شمشو نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ خوف ناک ابا جان صرف ظالم جادوگر ہی نہیں بلکہ انگریزی جاسوس بھی ہیں جنہوں نے بڑی چالاکی سے جاسوسی کر کے سب کچھ معلومات حاصل کر لیں اور اب شمشاد بیگ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح گلوخلاصی حاصل کرے۔ چار پائی سے بندھا ہوا تھا ورنہ کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی جاتی۔ نصرت بیگ رسی ہلاتے ہوئے آگے بڑھے اور شمشو کے بالکل قریب پہنچ گئے۔

''مم...... معاف کر دو ابا' ایک بار اور معاف کر دو۔ کوئی بھی قسم لے لو اس کے بعد اگر کوئی شکایت ہو جائے تو مجھے اس چار پائی سے باندھ کر زمین میں گاڑ دینا۔ ابا' ابا...... رسی بھیگی ہوئی ہے' کھال اتر جائے گی قسم اللہ کی۔''

''کتے! کچھ کرنے کا نہ دھرنے کا اور تو نے اس گھر کو جہنم بنا کر رکھا ہوا ہے۔ سارے محلے میں بدنام کر دیا ہے مجھے اور اس کے بعد تیری یہ حرکتیں بھی برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ بول پانچ روپے کیوں نکالے میری جیب سے۔'' نصرت بیگ نے پہلا وار کیا اور شمشو چار پائی پر تڑپنے لگا۔

مر گیا ابا...... مر گیا ابا مر گیا۔''

''ابا اتنی آسانی سے نہیں مرے گا بیٹے۔ پہلے تجھے مرنا پڑے گا۔ بول پانچ کا نوٹ کیوں نکالا میری جیب سے؟ تو جانتا ہے کس محنت سے پیسے کماتا ہوں۔''

''ج ج...... جانتا ہوں ابا ہائے ابا۔'' شمشو نے دوسرے کوڑے سے بچنے کے لیے رخ تبدیل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پانی سے بھیگی ہوئی رسی نے بدن پر

ایک اور لکیر ڈال دی۔ نصرت بیگ بالآخر شاہی زمانے کے جلاد بن گئے تھے اور اسے چارپائی سے باندھ کر کوڑے لگائے جا رہے تھے۔ دو' تین وار نے شمشو کا کام تمام کر دیا اور اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ٹیڑھی کر لی۔ اس کے بعد اگر ایک آدھ کوڑا اور پڑے اور اسے برداشت کر لیا جائے تو اس بات کے امکانات ہو سکتے تھے کہ اسے بے ہوش سمجھ لیا جائے۔ ایسی حالت میں شاید جان بچ جائے لیکن اس کے بعد نصرت بیگ نے اس کے کوڑا نہ مارا اور نیچے جھک کر اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

''مکاری سے کام نہیں چلے گا۔ بتا پانچ روپے کا نوٹ کیوں نکالا تو نے اور اب وہ مجھے کیسے واپس ملے گا؟'' نصرت بیگ کے جھنجھوڑنے کے باوجود جب اس کی آنکھ نہ کھلی تو بیگم نصرت بیگ کے حلق سے ایک دل سوز چیخ نکلی اور وہ ''ہائے میرا بچہ'' کہہ کر شمشاد بیگ سے لپٹ گئیں۔ کہنے لگیں۔

''اب مار لو جتنے چاہو کوڑے' مار لو' مار دو ہم دونوں کو' ختم کر دو۔''

''کیا دیوانگی کی باتیں کر رہی ہے' ابھی اڑا دوں گا دو رسیاں تو اٹھ کر بھاگ جائے گی' تیرے ہی بے جا لاڈ پیار نے اسے بگاڑا ہے۔''

''بگڑ گیا ہے کم بخت اب کیا کروں' بتاؤ تو سہی' ہائے بے ہوش ہو گیا ہے۔ صبح ہی صبح پتہ نہیں ناشتنی میں کس کا منہ دیکھا تھا؟''

''میں ہی آ گے تھا کہہ دے' کہہ دے میں ہی منحوس آ گے تھا۔''

''پتہ نہیں' اب کیا کروں ہائے میرے اللہ' ڈاکٹر' ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

''ڈاکٹر کو بلاؤں' تو ذرا ہٹ جا میں خود اس کا سارا علاج کیے دیتا ہوں۔''

''نہیں ہٹوں گی' مجھے بھی اس کے ساتھ ہی مار ڈالو۔'' بیگم نصرت بیگ نے کہا اور نصرت بیگ رسی پھینک کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔

بیگم نصرت بیگ' شمشاد سے لپٹی ہوئی روتی رہیں اور شمشاد محسوس کرتا رہا کہ باہر کی کیا کیفیت ہے۔ باہر اب اسے کوئی آہٹ نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ماں کا بلکنا اسے دکھ دے رہا تھا' چنانچہ اس نے لپٹی ہوئی بیگم نصرت بیگ کے کان میں سرگوشی کی۔

''ارے ہوش میں ہوں اماں' پروا مت کر' ذرا دیکھیو باہر جا کے وہ ظالم جلاد چلے گئے یا نہیں۔''

''ہائے شمشاد یہ سب کیوں کرتا ہے تو؟ تو نے...... تو نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔ ہائے کیا کیا سوچا تھا میں نے تیرے بارے میں۔ کیا بن کے رہ گیا ہے تو۔''

''ارے باتیں مت کر اگر سن لیں گے تو پھر اندر گھس آئیں گے۔ ذرا باہر کی پچویشن تو پتہ چلا۔ کیا کر رہے ہیں؟ ناشتہ واشتہ تو نہیں کیا ہو گا ابھی' جا دیکھ اماں کہیں سچ مچ ہی بیہوش نہ ہونا پڑے مجھے۔'' شمشو نے کہا اور بیگم نصرت بیگ اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔ باہر آ کر دیکھا تو نصرت بیگ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ شاید غصے میں باہر نکل گئے تھے۔ آج ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ باہر بھی انہوں نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں لیکن نصرت بیگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر شمشو کے کمرے میں آ گئیں۔

''چلے گئے شاید۔''

''ایسے نہیں جانے کے۔ قسم اللہ کی اماں' وہ انگلستان کے جاسوس عرف چمکتے شعلے ہیں۔ ایسے نہیں جانے کے' ذرا دیکھو کسی چارپائی وغیرہ کے نیچے تو نہیں چھپے ہوئے۔''

''بکے جا رہا ہے' اپنی حرکتوں کو نہیں دیکھتا اور انہیں برا کہنے میں تیری زبان نہیں تھکتی۔''

''کیا کروں اماں' بس یوں سمجھ لے کہ جب تک خزانہ میرے ہاتھ نہیں آ جاتا میرے لیے اس دنیا میں جینا مشکل ہے۔''

''اب تو صبر آ گیا شدن بھائی۔ دیکھ لو ہمارا بھی یہی حال ہو گیا جو تمہارا ہوا۔''

''ایں! کیا کہہ رہا ہے۔''

''کچھ نہیں کہہ رہا اماں' اب ایک دو پیالیاں گرم گرم چائے تو پلا دو' تاکہ بدن میں کچھ گرمی آئے۔ ابا جان تو جان ہی نکال کر لے گئے تھے۔'' شمشاد بیگ نے کہا اور کراہتا ہوا باہر آ گیا۔ بیگم نصرت بیگ باورچی خانے میں جا گھسی تھیں۔ شوہر کی ناراضگی کا بھی خیال تھا۔ ان سے بھی بگڑ گئے ہوں گے مگر شمشاد بیگ کو کس طرح سمجھاتیں؟ بگڑا ہوا بچہ تھا' نجانے کب

اسے ہوش آئے گا۔ بہرطور دوپہر تک شمشو گھر میں ماں کے ساتھ ہی رہا اور اس کے بعد باہر جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

''پھر نکل پڑا آوارہ گردی کے لیے؟''

''نہیں اماں، میں اب تجھے کچھ کر کے ہی دکھاؤں گا۔ دل میں آخری فیصلہ کر لیا ہے میں نے۔''

''ارے تو کیا آخری فیصلہ کرے گا؟ جانتی ہوں تیرے بارے میں سب کچھ۔'' بیگم نصرت بیگ بھلا جوان جہان لڑکے کو گھر میں کیسے روک سکتی تھیں۔ چنانچہ شمشاد بیگ باہر نکل آئے۔ کسک بدن پر موجود تھی۔ زخم چیخ رہے تھے۔ بھلا ان کا علاج کیا ہوتا؟ بھیگی ہوئی رسیوں نے ایسی گل کاری کی تھی کہ بس چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ تاہم دل پر جبر کیے وہ پنواڑی کے ٹھیے پر پہنچ گئے۔ شدن کمار آج وہاں نہیں تھے۔ پنواڑی نے البتہ شمشو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابے شمشو بھائی آخر یہ کس سے پھڈا ہو گیا اپنے شدن کمار کا۔''

''پپ...... پتہ نہیں، ہوا کیا؟''

''ابے کئی ہڈیاں فرنیچر ہو گئی ہیں بیچارے کی...... سنا ہے ہسپتال پہنچ گیا۔''

''ارے باپ رے۔'' شمشاد بیگ کا دم نکل گیا۔ ویسے یہ ہڈیاں فرنیچر ہو جانا ان کی سمجھ میں آسانی سے آ گیا تھا۔ یقیناً ہڈیاں فرنیچر ہو گئی ہوں گی۔ وہ کافی دیر تک پنواری سے باتیں کرتے رہے۔ اب اپنے زخم کسے دکھائیں؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں؟ بہرطور علاقے کا ایک چکر لگانا تو ضروری تھا۔

◇◇◇

نوشہ میاں اور قمرو کی دوستی خوب پکی ہو گئی تھی۔ نوشہ میاں تو خیر جو کچھ تھے وہ تھے ہی لیکن قمرو بھی کوئی بدنسل ہی تھا، جس نے بلاوجہ اس چھوٹے سے مظلوم خاندان سے بیر باندھ لیا تھا۔ ویسے اس نے ابھی تک اپنی اس کھولی کا رخ نہیں کیا تھا کیونکہ اپنی اسکیم سے پہلے وہ شاہ جہاں بیگم کی اسکیم کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کی کارروائی جاری تھی اور نوشہ میاں

اس کے معاون کار تھے۔ چنانچہ ہوٹل ہی کے چند ساتھیوں کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ بیرک میں ایک گھر ایسا بھی ہے جہاں بہت کچھ مل سکتا ہے۔ دو، تین لفنگے قسم کے نوجوانوں نے تو شاہ جہاں بیگم کے بیرک کے سامنے چکر بھی لگانے شروع کر دیئے تھے لیکن بے چاری شاہ جہاں بیگم کو ابھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس وقت بھی دونوں دوست اسی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ قمرو نے کہا۔

''استاد ہنڈیا پک گئی ہے۔ میرا خیال ہے اب اس میں ابال آ جانا چاہیے۔ زیادہ دیر انتظار کرنا بھی تو مناسب نہیں ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو قمرو میاں، میرا خیال ہے اب تم اس کام کا آغاز کر ہی ڈالو۔''

''تو پھر استاد یہ بتاؤ کہ یہ کام شروع کیسے کیا جائے؟''

''قسم ولیوں کی، اپنی کھوپڑی بھی کسی طرح بہت بڑے بڑے آدمیوں کی کھوپڑی سے کم نہیں ہے۔ اگر کچھ عرصے پہلے پیدا ہوتے تو چرچل کی جگہ لے چکے ہوتے مگر کیا کریں تقدیر میں نہیں تھا۔ اپنی کھوپڑی ایسے کاموں میں اتنی فٹ ہے کہ آزمائے گا تو حیران رہ جائے گا۔''

''تو پھر آزمانے کا موقع دو نا نوشہ میاں، یہاں بھی سالی مصیبت ہی پڑی ہوئی ہے۔ نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو ہے، بس مست موجی بن کر جی رہے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے اور جیسا کہ تم کہتے ہو کہ اپنا دھندا بھی فٹ ہو جائے گا تو پھر پیارے یوں سمجھ لو کہ پیر دھو دھو کر پئیں گے تمہارے۔'' نوشہ میاں تجربہ کارانہ انداز میں مسکرانے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔

''تو سن بیٹا، اب بیر پک گئے ہیں اور بس جھاڑ ہلانے والی بات ہے۔'' نوشہ میاں آہستہ آہستہ قمرو کو اس کی پلاننگ بتاتے رہے اور قمرو بغور سنتا رہا۔

شاہ جہاں بیگم اپنی زندگی کا سب سے نازک دور گزار رہی تھیں۔ بہت عیش و آرام سے زندگی بسر کی تھی انہوں نے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں یہ لمحے بھی آ سکتے ہیں۔

بیگم صاحبہ بے شک بہت ہی نیک دل خاتون تھیں، اپنے مسائل کا حل خود ہی دریافت کرنا چاہتی تھیں۔ فوراً ہی کسی کی شرافت سے فائدہ اٹھانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

چنانچہ بیگم صاحبہ کی ہر پیش کش کو وہ مسترد کر دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے' جو مل رہا ہے وہی کافی ہے۔ معمول کے مطابق اس شام بھی وہ گھر واپس آئیں بساط بھر کچھ نہ کچھ کر لیا کرتی تھیں جانتی تھیں کہ سلطانہ جس حال میں ہے اس میں اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ بدن کو طاقت بھی چاہیے اور باقی سارے معاملات بھی ضروری ہیں' چنانچہ اس کے لیے تھوڑے بہت پھل وہ اپنا پیٹ کاٹ کر لائی تھیں۔ اس وقت بھی آئیں تو تینوں لڑکیاں اپنی اس چھوٹی سی رہائش گاہ کو صاف ستھرا کیے آرام سے بیٹھی ہوئی تھیں اور خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ کم از کم شاہ جہاں کو دیکھ کر اطمینان ہوتا تھا کہ لڑکیوں نے بھی ان برے حالات کو دل سے تسلیم کر لیا ہے اور کسی بھی طرح بددل اور ہراساں نظر نہیں آتیں۔ چنانچہ ان کے سارے دسوسے ساری فکریں لڑکیوں کے مطمئن چہرے دیکھ کر دور ہو جاتی تھی۔ سلطانہ بھی بہتر حالت میں تھی۔ سلطانہ نے جلدی سے ان کے لیے چائے کی پیالی پیش کی اور شاہ جہاں بیگم مسکراتی ہوئی بولیں۔

"تم لوگ اس طرح میرا استقبال کرتی ہو کہ جیسے کوئی کماؤ ابا جان نوکری سے گھر آتے ہیں۔"

"تو اماں اس میں شک بھی کیا ہے' آپ نے ہمارے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟"

"جو دل میں ہے بیٹا' جس دن وہ سب کر لوں گی اس دن سمجھوں گی کہ کچھ کیا ہے تمہارے لیے۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باہر سے ایک آواز سنائی دی۔

"اماں جی...... اے بی اماں جی۔" اور سب چونک پڑے۔ قمرو کی آواز بھلا کون نہ پہچانتا۔ بہت دن کے بعد نظر آیا تھا۔ شاہ جہاں بیگم کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دروازے سے باہر نکلیں اور قمرو کو گھورتی ہوئی بولیں۔

"تو آ گیا موذی؟ کہاں مر گیا تھا اتنے دنوں سے' تیرا ستیاناس' میں تو تیری ناک کاٹنے کی فکر میں تھی۔ کیا سمجھا ہے تو نے ہمیں؟ کیا سمجھ کر تو نے لڑکیوں سے بدتمیزی کی تھی؟"

آس پاس کے لوگوں نے بھی شاہ جہاں بیگم کی کرخت آواز سن لی تھی۔ قمرو دو قدم پیچھے ہٹا اور بولا۔

"اے بی بس رہنے دو' کیوں سب کے سامنے میرا منہ کھلوا رہی ہو جو کچھ تم نے یہاں شروع کر رکھا ہے نا وہ تمہاری گردن میں پھانسی کا پھندہ نہ بن جائے تو قمرو نام نہیں۔ لو میں تو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں' برائیوں کے راستے سے ہٹا رہا ہوں تمہیں مگر وہی بات ہے ناں گندی نالی کا کیڑا گندی نالی ہی میں جیتا ہے لیکن اماں جی یہ جگہ تمہارے کام کے لیے مناسب نہیں ہے۔ فوراً یہاں سے بوریا بستر اٹھا دو' شریفوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب محلے دار خانماں برباد ہیں اور اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد یہاں آئے ہیں لیکن عزت نہیں لٹائی انہوں نے۔ ارے بہو بیٹیاں رہتی ہیں یہاں۔ میاں حافظ جی' ذرا دیکھو تو سہی' کیا ان بیرکوں میں بھی اب چکلے کھلیں گے؟ کیوں شاہ جہاں بیگم' جواب دو؟"

شاہ جہاں بیگم دھک سے رہ گئی تھیں۔ قمرو ان سے زوردار آواز میں چیخ رہا تھا اور پاس پڑوس کے لوگ متوجہ ہوتے جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ اس کھولی کے سامنے جمع ہو گئے۔

"کیا بات ہے بھائی؟ کیا ہوا؟"

"میاں پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ بڑے دن سے دیکھ رہا ہوں ساری حرکتیں۔ میں کہتا ہوں آپ لوگوں کی بھی تو بہو بیٹیاں ہیں' میں اکیلا چھڑا چھانٹ...... مگر کبھی ماں بہنیں بھی تھیں گھر میں اور بھی رشتے دار تھے' اب وہ اکیلا رہ گیا ہوں تو کیا ہوا' قسم اللہ کی یہ نہیں ہونے دوں گا جو یہاں ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے؟"

"میاں چکلا کھلا ہوا ہے یہاں...... اس کھولی میں۔ تین جوان لونڈیا ہیں اور ایک یہ بڑی بی۔ سمجھے آپ' ثابت کر دوں گا اس بات کو کہ بڑی بی پیشہ کرتی تھیں' طوائف ہیں اور یہاں بیرک میں آنے کے بعد انہوں نے نیا دھندہ نکال لیا ہے۔ کافی دن سے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں لیکن خاموش تھا۔ سمجھایا ایک دو بار بڑی بی کو تو جان کو لگ گئی میرے اور آج میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ دودھ کا دودھ' پانی کا پانی کر دوں گا۔"

"کیا بک رہے ہو' تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ...... یہ......"

"میاں چار چھ کو پکڑ کر لا دوں۔ محلے کے سارے لونڈے چکر لگاتے ہیں ادھر آج کل۔ میں تو صرف ایک بات کہتا ہوں حافظ جی تمہاری کوئی بیٹی ہے جوان گھر میں؟"

"کیوں نہیں ہے۔" جن صاحب کو مخاطب کیا گیا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"تو کیا برے اثرات نہیں پڑیں گے؟ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا رات کو ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔ میں اسی لیے تو یہاں سے بھاگا ہوں۔ نہیں شاہ جہاں بیگم یہ نہیں ہونے کا' قسم اللہ کی جان دے دوں گا۔ جان لے لوں گا۔ شاہ جہاں بیگم کی تو آواز ہی بند ہو گئی تھی جو وار قمرو نے کیا تھا وہ ناقابل برداشت تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ لوگ آہستہ آہستہ قمرو کے ہم نوا ہوتے جا رہے تھے۔ پھر نوشہ میاں بھی کہیں سے پہنچ گئے۔

"کیا ہو رہا ہے قمرو بھائی؟" شاہ جہاں بیگم نے نوشہ میاں کو دیکھا اور ان کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

"میاں انہی سے بات کر رہا ہوں نوشہ بھائی' دیکھ لو پارسا بن رہی ہیں۔ کیوں بھائی جاننا چاہو گے کچھ۔"

"کیا......؟" بہت سے لوگوں نے سوال کیا۔

"یہ نوشہ میاں ہیں' بائی جی کے پرانے جاننے والے۔ کہو نوشہ بھائی جو کچھ کہنا ہے' حلف اٹھا کے کہہ دو غلط ہے یا سچ۔"

"بھائی قمرو نے تو ہنگامہ کھڑا کر دیا' کیا چکر کیا ہے؟"

"یہ کون ہیں اماں جی' جانتے ہو؟"

"انہیں میں ہی نہیں جانتا' ہزاروں جانتے ہیں۔ پیشہ ور طوائف ہیں' بیٹیاں ہیں ان کی جو ناچتی گاتی تھیں اور پیشہ کماتی تھیں۔ اب یہاں کیا کر رہی ہیں' یہ تم جانو یا اللہ جانے اپن تو اس علاقے کے رہنے والے ہیں نہیں۔"

"کیا یہ سچ ہے بڑی بی؟" کسی نے شاہ جہاں بیگم سے کہا اور شاہ جہاں بیگم نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"حقیقت زبان سے کیسے کہیں' آج منہ چھپا رہی ہیں کل کیا کرتی تھیں یہ ہم سے

پوچھیں۔"

"نہیں بڑی بی' ہم لوگ مصیبت کے مارے ضرور ہیں لیکن عزت دار ہیں' بہو بیٹیوں کے ساتھ یہاں سر چھپائے پڑے ہیں لیکن ہم اپنے محلے میں یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ فوراً یہ جگہ خالی کر دو۔ کیا سمجھیں۔" اور پھر بے شمار لوگوں نے اس بات کی حمایت شروع کر دی۔ شاہ جہاں بیگم ہانپتی کانپتی اندر چلی گئی تھیں۔ تینوں لڑکیاں بھی اندر سے یہ ساری باتیں سن رہی تھیں۔ ان کے چہرے فق تھے۔ شاہ جہاں بیگم نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور لڑکیاں انہیں سنبھالنے لگیں۔

"اب کیا کروں میرے مالک؟ اب کیا کروں؟" شاہ جہاں بیگم نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ باہر سے قمرو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اماں جی ایسے رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ میں طے کر چکا ہوں کہ یا میں یہاں رہوں گا یا تم رہو گی۔ میں اس گندگی میں وقت نہیں گزار سکتا۔ کیا سمجھیں۔"

"فوراً نکل جاؤ یہاں سے ......فوراً نکل جاؤ۔" بے شمار آوازیں آنے لگیں اور چاروں طرف سے لوگ جمع ہونے لگے۔ سب کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ اس کھولی میں ایک بائی جی اپنی بیٹیوں کے ساتھ رہتی ہیں اور پیشہ کرتی ہیں۔ سب کو اس بات پر طیش آ رہا تھا اور لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ یہ جگہ بھی اس قابل ہے' کسی نے آہستہ سے کہا۔

"بھائی پیٹ تو بھرنا ہی ہوتا ہے جس کا جو کام ہوتا ہے وہ وہاں کرتا ہے۔"

"تو اپنے گھر لے جاؤ نا انہیں چچا جی' کیا خیال ہے؟ تمہارا پیٹ بھی پل جائے گا۔" کسی دوسرے نے طنز کیا اور وہ صاحب کان دبا کر خاموش ہو گئے۔ بہرطور سب اس بات پر تل گئے تھے کہ شاہ جہاں بیگم کو فوراً یہاں سے نکال باہر کیا جائے اور آوازیں لگا رہے تھے پھر یہ دھمکیاں بھی دی جانے لگیں کہ اگر شاہ جہاں بیگم نے فوراً یہ جگہ خالی نہ کی تو وہ لوگ اندر گھس آئیں گے اور ان کو یہاں سے دھکے دے کر باہر نکال دیں گے۔ شاہ جہاں بیگم نے اپنے آپ کو سنبھالا تھا' باہر آئیں' کسی سے کچھ کہنا فضول تھا۔ قمرو اپنا وار کر چکا تھا۔ نوشہ میاں اس کے

ساتھ تھا۔ بلاشبہ نوشہ میاں نے ان سے انتقام لے لیا تھا۔ باہر آ کر انہوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"بھائیو! کچھ وقت مل جائے گا مجھے؟"

"کتنا وقت چاہتی ہو بڑی بی؟" ایک نوجوان شخص نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"کل کا دن...... صرف کل کا دن' کل تک اگر میں اپنے لیے کوئی بندوبست نہ کر سکی تو کہیں بھی نکل جاؤں گی یہاں سے۔ پرسوں تم مجھے یہاں نہیں دیکھو گے۔"

"ٹھیک ہے جی' اتنا ٹائم دے دو لیکن بڑی بی پرسوں کے بعد تمہیں یہاں نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"نہیں نظر آؤں گی بھیا...... نہیں نظر آؤں گی۔" شاہ جہاں بیگم نے درد بھرے انداز میں کہا اور مجمع منتشر ہونے لگا۔ نوشہ میاں اور قمرو بھی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھ گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر پہنچ کر نوشہ میاں نے کہا۔

"میاں قمرو' تم سچ مچ بڑے کام کی چیز نکلے۔ قسم ولیوں کی' کیا سوانگ رچایا بڑی بی چاروں شانے چت ہو گئیں۔ ایک ہی چٹکی میں لمبا کر دیا تم نے تو انہیں۔" قمرو جھک جھک کر نوشہ میاں کو آداب کرنے لگا اور بولا۔

"اے شاگرد کس کا ہوں؟ نوشہ میاں کا...... کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"جیتے رہو...... جیتے رہو' کما کھاؤ گے بیٹا' اس طرح سعادت مندی سے نوشہ میاں کی باتوں پر عمل کرتے رہو۔"

"کیا خیال ہے' چائے پی جائے؟"

"ایں! ہاں بالکل چلو چلتے ہیں۔" نوشہ میاں اور قمرو پھر اسی ہوٹل میں جا بیٹھے تھے جوان جیسوں کا اکھاڑا تھا۔ قمرو نے بڑے ٹھسے سے چائے کا آرڈر دیا اور ڈھپر پیالی بنا کر استاد کو پیش کی۔ اس کے بعد کہنے لگا۔

"اے استاد! ایک بات تو بتاؤ۔"

"پوچھو' پوچھو...... پوچھو گے نہیں تو جنرل نالج کیسے بڑھے گی؟" نوشہ میاں نے کہا۔

"میں نے اور تم نے تو کھلی دشمنی لے لی شاہ جہاں بیگم سے۔ اس کے بعد ہماری تمہاری دال کیسے گلے گی؟"

"ہوں! یہی تو استادوں کے گر ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی دال نہ گلے تو لعنت ہے استادی پر۔ سنو قمرو میاں' تم یہاں رہتے ہو اور آسانی سے ان پر نظر رکھ سکتے ہو اور اب تو تمہاری پوزیشن بھی بہتر ہو گئی ہے۔ میرا مطلب ہے جس لیے تم کھولی سے بھاگے تھے اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی۔ شان سے جا کر عزت داروں کی طرح اپنے گھر میں رہو' مجال ہے کسی کی جو تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔"

"اے نہیں استاد جی' مروا رہے ہو یار۔ بڑھیا کو جنون آ گیا تو قسم اللہ کی جھٹکا کر کے رکھ دے گی۔ گردن اتار دے گی اپنی۔ نہیں استاد یہاں چوک رہے ہو تم۔ ابھی وہ کھولی تو میرے لیے بہت خطرناک ہے۔ ویسے تو میں نہیں ڈرتا کسی سے مگر سوتے میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو تم خود سمجھ سکتے ہو۔ ابھی کھولی میں جانا ٹھیک نہیں رہے گا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے...... تو پھر کہیں اور ایک دن گزار لو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا' بڑھیا نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو ناں؟"

"سمجھاؤ نا استاد جی' بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"بھئی یہ یہاں سے کہیں جائے گی' کوئی ٹھکانہ کرنے کی کوشش کرے گی اور وہ ٹھکانہ ہمارے علم میں ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے میں صبح کو نہ پہنچ سکوں' تم ہوشیاری سے جاگ جانا اور بڑھیا کا پیچھا کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ نیا ٹھکانہ کہاں بناتی ہے۔ کل تک کی مہلت مانگی ہے اس نے۔ میرا خیال ہے کل کا دن ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"

"ٹھیک ہے استاد' اس کی تو تم فکر ہی مت کرو۔" قسم اللہ کی ایسی جاسوسی کروں گا کہ بس دیکھنے والی ہو گی۔"

"تو بس پھر یوں سمجھ اپنی چاندی ہی چاندی ہے۔"

"سونا استاد...... سونا۔" قمرو نے نوشہ میاں کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور

دونوں شیطانی قہقہے لگاتے رہے۔

◇◇◇

شمشو کو یہ ساری دنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں ہے زندگی میں۔ ابا جان نے کبوتر اڑا کر ساری خوشیاں چھین لی تھیں۔ ورنہ کبوتروں میں دل بہلتا رہتا تھا۔ کرنے کے لیے اور تھا بھی کیا اور پھر وہ تنہا ہی تو نہیں تھے قربت نگر میں بہت سے ایسے لوگ نظر آتے تھے جو کچھ نہیں کرتے تھے' بس کسی دکان پر بیٹھ گئے۔ کسی سے گپیں لڑا لیں۔ تھوڑے بہت کھیل تماشوں میں حصہ لے لیا۔ فلمیں دیکھ ڈالیں اور بس عیش ہی عیش لیکن یہ وہ لوگ تھے جن کے کوئی ظالم ابا جی نہیں تھے اور شمشاد بیگ کو اس بد نصیبی کا سامنا تھا۔ چنانچہ مجبور ہو کر گھر ہی کا رخ کیا لیکن دروازے سے داخل ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ چنانچہ انتظار کرتے رہے۔ گھر کے قریب پہنچ کر چوروں کی طرح پورے گھر کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ لگا لیا کہ یقینی طور پر نصرت بیگ واپس آ چکے ہوں گے چنانچہ احاطے کی دیوار کود کر اندر داخل ہوئے۔

''سبحان اللہ...... سبحان اللہ گویا سارے فنون میں طاق ہو گئے ہیں۔ صاحبزادے۔''

انہوں نے یہ جملے بیگم نصرت بیگ کو مخاطب کر کے کہے تھے اور بیگم نے ٹھنڈی سانس لے کر شوہر کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولیں۔

''تم وعدہ کر چکے ہو کہ...... کہ''

''ہاں ...... ہاں وعدہ کر چکا ہوں۔ تشریف لائیے۔ حضرت تشریف لائیے۔''

نصرت بیگ نے کہا اور شمشو کے قدم ان کی طرف اٹھ گئے۔ وہ نصرت بیگ کے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ تبھی بیگم نصرت بیگ کی آواز ابھری۔

''پاؤں پکڑ لے اپنے ابا کے۔ معافی مانگ۔'' شمشاد نے یہ موقع فوراً غنیمت سمجھا پھرتی سے نصرت بیگ کے پیروں کی طرف دوڑا اور ان کے پیر پکڑ لیے۔

''صاحبزادے زندگی میں کچھ وقار پیدا کرو۔ اپنی اُن حرام ہڈیوں کو کچھ محنت کرنے کی عادت ڈالو ورنہ ساری زندگی ہی کسی نہ کسی کے پاؤں پکڑتے رہو گے۔ چلو سیدھے

ہو جاؤ۔'' شمشو سیدھا ہو گیا۔ نصرت بیگ اسے غور سے دیکھنے لگے پھر بولے۔

''کیاں آوارہ گردی کی دن بھر؟''

''کہیں نہیں ابا' قسم اللہ کی بس بدن میں درد ہو رہا ہے۔ دیکھو لال...... لال نشان پڑ گئے ہیں۔''

''کاش ان میں سے کوئی لال نشان تمہاری غیرت کو جگا دے۔''

''جاگ گئی قسم اللہ کی ابا غیرت تو آج صبح ہی صبح جاگ گئی۔''

''کیا واقعی؟'' نصرت بیگ نے بہ غور شمشو کا منہ دیکھا۔

''ہاں ابا معافی چاہتا ہوں۔''

''پانچ روپے نکالے تھے میرے کرتے کی جیب سے؟''

''نکالے تھے ابا۔''

''کیا کیا ان کا؟''

''کچھ نہیں ابا بس خرچ ہو گئے۔''

''ہوٹل میں؟''

''ہاں ابا جی۔''

''شمشاد تو جانتا ہے کہ اس وقت کتنے نازک حالات ہیں ایک روپیہ کمانے کے لیے کتنی شدید محنت کرنی پڑتی ہے۔ میرا ہی دل جانتا ہے۔ لیکن بیٹا زندگی بہت لمبی ہے۔ کچھ کرو کچھ بھی کرو لیکن اپنے آپ کو کام کا آدمی بناؤ۔''

''بس ابا یہی کرنا ہے مجھے۔''

''کیسے کرو گے؟''

''اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ کر کے ہی دکھاؤں گا۔''

''بڑی اچھی بات ہے اگر تمہارے اندر بیٹے یہ پیدا ہو جائے لیکن تمہاری اماں سے ایک بات ہوئی ہے۔ میری اور اسی پر میں نے تمہیں معاف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کل صبح سے گھر سے باہر نکل جاؤ اور شام کو اس وقت گھر میں داخل ہو جب تمہاری

جیب میں کچھ پیسے ہوں۔ کمائی کر کے لاؤ کسی بھی طرح ریلوے اسٹیشن پر جا کر قلی گیری کرو۔ محنت مزدوری کرو، مزدوروں کے ساتھ مل کر اینٹیں اٹھاؤ، کچھ بھی کرو لیکن گھر میں داخل ہوتے وقت تمہارے پاس دن بھر کی کمائی ضرور ہونی چاہیے ورنہ اس گھر میں داخل ہونے کی کوشش مت کرو۔

شمشو کو شدید بھوک لگ رہی تھی۔ بہرطور کھانا کھایا اور اس کے بعد خاموشی سے جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے لیے یہ بات بڑی پریشان کن تھی کہ کل سے کام کرنا ہے۔ بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر دل میں فیصلہ کیا کہ اگر کوئی بات نہ بن سکی تو گھر میں آنا بے کار ہے۔ کہیں اور ہی ٹھکانا بنانا ہوگا۔ بہرحال رات گزر گئی۔ صبح اتنی جلدی ہوگئی کہ شمشو کو نہایت ناگوار گزری۔ منہ ہاتھ دھویا۔ ماں نے ناشتہ بھی دیا۔ نصرت بیگ کام پر جا چکے تھے ناشتہ کرتے ہوئے شمشو گہری سوچ میں گم رہا۔ ماں اسے دیکھتی رہی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی تھیں شمشو بالآخر ایک سرد آہ بھر کر گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ بھلا ایسی محنت مزدوری اس کے بس کی بات کہاں تھی۔ باہر نکل آیا۔ سوچوں میں گم تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ اس کے بعد وہ قربت نگر سے باہر نکل آیا۔ باہر کی دنیا بلاشبہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی لیکن آج وہ اس دنیا کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ واقعی سب ہی کسی نہ کسی چکر میں مصروف تھے۔ ٹھیلے والے ٹھیلے دھکیلتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ تانگے والے تانگے دوڑا رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کی جانب بھاگ رہے تھے۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے؟ جینے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے؟ کاش وہ عظیم الشان خزانہ ان کے ہاتھ لگ جائے لیکن اب تو اماں ابا بھی خزانے کی آس کھو چکے ہیں۔ بلکہ دونوں ہی خزانے کا نام سن کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اماں نے تو شرافت حسین صاحب کے گھر والوں سے ملنا جلنا بھی ختم کر دیا اور وہاں جانا بے کار تصور کر لیا ہے لیکن کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی۔ ہر افواہ میں کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے۔ وہ کون سی ترکیب ہو جس سے خزانہ ہاتھ لگے۔ وہ ایک ایسے بازار سے گزرے جہاں دنیا کی ہر شے فروخت ہو رہی تھی۔ انہوں نے ان لوگوں کو دیکھا جو سڑکوں پر خوانچے لگائے ہوئے تھے۔ ریڑھیوں پر سامان بیچ رہے تھے۔ دفعتاً ہی شمشاد کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو تہبند اور بنیان پہنے ہاتھوں میں دو کبوتر لیے کھڑا تھا اور شاید انہیں بیچنا چاہتا تھا۔ شمشو

کی نگاہ کبوتروں پر پڑی تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بھلا وہ اپنے شیریں اور فرہاد کو کیسے نہیں پہچانتا۔ یہ اسی کے کبوتر تھے۔ ان کے پیروں میں نیلے اور سفید رنگ کے چھلے اس نے بڑی چاہت سے ڈالے تھے۔ دیوانہ وار دوڑتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچ گیا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ دبلا پتلا آدمی بے چارہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ شمشاد نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''کیوں تو تو ہے۔''

''کک.....کون ہوں؟'' وہ شخص گھبرا کر بولا۔

''یہ کبوتر کہاں سے چرائے؟''

''کک.....کیا بکواس کرتے ہو؟ میں نے کب چرائے؟''

''چل بیٹا تھانے چل چھوڑوں گا نہیں قسم اللہ کی۔ چھوڑوں گا نہیں سیدھا تھانے چل۔''

''ارے.....ارے بنیان پھٹ جائے گا میرا۔ دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا؟''

''بیٹا یہ میرے کبوتر ہیں اور میں نے تھانے میں ان کی رپورٹ درج کرا رکھی ہے سمجھا چھوڑوں گا نہیں۔ کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔''

''ارے بھائی یہ تو میرے گھر کی منڈیر پر آ بیٹھے تھے میں نے پکڑ لیے آج بیچنے کے لیے نکلا ہوں۔''

''ہوں بیچنے کے لیے نکلا ہے۔ باپ کا مال ہے جو اس طرح بیچ دے گا۔ چلو بیٹا تھانے چلو شرافت سے ورنہ بلاتا ہوں ابھی پولیس والوں کو۔''

''سنو تو سہی بھائی بات تو سنو۔ کیوں جھگڑا ڈال رہے ہو، تمہارے ہیں تو تم لے لو، مم.....میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ خود میرے گھر کی منڈیر پر آ بیٹھے تھے اور پھر کبوتروں کی چوری تو جائز ہے۔''

''یہ تو پولیس والا بتائے گا تجھے کہ کون سی چوری جائز ہے اور کون سی ناجائز۔''

''تو دے تو رہا ہوں تمہیں لے لو اپنے کبوتر۔'' اس نے دونوں کبوتر شمشاد کے ہاتھ میں پکڑا دیئے اور شمشو نے کبوتروں کو پیار سے سینے سے لگا لیا۔ وہ آدمی جان چھڑا کر ایسے بھاگا

کہ پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ شمشو کو کبوتروں پر بے حد پیار آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نئی روشنی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دیر تک انہیں سینے سے لگائے کھڑا رہا اور پھر دفعتاً ہی اس کے دل میں درد سا ہونے لگا۔ ان کبوتروں کو کہاں لے جائے گا؟ گھر میں اس کے اپنے رہنے کی جگہ تنگ کر دی گئی ہے تو کبوتروں کو کہاں رکھے گا؟ کیا ابا اس کا موقع دیں گے کہ میں ایک نیا ڈربہ بناؤں؟ اور اس جوڑے کو اس میں بند کروں؟ ہائے کتنا پیارا جوڑا ہے۔ وہ غم اندوہ کے عالم میں کھڑا یہ سوچتا رہا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شیریں فرہاد ہم سب کا ٹھکانہ چھن چکا ہے۔ بلاوجہ میں نے تمہیں اس آدمی سے لے لیا۔" اسی وقت ایک آدمی شمشو کے قریب پہنچ گیا۔

"بیچ رہے ہو؟" شمشو نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے گردن ہلا دی۔

"کیا لو گے؟"

"جانتے ہو کون ہیں یہ شیریں اور فرہاد۔"

"ٹھیک ہے جو بھی ہیں کیا لو گے ان کا؟"

"تم کیا دو گے؟"

"بس پانچ دوں؟"

"اب پانچ روپے میں تو ان کے پیروں کے چھلے بھی نہیں آئیں گے اصلی لقہ ہیں ذرا دیکھ لو۔"

"پانچ روپے میں دینا ہے تو بات کرو ورنہ تمہاری مرضی۔" شمشو نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔ ان بے چاروں کو کہیں جگہ بھی تو نہیں دے سکتا' خود اپنا ٹھکانہ بھی تو چھن گیا ہے اگر پانچ روپے مل جائیں تو کیا برے ہیں۔ چنانچہ اس نے ہامی بھر دی اور دونوں کبوتر پانچ روپے کے عوض اس شخص کے حوالے کر دیئے۔ کافی دیر اس انداز میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ ایک نان بائی کے تندور پر جا کر نان اور سالن کھایا۔ قیمت ایک آنہ تھی۔ ایک آنہ میں فلم دیکھی۔ دو آنے خرچ ہو گئے اس کا وقت اتنا وقت گزر گیا کہ اب گھر

واپس جایا جا سکے۔ جیب میں چار روپے چودہ آنے موجود تھے۔ کل کے لیے کچھ پیسے بچا لینا ضروری تھا۔ سوچا کہ چار روپے ابا کے ہاتھ پر رکھ کر کل کا خرچ مانگ لے گا۔ ذہن میں یہ بھی سوچ لیا تھا کہ کیا کہنا ہے چنانچہ جب گھر کے دروازے تک پہنچے چہرہ ایسا بنا لیا جیسے دن بھر کی مشقت نے تھکا کر چور کر دیا ہو۔ نصرت بیگ گھر واپس آ چکے تھے اور شاید شمشو کے بارے میں ہی باتیں ہو رہی تھیں اسے دیکھ کر اماں کھل اٹھیں۔

"آ گیا۔" نصرت بیگ نے شمشو کو دیکھا اور شمشو مسکراتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے چار روپے نکال کر نصرت بیگ کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"ابا جی آج کی کمائی ہے۔"

"بیٹا دن میں کچھ کھایا یا نہیں؟"

"نہیں اماں غیرت جاگ گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ جب تک پیٹ بھوکا رہتا ہے انسان محنت کرتا ہے۔ یہ سوچ کر دن بھر بھوکا رہ کر محنت کی ہے۔"

"شاباش بیٹے اگر تمہارا جذبہ جاگ گیا ہے تو میں پیشن گوئی کرتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ کر کے ہی دم لو گے۔"

"ہاں ابا کچھ نہ کچھ کر کے ہی دم لوں گا۔" شمشاد نے کہا۔

"جلدی سے منہ ہاتھ دھو ڈال' کھانا نکالوں تیرے لیے۔ ہائے میرا بچہ دن بھر کا بھوکا ہے۔" بیگم نصرت باورچی خانے کی طرف دوڑیں اور اس سلسلے میں نصرت بیگ نے بھی کسی غلط رویئے کا اظہار نہیں کیا۔ بہر طور چار روپے میں شمشو کی خاطر مدارت ہونے لگی اور وہ اپنے کبوتروں کا انتہائی شکر گزار ہو گیا جنہوں نے اس کے پاس سے جاتے جاتے بھی اسے یہ عزت دلوا دی تھی۔ رات آرام سے گزر گئی مگر دوسری صبح نمودار ہوتے ہی شمشو کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ گھر والوں کو اب بری عادت پڑ گئی ہے اور یقینی طور پر وہ آج بھی پیسوں کا سوال کریں گے۔ ابا سخت ہو گئے تھے اور انہوں نے ہدایت کر دی تھی کہ جس دن وہ کچھ کما کر نہ لائے گھر میں داخل نہ ہو۔ عجیب مصیبت آ پڑی تھی۔ کل کا کام تو خیر پیارے کبوتروں نے کرا دیا لیکن آج کیا کیا جائے؟

نوشہ اور قمرو دونوں چلے گئے تھے۔ پڑوسی بھی منتشر ہو گئے تھے لیکن شاہ جہاں بیگم سناٹے میں تھیں۔ رونے سے دل کی بھڑاس نکل گئی تھی اور ایک دم ہی ذمہ داریوں کا احساس ہوا تھا۔ دو دشمن درپے آزار تھے اور انہوں نے جو کارروائی کر ڈالی تھی اب اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ پڑوسیوں کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ جو کچھ وہ دونوں کہہ رہے ہیں درست ہے۔ قمرو نہ جانے کس طرح نوشہ سے جا ملا اور نوشہ تو تھا ہی اس بازار کا انسان۔ جس میں غیرت وحمیت کا ہر تصور سو جاتا ہے اور انسان انسان نہیں رہتا۔ نوشہ میاں سے اگر انسانیت کی کوئی توقع کی جاتی تو حماقت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے ذرا مختلف انداز سے سوچا۔ ظاہر ہے نوشہ میاں کی کوششیں یہی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح شاہ جہاں بیگم کو کوٹھے تک لے جائیں اور اس لیے انہوں نے یہ چال چلی۔ رہا قمرو تو وہ بے غیرت ویسے ہی لڑکیوں کے چکر میں تھا۔ اب جو کچھ نہ ہو جاتا کم تھا۔

رات ہو چکی تھی اور اس کھولی میں چراغ بھی روشن نہیں ہوا تھا۔ وہ سب تاریکی میں تھے اور ان تاریکیوں کے خلاف جنگ کرنے کے فیصلے کر رہے تھے اور یہ فیصلہ سب سے پہلے شاہ جہاں بیگم نے کیا ان کی پرعزم آواز ابھری۔

''جو چھوٹا موٹا سامان سمیٹ سکتی ہو سمیٹ لو۔''

''کیا مطلب اماں؟'' ممتاز نے پوچھا۔

''جو کپڑے وپڑے ہیں انہیں پوٹلیوں میں باندھ لو جو کچھ بھی ہے اور جتنا تم لوگ یہاں سے لے جا سکتی ہو برتنوں وغیرہ پر بالکل توجہ نہیں دینا ہمیں چوروں کی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔''

''کب اماں؟'' نور جہاں نے پوچھا۔

''رات کچھ اور گہری ہو جائے۔'' شاہ جہاں بیگم کی پراسرار آواز گونجی۔

تینوں نے چوروں کی طرح اپنا سامان باندھا اور رات کے گہرا ہونے کا انتظار کرتی رہیں۔ کھولیوں میں کھانسی کی آوازیں ابھر رہی تھیں' ان میں بیمار بھی تھے' بھوکے بھی تھے چھوٹے چھوٹے بچے پوری خوراک نہ ملنے کی بناء پر راتوں کو گہری نیند نہیں سو پاتے تھے۔ بہر

طور شاہ جہاں بیگم وقت کا انتظار کرتی رہیں اور پھر چاروں طرف گہرا سناٹا چھانے کے بعد انہوں نے کھولی سے باہر قدم رکھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کے بعد تینوں لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ کسی نے بھی ان سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں؟ اور تینوں خاموشی سے ان کی رہنمائی میں آگے بڑھ گئی تھیں۔ بیرکوں سے نکلنے کے بعد سڑک پر پہنچیں تو ہو کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھی کوئی بس یا گاڑی گزر جاتی۔ تو سڑک پر روشنی اور زندگی کا احساس ہوتا۔ ورنہ تاحد نگاہ یہ ویرانی اور خاموشی تھی۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں پولیس والے انہیں چور نہ سمجھ لیں۔ لیکن ہر خطرہ مول لیا جا سکتا تھا شاہ جہاں بیگم کافی فاصلے پر بس اسٹاپ پر آ کھڑی ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بس آئی۔ تو وہ اس میں سوار ہو گئیں۔ بس میں بہت کم مسافر تھے اور عورتیں تو تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بہر طور شاہ جہاں بیگم لڑکیوں کے ساتھ شہر میں داخل ہو گئیں اور ایک طویل سفر کے بعد ایک بس اسٹاپ پر اتر گئیں۔ یہاں سے کافی فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد وہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک پرانی طرز کی عمارت کے سامنے پہنچ گئیں۔ یہ وہی عمارت تھی۔ جہاں وہ کام کرتی تھیں اور جہاں ایک نیک دل عورت رہتی تھی۔ جس نے شاہ جہاں بیگم کو ہر طرح کی آسانیاں فراہم کر دی تھیں۔ رات کے اس حصے میں اس عمارت میں داخل ہونا بھی ایک عجیب سی بات تھی۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار نے شاہ جہاں بیگم کو دیکھا۔ پہچانتا تھا اس لیے راستہ دے دیا تاہم حیرت سے بولا۔

''بی بی اس وقت کہاں؟''

''بیگم صاحبہ سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''وہ سو چکی ہوں گی۔''

''میں انہیں جگا لوں گی۔ تم فکر مت کرو رحیم بھیا' کوئی بات تم تک نہیں پہنچے گی۔''

''یہ کون ہیں؟''

''میری بیٹیاں ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ انہیں برآمدے میں چھوڑ دینا۔'' رحیم نے اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے کہا۔

بیگم صاحبہ کے کمرے میں مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ سوئی نہیں تھیں۔ شاہ جہاں بیگم نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی اور موسیقی کی آوازیں رک گئیں۔

"کون ہے؟" اندر سے بیگم صاحبہ کی آواز ابھری۔

"میں شاہ جہاں ہوں بیگم صاحبہ۔"

"ہیں۔" بیگم صاحبہ کسی قدر متحیرانہ انداز میں بولیں۔ لیکن انہوں نے شاہ جہاں بیگم کی آواز پہچان لی تھی چنانچہ دروازہ کھول دیا۔ شاہ جہاں بیگم کو دیکھا اور حیرانی سے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔

"تم اس وقت؟"

"جی بیگم صاحبہ۔" شاہ جہاں بیگم نے سرد لہجے میں کہا۔

"خیریت کوئی پریشانی ہے؟"

"جی بیگم صاحبہ۔"

"کیا بات ہے آؤ اندر آؤ بیٹھو۔" بیگم صاحبہ نے نرم آواز میں کہا اور شاہ جہاں بیگم ان کے کہے ہوئے اشارے پر ایک جگہ بیٹھ گئیں۔

"ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟ میں تو تمہیں اس وقت دیکھ کر پریشان ہو گئی ہوں اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ بہت پریشان نظر آتی ہو۔ جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟"

"ایک بپتا پڑی ہے۔ مجھ پر بیگم صاحبہ بپتا پڑی ہے بس یوں سمجھ لیں کہ......کہ......"

"میں بے سہارا ہو گئی ہوں۔ مجھ سے میرے رہنے کا سہارا چھن گیا ہے۔"

"تم تو بیرکوں میں رہتی تھی نا؟"

"جی بیگم صاحبہ جس بیرک میں میں رہتی تھی وہ کسی اور کی تھی اور اس نے پہلے سے اس پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ مجھے جعلی رسید دے دی گئی تھی اور وہاں قیام کے لیے کہہ دیا گیا تھا کئی دن سے یہ چکر چل رہا تھا کہ میں یہ بیرک خالی کر دوں اور میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ میں بیرک خالی کر دوں گی لیکن اس وقت وہ لوگ آ گئے اور انہوں نے کھڑے کھڑے ہمیں وہاں سے نکال دیا۔ میرے ساتھ میری تینوں بیٹیاں بھی ہیں ہمارے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں

یہ نہیں کہتی بیگم صاحبہ کہ آپ مجھ کو اور میری بیٹیوں کو خود پر مسلط کر لیں لیکن ہمیں دو چار دن کے لیے جگہ دے دیں تاکہ میں اپنے لیے کوئی ٹھکانہ تلاش کر لوں۔"

"ارے کہاں ہیں تمہاری بیٹیاں میں نے تو کئی بار تم سے کہا کہ انہیں کسی وقت لے کر آؤ مجھ سے ملاؤ۔"

"بس بیگم صاحبہ ابھی میری زندگی میں وہ خوشگوار لمحات نہیں پیدا ہو سکے کہ ملنے ملانے کا سلسلہ شروع کرتی۔ آپ ان لڑکیوں سے کیا ملنا پسند کرتیں جن کے جسموں پر پورے اور بہتر لباس بھی نہیں ہیں۔"

"وہ ہیں کہاں؟"

"باہر برآمدے میں بیٹھی ہیں۔"

"کیوں؟"

"بس اجنبی تھیں رحیم نے اس وقت مجھے آنے کی اجازت دے دی یہی اس کا احسان ہے لڑکیوں کیلیے اس نے کہا کہ انہیں برآمدے میں بٹھا دیا جائے۔"

"پاگل ہے وہ تو بہت ہی فرض شناس ہے۔ معافی چاہتی ہوں آؤ میرے ساتھ آؤ۔" بیگم صاحبہ نے کہا اور شاہ جہاں بیگم کا بازو پکڑ کر انہیں اٹھا دیا۔ پھر وہ باہر آئیں۔ تینوں لڑکیاں اداس اور خاموش بیٹھی ہوئی تھیں بیگم صاحبہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور پھر آگے بڑھتی ہوئی بولیں۔

"دیکھو بھئی قصور میرا نہیں ہے، تمہاری امی کا ہے جو کسی طور مجھے اپنا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ میں کئی مرتبہ تم سے ملنے کی بات کر چکی ہوں لیکن شاہ جہاں بیگم نے کبھی میری یہ درخواست قبول نہیں کی اور یہاں بٹھانے کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے مجھے اتنا بد اخلاق مت سمجھ لینا۔" تینوں نے سر اٹھا کر بیگم صاحبہ کو دیکھا بیگم صاحبہ نے تینوں سے ہاتھ ملائے اور پھر انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

"آؤ اندر آؤ۔ تم سے ملنے کی تو بڑی آرزو تھی مجھے۔"

تینوں خاموشی سے اندر داخل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی اپنی پوٹلیاں اٹھا لی تھیں۔

بیگم صاحبہ نے اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ پوٹلیاں ان کے ہاتھ سے لے لیں اور انہیں آرام سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔

''اب اپنے اپنے نام بھی بتا دو۔''

''جی میرا نام نور جہاں ہے۔''

''میرا سلطانہ۔''

''اور میں ممتاز ہوں۔'' ممتاز نے کہا۔

''واہ شاہ جہاں بیگم اتنی پیاری پیاری بچیاں ہیں آپ کی اور آپ نے کبھی مجھے ان سے نہیں ملایا۔ مجھے آپ سے شکایت ہی رہے گی اچھا بھئی لڑکیو بات دراصل یہ ہے کہ شاہ جہاں بیگم نے ساری کہانی مجھے سنا دی ہے۔ ہم لعنت بھیجتے ہیں اس بیرک پر جہاں اس قسم کی بدتمیزی کی گئی تم لوگوں کے ساتھ یعنی تمہیں بیرک سے بے دخل کر دیا گیا۔ ہم تمہارے لیے کوئی بہت اچھی جگہ تو دریافت نہیں کر سکتے۔ آج تمہارے سونے کا بندوبست یہیں کر دیا جاتا ہے اور کل اس کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایسی جگہ بنی ہوئی ہے جو تمہارے لیے انتہائی موزوں رہے گی۔ بے شک اس کا تعلق کوٹھی سے نہیں ہے لیکن تم وہاں سکون محسوس کرو گی باہر کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ جگہ کیا خیال ہے؟''

''بیگم صاحبہ اگر آپ ہمیں صرف ایک گوشہ بھی دے دیں گی تو ہم وہیں وقت گزار لیں گے۔''

''مجھے خوشی ہے شاہ جہاں بیگم کہ تم نے فوراً ہی یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا اگر اس سلسلے میں تکلف کرتیں تو میں تم سے ناراض ہو جاتی۔ سنو لڑکیو اب تم لوگ سونے کا بندوبست کرو۔ میں تمہیں ایک کمرہ دکھائے دیتی ہوں وہاں سو جاؤ اور کل تمہیں تمہاری آرام گاہ تک پہنچا دیا جائے گا۔'' کمرہ بہت شاندار تھا اور یہاں بستر پڑے ہوئے تھے لیکن شاہ جہاں بیگم نے یہ بستر استعمال نہ کیے۔ انہوں نے فرش پر ہی ڈیرہ جما دیا تھا جس کا علم بیگم صاحبہ کو نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ ان اعلیٰ درجے کے بستروں پر ایک رات گزارنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بیگم صاحبہ آج معمول سے کچھ پہلے ہی جاگ گئیں اور انہوں نے سیدھا اس کمرے کا رخ کیا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ تمام لوگ فرش پر سو رہے تھے۔ بہرطور انہوں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح ساڑھے سات بجے شاہ جہاں بیگم کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ اتنی دیر تک سونا مناسب نہیں تھا۔ بہرطور نئی جگہ تھی۔ بیگم صاحبہ کا مزاج یقیناً بہت اچھا تھا۔ لیکن انہیں رکھ رکھاؤ رکھنا تھا ورنہ یہاں سے بھی نکال دیا جاتا۔ لڑکیاں گہری نیند سو رہی تھیں۔ انہیں جگایا اور فوراً ہی سامان سمیٹ لیا گیا۔ اس کے بعد وہ سب باہر نکل آئے۔ ممتاز اور نور جہاں جلدی جلدی کمروں کی طرف گئیں اور صفائی ستھرائی کرنے لگیں۔ بیگم صاحبہ کے ہاں ایک دو اور بھی ملازم تھے جو اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ بیگم صاحبہ غالباً کچن میں تھیں شاہ جہاں بیگم انہیں تلاش کرتی ہوئی کچن کی جانب نکل گئیں اور وہاں انہیں کام کرتے دیکھ کر جلدی سے بولیں۔

''معافی چاہتی ہوں بیگم صاحبہ صبح جاگنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ کل سے ایسا نہیں ہو گا مگر آپ یہاں......؟''

''وہ وہاں تمہیں تو علم ہی ہے کچن میں کام کرنے والی چھٹی پر چلی گئی ہے اور پتا نہیں کتنے دنوں میں آئے۔ میں نے کہا تو ہے کہ کوئی اچھا باورچی یا باورچن مل جائے تو میرے پاس بھجوا دیا جائے لیکن ابھی کچھ وقت لگے گا۔''

''میں جو ہوں بیگم صاحبہ میں کرتی ہی کیا ہوں۔ یہاں آپ اطمینان رکھئے کچن کا سارا کام سنبھال لوں گی۔''

''ہوں اگر تم کچن کا کام سنبھال لو گی شاہ جہاں بیگم تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کسی دوسری عورت کو رکھنے کی۔ میں تمہیں اس کی تنخواہ بھی دوں گی۔''

''بیگم صاحبہ جو آپ دے رہی ہیں وہ کافی ہے۔ آپ اطمینان رکھیے کسی اور کو رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کو مطمئن کر دوں گی۔''

''ارے تم سے تو بہت مطمئن ہوں شاہ جہاں بیگم۔''

''بیگم صاحبہ دونوں بچیاں ہیں۔ وہ بھی گھر کے سارے کام کاج کر لیا کریں گی۔ آپ کو گھریلو طور پر کوئی دقت نہیں ہو گی۔''

"ہوں ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے بھئی دیکھا جائیگا۔ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ بچیوں نے غسل وغیرہ کرلیا؟"

"جی بیگم صاحبہ۔"

"سنو شاہ جہاں بیگم' اچھا چھوڑو میں خود ہی لڑکیوں سے بات کر لیتی ہوں۔ چلو تم ناشتے کی تیاریاں کرو' میرے خیال میں فریج میں سارا سامان موجود ہے تمہیں دقت نہیں ہوگی۔ سب لوگوں کے لیے ناشتہ تیار کرنا سمجھیں۔ یہ میرا حکم ہے۔" بیگم صاحبہ کو اندازہ تھا کہ شاہ جہاں بیگم رات کو بستروں پر نہیں سوئیں چنانچہ وہ ناشتہ کی تیاری میں بھی بخل سے کام لیں گی۔ اس کے بعد وہ لڑکیوں کے پاس پہنچ گئیں نور جہاں اور ممتاز تیزی سے صفائی کرنے میں مصروف تھیں اور سلطانہ ان سے جھگڑ رہی تھی کہ کچھ کام اسے بھی کرنے دیا جائے بیگم صاحبہ ان کے سامنے پہنچ گئیں اور انہوں نے کہا۔

"ارے یہ تم نے کیا شروع کر دیا؟"

"کک...... کیا ہو گیا بیگم صاحبہ؟ مم...... معافی چاہتی ہوں۔" ممتاز سہم کر بولی۔

"پگلی لڑکیوں آج تو تم ہماری مہمان ہو کل سے اگر کچھ ذمہ داریاں سنبھالنا چاہو تو تمہیں نہیں روکا جائے گا لیکن آج کچھ مت کرو۔"

"نہیں بیگم صاحبہ ہمیں کام کر کے خوشی ہو گی۔" ممتاز نے کہا۔

"اچھا تم یہ صفائی ستھرائی کر کے فوراً نہاؤ اور کپڑے ہیں تمہارے پاس یا میں تمہیں دوں؟"

"نہیں بیگم صاحبہ کپڑے ہیں۔" ممتاز نے کہا۔

"آؤ تم میرے ساتھ آؤ سلطانہ ذرا کچھ باتیں کریں گے نہانا چاہتی ہو؟"

"نہالوں گی بیگم صاحبہ دوپہر کو نہالوں گی۔" سلطانہ نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔" وہ اسے ساتھ لیے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل پڑیں۔ جاتے ہوئے وہ نور جہاں اور ممتاز سے کہہ گئی تھیں کہ شاہ جہاں بیگم ناشتہ تیار کر لیں تو ان دونوں کو کمرے میں اطلاع دے دی جائے۔ وہ سلطانہ کو لیے ہوئے کمرے میں آ گئیں۔

سلطانہ چند لمحات تو الجھی الجھی سی رہی اور اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ تمام صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنا تھا اور شاہ جہاں بیگم کے الفاظ کو ذہن میں رکھنا تھا۔ بیگم صاحبہ نے سلطانہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر آہستہ سے بولیں۔

"دونوں بہنیں تم سے بہت محبت کرتی ہیں شاید؟"

"جی بیگم صاحبہ۔" سلطانہ نے صاف لہجے میں کہا۔

"وہ تمہیں کام بھی نہیں کرنے دے رہی تھیں۔"

"جی اس کی ایک وجہ ہے۔" سلطانہ آہستہ سے بولی۔

"کیا وجہ ہے؟" بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا۔

"میری کیفیت درست نہیں ہے۔ میں...... میں......" سلطانہ کی آواز ہچکچاہٹ میں تبدیل ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اس پر غور کیا اور ایک لمحے میں ان کی سمجھ میں آ گیا۔ انہوں نے متحیرانہ نگاہوں سے سلطانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کک...... کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"جی ہو گئی تھی۔"

"تو پھر تمہارا شوہر؟" بیگم صاحبہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا اور سلطانہ نے گردن جھکا لی پھر کسی قدر مغموم انداز میں بولی۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"اوہ میرے خدا...... اوہ۔" بیگم صاحبہ کی آواز غم و اندوہ میں ڈوب ہو گئی۔ سلطانہ کو علم تھا کہ شاہ جہاں بیگم اپنے شناساؤں میں یہی سب کچھ کہہ رہی ہیں۔ رقیہ بیگم صاحبہ سے بھی انہوں نے یہی کہا تھا چنانچہ سلطانہ نے بھی وہی الفاظ اپنا لیے تھے۔ اچانک ہی بیگم صاحبہ پر دکھ کا دورہ پڑا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ سلطانہ سے اور کوئی بات نہ کر سکیں اور تھوڑی دیر بعد نور جہاں نے آ کر اطلاع دی کہ ناشتہ تیار ہے اور کمرے میں لگا دیا گیا ہے۔

"اب باورچی خانے کی ذمہ داری تو تم نے سنبھال ہی لی ہے اور تم جانتی ہو کہ کتنے آدمیوں کا کھانا پکانا ہے' ممتاز اور نور جہاں سے میری درخواست ہے کہ وہ گھر کے چھوٹے

موٹے کام سنبھال لیں۔ ملازم باہر کے کام کریں گے۔ یوں سمجھیے کہ گھر کی ذمہ داریاں میں نے آپ لوگوں کو سونپی ہیں اور سلطانہ جب تک تمہاری کیفیت بہتر نہیں ہو جاتی تمہیں صرف آرام کرنا ہے۔ اب تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں وہ جگہ دکھادوں' جہاں میں نے تمہارے رہنے کا بندوبست کیا ہے یہ جگہ اس کوٹھی کے عقبی حصے میں ایک بہت بڑے کمرے کی شکل میں تھی جسے خالی جگہ میں دیواریں اٹھا کر بنا دیا گیا تھا۔ اوپر سیمنٹ کی شیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ ملحقہ غسل خانہ بھی تھا۔ جس میں پانی وغیرہ کا معقول انتظام تھا۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔

''یہاں میں تم چاروں کے لیے بستروں کا بندوبست کردوں گی بس سمجھ لو یہ جگہ تمہارے لیے رین بسیرے کے طور پر استعمال ہوگی۔ باقی دن تو کوٹھی ہی میں گزرے گا۔''

''بہت عمدہ ہے بیگم صاحبہ ہماری پسند کے عین مطابق۔'' شاہ جہاں بیگم نے شکرگزار نگاہوں سے بیگم صاحبہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں انہیں اس وقت بیگم ارباب یاد آ گئی تھیں۔ جنہوں نے بڑی محبت سے انہیں انیکسی تک پہنچایا تھا اور اس کے بعد ان کی تمام محبتیں سمٹ گئی تھیں۔ اتنے بڑے لوگوں کے بارے میں شاہ جہاں بیگم کا تجربہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ ان کے دل میں ایک لمحے کے لیے یہ احساس پیدا ہوا تھا کہ نہ جانے یہ جگہ کتنے عرصے کے لیے ان کے لیے ان کے پاس ہے۔ تقدیر کے پے در پے واقعات سے وہ کچھ دل برداشتہ سی ہو گئی تھیں۔ تین ساڑھے تین بجے کے قریب شاہ جہاں بیگم' بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئیں بیگم صاحبہ نے انہیں بلایا تھا۔

''بیٹھو شاہ جہاں تھوڑی دیر بعد گھر کے کام شروع ہو جائیں گے۔ تم سے کچھ اور باتیں بھی کرنا تھیں۔''

''جی بیگم صاحبہ۔''

''سلطانہ سے میری مختصر سی گفتگو ہوئی تھی۔ بے چاری بچی پر صدمے کا جو پہاڑ ٹوٹا ہے اس کے بارے میں الفاظ میں کچھ کہنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ مجھے بہت رنج ہوا ہے۔ کتنا وقت باقی رہ گیا ہے اس کا؟''

''جی بیگم صاحبہ دو ڈھائی مہینے ہیں۔''

''ہوں کچھ انتظام کیا ہے؟''

''جی ہاں بیرکوں میں رہتی تھی۔ وہیں کے ایک ہسپتال میں نام لکھوا دیا ہے میں نے۔''

''نہیں بھئی اس کی ذمہ داری تم میرے اوپر چھوڑ دو۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور کسی بہتر جگہ اس کے بارے میں بات چیت کرلوں گی۔''

''بیگم صاحبہ......؟''

''یہ کوئی احسان نہیں ہوگا تمہارے اوپر۔ ظاہر ہے یہ ایک اہم ضرورت ہے جسے ٹالا نہیں جاسکتا۔'' بیگم صاحبہ نے جواب دیا اور شاہ جہاں بیگم نے گردن خم کر دی۔ دوسرے ہی دن بیگم صاحبہ سلطانہ کو اپنے ساتھ ایک عمدہ سے پرائیویٹ ہسپتال میں لے گئیں۔ جہاں ان کی شاید کوئی شناسا ڈاکٹر بھی تھی۔ انہوں نے تمام انتظامات کیے۔ سلطانہ کا چیک اپ کیا گیا اور ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ بالکل بہتر حالت میں ہے اور کسی قسم کی کوئی الجھن کی بات نہیں ہے۔ باقی سارے انتظامات بیگم صاحبہ نے کر دیئے تھے اور یوں ان لوگوں کو ایک بار پھر بہتر زندگی نصیب ہو گئی تھی۔

بیگم صاحبہ کے پاس کوئی کمی تھی۔ نہ کھانے کی' نہ پینے کی۔ رہنے کے لیے ان کے مشاغل بیگم ارباب جیسے نہیں تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ تصور ذہن سے نکل گیا کہ یہاں انہیں کوئی الجھن پیش آ سکتی ہے۔ کمبخت نوشہ اور قمرو نے اپنے طور پر برائی کی تھی لیکن بعض اوقات بعض برائیاں بھلائی بن جاتی ہیں یہاں کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں تھا کہ باہر نکلنا ہو اور کسی طرح نوشہ میاں سے مڈبھیڑ ہو جائے شاہ جہاں بیگم کو رفتہ رفتہ وقت پر کچھ اعتماد سا ہونے لگا تھا۔ تاہم جب بھی کبھی تنہائیوں میں بستر پر لیٹتیں تو سوچتیں کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کوئی مرد ہوتا۔ کوئی تو سہارا ہوتا۔ کسی کے سہارے تو آگے زندگی بڑھانے کا فیصلہ کر پاتیں لیکن ابھی اس سلسلے میں کوئی بات ذہن میں نہیں آ پا رہی تھی پھر سلطانہ کی طبیعت خراب ہوئی اور اسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا شاہ جہاں بیگم امید و بیم کی کیفیت میں تھیں۔ بیٹی کے بارے میں سنا تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئیں۔ لیکن سلطانہ پر کوئی اظہار نہیں

ہونے دیا تھا۔البتہ بیگم فرخ شیخ بہت خوش تھیں اور بچی کو دیکھ کر پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ان کے انداز میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھیں۔غالباً اولاد سے محرومی نے انہیں زیادہ متوجہ کیا تھا۔سلطانہ نے بچی کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ذہن میں نہ جانے کیا کیا احساسات جاگزیں تھے۔یہ بچی جو اس دنیا میں آئی تھی۔ان سب لوگوں سے زیادہ بدنصیب تھی کیونکہ اس کے نام کے ساتھ ایسی ایک کیفیت وابستہ تھی جو کبھی منظر عام پر آئی تو یہ کبھی باعزت نہیں ہوسکتی تھی لیکن سلطانہ نے اس سلسلے میں اپنے دل میں کچھ فیصلے کیے تھے۔ شاہ جہاں بیگم سے ملاقات ہوئی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''امی میرا خیال ہے تقدیر میں کسی مرد کا سہارا ہے ہی نہیں۔قدرت ہمیں بتانا چاہتی ہے کہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اپنے سہارے پر کرنا ہے۔''

''میں تم سے اپنی کالی تقدیر کا تذکرہ کر چکی ہوں سلطانہ' بدنصیبی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو ہم سے وابستہ کر لیا ہے اس کا نتیجہ دیکھ لو۔''

''نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں اس بچی کی پیدائش سے بددل ہوں؟ نہیں امی میرے دل میں تو ایک اور عزم بیدار ہوگیا ہے۔ہوسکتا ہے اگر میرے ہاں بیٹا پیدا ہوتا تو میں اس سوچ میں گرفتار ہو جاتی کہ اب میرے مستقبل کا سہارا بن گیا ہے اور مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کی آمد نے تو میرے اندر ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔نئی روح پھونکی ہے۔ہمارے وجود میں اور ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہمیں اپنے ہی بل پر سب کچھ کرنا ہے۔ہمیں دوسرے سہارے کبھی نہیں ملیں گے۔''

''کاش تم اپنی تقدیر مجھ سے وابستہ نہ کرتیں دیکھ لو بے سہارا لوگوں میں ایک اور بے سہارا کا اضافہ ہوگیا ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی؟ کچھ بھی ہو جائے ہم لوگ اس کا بہترین سہارا بنیں گے۔وقت ہمیشہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے۔ہمیں یہ سوچنے کا حق نہیں ہے کہ اس کی آمد سے ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا ہوئی ہے۔''

''خدا نہ کرے بیٹی ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں یہ تصور نہیں ہے۔''

بیگم صاحبہ اس کام میں خوشی خوشی حصہ لے رہی تھیں۔بالآخر وہ سلطانہ کو ہسپتال سے چھٹی دلا کر گھر لے گئیں اور وہاں اس کی ناز برداریاں شروع ہوگئیں۔سب لوگ خوش تھے اور بہ ظاہر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب وقت اور کوئی بھیانک کہانی نہیں سنائے گا لیکن وہ وقت ہی کیا جو کہانیوں میں تبدیلیاں نہ پیدا کرتا رہے یہ تو وقت کا اصول ہے۔یوں لگتا تھا جیسے ان بے سہارا لوگوں کو سکون کی زندگی مل گئی ہے۔بیگم صاحبہ بچی میں زبردست دلچسپی لے رہی تھیں۔انہوں نے اس کا نام کرن رکھا تھا۔یہ نام رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''تم لوگ اس کا جو بھی نام رکھو میں تو اسے کرن ہی کہوں گی۔''

''بہت خوبصورت نام ہے بیگم صاحبہ۔'' سلطانہ نے کہا۔

''کرن کے سارے اخراجات میں اٹھاؤں گی یہ نہ سمجھنا سلطانہ کہ میں تمہاری بچی پر قبضہ کرنا چاہتی ہوں۔بس میں ان معصوم قلقاریوں کے لیے ترسی ہوئی ہوں' اور......'' بیگم صاحبہ آبدیدہ ہوگئیں۔

''کرن آپ کی ہے بیگم صاحبہ۔'' سلطانہ نے اپنائیت سے کہا۔

◈◈◈

اب تو صبح کی روشنی بھی آنکھوں کو کھٹکنے لگی تھی۔صبح ہوتی تو فوراً ہی یہ خیال دامنگیر ہو جاتا کہ اب دھندے پر نکلنا ہے۔نصرت بیگ بہت سخت ہوگئے تھے۔شمشو کا خیال تھا کہ یہ کاروبار پائیدار نہیں ہے اور کسی دن اچھی خاصی مرمت ہو جائے گی۔یہ خدشہ بھی تھا کہ کسی دن کسی ایسے بس کنڈیکٹر سے سوال کر بیٹھے جو پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا تو بس اس دن سارا حساب کتاب درست ہو جائے گا۔ہر چند کہ نئی نئی جگہ تلاش کرتے تھے اور پورا پورا خیال رکھتے تھے کہ کسی پرانے شکار سے کچھ نہ وصول کیا جائے لیکن کبھی بھول چوک ہو بھی سکتی تھی اور اس بات سے وہ کافی خوفزدہ رہتے تھے۔وہی ہوا بھی جو سوچا تھا وہ سامنے آ گیا حالانکہ بالکل مختلف روٹ کی بس میں چڑھے تھے ہمیشہ ہی ایسا کیا کرتے تھے لیکن جب انہوں نے کنڈیکٹر سے دو پیسے کے ٹکٹ کے بعد باقی پیسے واپس مانگے تو کنڈیکٹر نے اسے پہچان کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔

"تیری تو میں تلاش میں تھا بیٹا۔"

"ابے...... ابے کیا کرتے ہو بھائی قمیض پپھ...... پھٹ جائے گی۔ دم...... دم گھٹ رہا ہے۔" دوسرے لوگ صورت حال جاننے کے لیے کنڈیکٹر کے گرد جمع ہو گئے۔

"بس جی کیا بتائیں کیسے کیسے سالے جیب کترے ان سڑکوں پر پھرتے رہتے ہیں۔ نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں لوگوں نے' اس آدمی کو دیکھو اس دن مجھ سے چودہ آنے لے گیا تھا۔ بھیڑ میں کہتے ہیں کہ ہم نے ایک کا نوٹ دیا ہے۔ پانچ کا نوٹ دیا ہے اور ہم جلد بازی میں دے دیتے ہیں۔ صاحب دو دفعہ دھوکا کھا چکا ہوں ان جیسے لوگوں سے اور پچھلی بار ابھی چند ہی روز پہلے کی بات ہے کہ اس آدمی نے مجھ سے چودہ آنے لیے تھے جب کہ دیا کچھ بھی نہیں تھا اس نے آج یہ پھر مجھے مل گیا ہے۔ نکال بیٹا چودہ آنے ورنہ یہیں چٹنی بنا دوں گا۔ چلتی بس سے پھینک دوں گا۔"

"کک...... کیا بکواس کر رہے ہو۔ دماغ خراب ہے تمہارا۔" شمشو نے اکڑنے کی کوشش کی لیکن کنڈیکٹر کچھ زیادہ ہی سر پھرا آدمی تھا۔ اس نے شمشو کے ایک ہاتھ جڑ دیا اور شمشو دہائی دینے لگا۔ لوگوں نے شمشو کا گریبان چھڑایا اور پھر بولے۔

"تم نے اس وقت کتنے کا نوٹ دیا ہے؟"

"پپ...... پانچ روپے کا جی۔"

"نوٹ پہچان سکتے ہو؟"

"نوٹ تو قسم اللہ کی سب ایک سے ہوتے ہیں۔ مم...... مگر آپ دیکھ رہے ہیں یہ کیسی زیادتی کر رہا ہے میرے ساتھ؟"

"ایسے نہیں مانے گا تو......" کنڈیکٹر نے ایک بار پھر شمشو کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور فٹ بورڈ تک لے آیا۔

"ٹھٹ۔ ٹھہرو تو سہی دھکا دو گے تو پپ...... پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔" شمشو کی بری حالت ہو رہی تھی۔ لوگ مشتبہ نگاہوں سے شمشو کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہو گئی تھی شمشو کی۔ اسی وقت بس ایک سٹاپ پر رکی اور کنڈیکٹر نے زور سے شمشو کو نیچے دھکا دے

دیا۔ گرتے گرتے بچے تھے۔ دوسری سواریاں اوپر چڑھنے لگی تھیں اور شمشو ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو برا بھلا کہتے رہ گئے۔ حالت خراب ہو گئی تھی۔ بال بکھر گئے تھے گریبان مسک گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ملامت آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھا کسی نے کہا۔

"جیب کترا معلوم ہوتا ہے۔"

"مگر ایسے لوگوں کو چھوڑنا تو مناسب نہیں ہے اگر اس نے جیب کاٹی ہے تو اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔"

"کیا معلوم جیب کاٹی بھی تھی یا کوئی اور جھگڑا ہو گیا تھا۔ کیوں میاں کیا بات تھی؟"

"پولیس کے حوالے کر دو مجھے' باپ کا راج ہے نا تمہارے۔" شمشو نے غصیلے لہجے میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک جانب چل پڑا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ابا جان تھوڑی سی رعایت کر دیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اچھی خاصی بے عزتی ہو گئی تھی۔ دل میں عجیب عجیب احساسات ابھر رہے تھے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس گھر پر لعنت ہی بھیج دی جائے جہاں تمام حقوق سلب ہو گئے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ آج ہی اماں سے بات کروں گا اور کہوں گا کہ خدا حافظ میں ایسی جگہ نہیں رہ سکتا جہاں عزت محفوظ نہ ہو۔ ابے ہاں کوئی نوکری لگا دی ہے میری گورنری دلا دی ہے مجھے کہ روزانہ پیسے لے جا کر دوں گا۔" ایک سنسان علاقہ تھا۔ سامنے ہی قبرستان پھیلا ہوا تھا۔

چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ پھر ایک قبر کے کتبے پر ایک کبوتر بیٹھا نظر آیا۔ سفید رنگ کا کبوتر تھا۔ کبوتر کو دیکھ کر سب کچھ بھول گئے اور ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی پھر دل میں خیال آیا کہ کبوتر اگر ہاتھ آ جائے تو آج کی دھاڑی اسی سے نکل آئے گی چنانچہ دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ کبوتروں کو پکڑنے کا فن جانتے تھے چنانچہ بے پروائی سے پہلے دوسری جانب چلے پھر تھوڑے سے ادھر ہٹے اور فاصلہ آہستہ آہستہ کم کرنے لگے۔ یہاں تک کہ قبر کے نزدیک پہنچ گئے اور پھر ایک دم کبوتر پر جھپٹا مارا لیکن کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ گیا اور شمشاد بیگ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ بدقسمتی سے دوسری طرف کی قبر زمین میں دھنس گئی تھی اور پوری کی

پوری کھلی ہوئی تھی۔ چنانچہ غڑاپ سے اس میں جا پڑے۔ قبر سے ایک دلخراش چیخ بلند ہوگئی اور پھر دوسری چیخ خود شمشو کی تھی جو دہشت سے چیخے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ کسی کے اوپر گر پڑے ہوں قبر میں جو کوئی بھی تھا اس نے پوری قوت سے شمشو کو اٹھا کر باہر پھینک دیا اور شمشو میاں کے حلق سے ڈری ڈری چیخیں نکلنے لگیں۔ قبر میں سے ایک شخص نکل کر کھڑا ہو گیا تھا اور شمشو کا دل شدت خوف سے بند ہوا جا رہا تھا۔ عجیب و غریب شکل و صورت کا آدمی تھا۔ بکھری ہوئی داڑھی' الجھے ہوئے بال' پورے لباس میں ملبوس تھا اور اچھا خاصا تندمند آدمی تھا۔ شمشو کا پورا بدن تھر تھر کانپنے لگا قبر سے نکلنے والا اسے خونی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ بہ مشکل تمام شمشاد بیگ کے حلق سے آواز نکل سکی۔

''مم......معاف کر دینا......مم......مردے بھائی مم......معاف کر دینا......غغ...... غلطی ہوگئی۔ مم......میں تو کبوتر پکڑ رہا تھا۔ قسم اللہ کی ادھر اس قبر پر بیٹھا ہوا تھا تت......تم یہ ......یہ تمہاری قبر ہے۔'' ارے باپ رے شمشاد بیگ کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔

''ہوش میں آؤ انسان بنو میں مردہ نہیں ہوں' میرا نام پروفیسر حشمت اللہ ہے سمجھے' پروفیسر حشمت اللہ داگریٹ سائنٹسٹ۔''

''کک......کیا؟ شمشو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''سائنٹسٹ سائنسدان سمجھتے ہو؟''

''جج......جی......جی سمجھتا ہوں۔''

''تو میں سائنسدان ہوں اور اس قبر میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔''

''کک......کیا؟ کفن......کفن چرا رہے تھے؟'' شمشاد بیگ نے سوال کیا۔

''بکواس مت کرو ورنہ تھپڑ مار دوں گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں سائنس دان ہوں۔''

''اوہو اچھا......اچھا تو سائنسدان قبروں میں رہتے ہیں۔ مم......میرا مطلب ہے قبریں کھنگالتے ہیں۔ مگر کیوں؟'' شمشاد بیگ نے سوال کیا۔ معمر شخص نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ شمشاد بیگ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ شمشاد بیگ کو اس کی طاقت کا اندازہ ہو رہا

تھا۔ غیر معمولی طور پر طاقت ور آدمی تھا۔ شمشاد بیگ کی کلائی اس طرح پکڑی ہوئی تھی جیسے پولیس والے چور کو پکڑ لیتے ہیں۔ بہرطور شمشاد بیگ اس کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ قبرستان سے نکل آئے۔ قبرستان کے دروازے پر کھڑے ہو کر سائنسدان نے کہا۔

''دیکھو میرے لباس میں کہیں مٹی تو نہیں لگی ہوئی ہے؟'' شمشاد بیگ اس کے لباس کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک دو جگہ سے مٹی جھاڑ دی اور بولا۔

''اب ٹھیک ہے۔''

''چائے پیو گے؟''

جج......جی......جی......'' شمشو آہستہ سے بولا سائنسدان اس کے ساتھ ایک سمت بڑھ گیا۔ کافی فاصلے پر ایک ہوٹل نظر آیا اور سائنسدان اس ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ شمشو کے قدم ٹھٹکے تو اس نے کہا۔

''آ جاؤ اندر آ جاؤ۔'' اور شمشاد بیگ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد سائنسدان واش بیسن کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں اس نے ہاتھ دھوئے پھر منہ دھویا اور چہرہ تولیہ سے خشک کرتا ہوا شمشاد بیگ کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے ویٹر کو چائے کے لیے کہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی سی ٹرے میں چائے آ گئی۔ سائنسدان خود ہی چائے بنانے لگا تھا۔ اس نے شمشاد بیگ سے کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''شمشو......شمشو۔''

''پورا نام؟''

''شمشاد بیگ ولد نصرت بیگ۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''قق......قربت نگر میں۔'' شمشو نے جواب دیا اور سائنسدان چونک پڑا۔

''قربت نگر میں؟''

''کون سے مکان میں رہتے ہو؟''

"دو بٹہ سترہ میں جی۔"

"او ہو اچھا' اچھا میں قربت نگر ہی میں رہتا ہوں مگر میرا مکان نمبر چار سو بیس ہے۔ قربت نگر کے بالکل آخری سرے پر میرا بہت بڑا گھر ہے۔"

"اچھا جی آپ بھی قربت نگر کے رہنے والے ہیں؟"

"ہاں تم نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔ بہت کم گھر سے باہر نکلتا ہوں۔ میرے بھتیجے کبیر اللہ کو جانتے ہو؟"

"بہت عرصہ ہو گیا جی۔"

"تمہارے باپ' کیا نام بتایا تھا تم نے ان کا؟"

"نصرت بیگ۔"

"ہاں نصرت بیگ کیا کرتے ہیں؟"

"بس جی ایسے ہی کچھ چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں۔"

"تم کہہ رہے تھے کہ وہ بہت سخت مزاج ہیں؟"

"بس جی اللہ اس سے تو انسان کو بغیر باپ کا رکھے یا اگر باپ دے تو کم از کم ایسا باپ نہ ملے۔ زندگی عذاب کر دی میری۔"

"چائے پیو...... چائے پیو۔" شمشو نے اپنی پیالی اٹھا کر سامنے رکھ دی تھی۔ کافی دیر تک خاموشی رہی۔ حشمت اللہ اس دوران شمشو کا چہرہ دیکھتا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں پھیلتی رہی تھی۔

"کام جانتے ہو؟" اس نے سوال کیا اور شمشو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"جانتا ہوں۔"

"کیا جانتے ہو؟"

"بس جی کبوتر اڑا لیتا ہوں۔ پالیاں لڑا لیتا ہوں۔ کبوتروں کی پہچان میں مجھ سے اچھا کوئی نہیں مل سکتا آپ کو اور...... اور جو بھی کام ہو۔" شمشو نے ایسے کہا جیسے باقی کام ضمنی حیثیت رکھتے ہوں۔ پروفیسر حشمت اللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے

گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بڑے اہم کام جانتے ہو صاحبزادے نوکری کرو گے؟"

"جی؟"

"تو پھر ٹھیک ہے چائے پینے کے بعد اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔"

"مجھے کیا عہدہ دیا ہے آپ نے؟"

"پرائیویٹ سیکریٹری' لیب اسسٹنٹ۔"

"یہ لیب اسسٹنٹ اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سیکریٹری تو ٹھیک ہے ہوتا ہے۔ فلموں میں بھی دیکھا ہے مم...... مگر لیب اسس...... سس...... اٹنٹ۔"

"اسسٹنٹ۔"

"جی جی وہی۔"

"میں نے کہا ناں ساری باتیں اسی ہوٹل میں بیٹھ کر معلوم کر لو گے یا بعد کے لیے بھی کچھ چھوڑو گے۔"

"چھوڑ دیا جی قسم اللہ کی چھوڑ دیا۔"

شمشو کو تو یہ ایک نعمت مل گئی تھی۔ اگر یہ آدمی سچا ہے تو عیش ہی عیش' شمشو کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور اس کا سینہ خوشی اور مسرت سے پھول گیا تھا۔ اب اکڑ کر گھر میں داخل ہو سکے گا اور ابا جان سے بات کر سکے گا۔ اب دیکھوں گا کیسے چارپائی سے باندھ کر مارتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر حشمت اللہ چائے کا بل ادا کر کے اٹھ گئے۔

شمشو ان کے ساتھ ساتھ چل پڑا تھا۔ پروفیسر حشمت اللہ کافی فاصلہ پیدل طے کر کے بالآخر قربت نگر میں آخری سرے پر پہنچ گئے اور یہاں ان کا گھر دیکھ کر شمشو نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ اسامی تگڑی ہے۔ ہو سکتا ہے جو کچھ کہا وہ مذاق نہ ہو۔

◇◇◇

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ کرن بیگم فرخ کی آغوش میں پرورش پانے

لگی۔ اس کے زیادہ تر معاملات بیگم صاحبہ نے ہی سنبھال لیے تھے۔ تقدیر نے اپنا کھیل دکھانے میں زیادہ وقت نہ لیا۔ ایک شام اچانک ایک بڑی بگھی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی اور اس میں سے ایک خوش قامت اور معمر شخص نیچے اترا۔ ملازم دوڑ پڑے اور تھوڑی دیر میں اطلاع ملی کہ طاہر علی شیخ آ گئے ہیں۔ بیگم فرخ شیخ دوڑی ہوئی باہر نکل آئی تھیں اور انہوں نے پر تپاک انداز میں شوہر کا خیر مقدم کیا تھا۔ طاہر علی شیخ اور بیگم صاحبہ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟ اس کا تو شاہ جہاں بیگم کو اندازہ نہیں ہو سکا البتہ انہیں کھانے پینے کے سلسلے میں کچھ خصوصی ہدایات بیگم صاحبہ کی طرف سے موصول ہوئی تھیں۔ ممتاز اور نور جہاں بھی کچن میں شاہ جہاں بیگم کے ساتھ مصروف ہو گئیں گھر کا مالک آیا تھا۔ پوری کہانی سبھی کے علم میں تھی۔ طاہر علی شیخ کے بارے میں بیگم صاحبہ کا غم بھی ان کے علم میں تھا۔ دیکھ رہی تھیں کہ ایک گھریلو عورت کس طرح حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہے اور شوہر کی تمامتر بے وفائیوں کے باوجود اس کا کس طرح خیر مقدم کرتی ہے۔ بیگم صاحبہ کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شوہر کو کس قدر چاہتی ہیں۔ ایک ایسے شوہر کو جس کے بارے میں انہیں علم تھا کہ وہ غلط کردار کا انسان ہے۔

شاہ جہان بیگم صاحبہ کے بہت کم معاملات میں دخل دیتی تھیں لیکن اس وقت پوچھے بغیر نہ رہ سکیں کہ بیگم صاحبہ اچانک اداس کیوں ہو گئی ہیں۔ بیگم فرخ شیخ' شاہ جہاں بیگم سے خاصی مانوس ہو چکی تھیں۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''آج رات مجرا ہے اور اس کے لیے بڑا ہال آراستہ کر دیا گیا ہے۔ آنے والوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا ہے کچھ دوست بھی ہوں گے۔ یہ رنگ رلیاں کچھ دن سے بند تھیں لیکن بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طاہر علی صاحب آئیں اور یہ سب نہ ہو۔ خیر شاہ جہاں بیگم تم ان باتوں میں مت پڑو' کھانا بڑی احتیاط سے پکانا۔ اس مسئلے میں طاہر علی صاحب کسی قسم کا تساہل برداشت نہیں کرتے۔''

''آپ مطمئن رہیں بیگم صاحبہ' کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' شاہجہاں بیگم نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ بیگم صاحبہ کافی دیر تک بیٹھی رہیں۔ ڈھول' ہارمونیم' طبلہ' سارنگی اور

دوسرے بہت سے سازوں کی ملی جلی آوازیں کوٹھی میں گونجنے لگیں اور پھر گھنگروں کی جھنکار۔ جنہوں نے ان تینوں ماں بیٹیوں کو ششدر کر دیا تھا۔ ممتاز اور نور جہاں کے چہرے بھی اترے نظر آ رہے تھے۔ نہ جانے ان کے کیا کیا احساسات تھے بیگم صاحبہ چلی گئیں تو شاہ جہاں بیگم نے لڑکیوں سے سونے کے لیے کہا اور خود بھی بستر پر لیٹ گئیں۔ یہ آوازیں ان کے سینے میں برچھی کی مانند اتر رہی تھیں اور وہ عجیب و غریب احساسات کا شکار تھیں۔ لڑکیاں تو سو گئیں لیکن شاید وہ خود آدھی رات تک جاگتی رہیں اس وقت تک جب تک محفل ختم نہ ہو گئی۔ صبح پانچ بجے ہی بیگم صاحبہ ان کے پاس پہنچ گئیں اور انہیں پاؤں ہلا کر جگا دیا۔ شاہ جہاں بیگم ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھیں۔

''اٹھ جائیے شاہ جہاں بیگم ناشتے کی تیاری کرنی ہیں۔ تقریباً پندرہ افراد کا ناشتہ ہے۔ محنت کرنی ہوگی۔ وقت بھی لگے گا جلدی سے تیار ہو جائیے معاف کیجئے میں نے اس وقت آپ کو جگا دیا۔''

شاہ جہاں بیگم فوراً ہی منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو گئیں۔ ممتاز اور نور جہاں کو بھی جگا لیا۔ بیگم صاحبہ خود بھی ان کے ساتھ کچن میں آ گئیں اور ہاتھ بٹانے لگیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

''صبح ساڑھے سات بجے چائے بھجوا دیجئے گا اور ناشتہ ساڑھے آٹھ بجے کیا جائیگا۔''

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ آپ اطمینان رکھیے گا۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا۔ بہر طور بیگم صاحبہ کو اطمینان ہوا یا نہیں اس کا اندازہ تو شاہ جہاں بیگم کو نہیں تھا لیکن خود ان کے ذہن پر ایک شدید وزن آ پڑا تھا اور وہ بار بار خود کو سمجھا رہی تھیں کہ اب ان معاملات سے ان کا کیا تعلق؟ لیکن دل تھا کہ گھبرائے جا رہا تھا اور یہ گھبراہٹ بے معنی نہیں تھی۔ ساڑھے سات بجے چائے تیار کر دی اور عمدگی سے ٹرالی پر سجا کر باہر نکل آئیں کسی ملازم کو تلاش کیا لیکن ملازمین کام میں مصروف تھے۔ دیر تک وہ ملازموں کے لیے سرگرداں رہیں اور پھر جب کوئی نہ ملا تو سر پر دوپٹہ جما لیا۔ چہرہ درست کیا اور خود ہی ٹرالی دھکیلتی ہوئی بڑے ہال کی جانب بڑھ گئیں۔ بڑے ہال سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ غالباً وہاں موجود لوگ جاگ چکے تھے۔ خود طاہر علی شیخ بھی وہیں موجود تھے۔ سازندے اور طوائفیں آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ علی الصبح جاگ گئے تھے' غالباً

ناشتے کے بعد انہیں واپسی کا سفر بھی کرنا تھا۔ شاہ جہاں بیگم ٹرالی لیے ہوئے گردن جھکائے اندر پہنچیں اور سب کی نگاہیں ان کی جانب اٹھ گئیں۔ تبھی شاہ جہاں بیگم نے کانوں میں حیرت زدہ آواز ابھری۔

''ارے تم شاہ جہاں...... تم۔'' اور اس آواز نے شاہ جہاں بیگم کو چکرا کر رکھ دیا۔

انہوں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ بھاری بدن کی ایک عمر رسیدہ عورت شاہ جہاں بیگم کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ شاہ جہاں بیگم کو پورا ہال گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسی درمیان بھاری بدن کی عورت اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے قریب پہنچ گئی۔

''میرے مولا میری آنکھیں دھوکہ تو نہیں کھا رہیں۔ اے اللہ یہ تم ہی ہو شاہ جہاں۔ ہاں تم ہی تو ہو۔ اری گلنار اور شادمان ذرا جلدی سے آؤ دیکھو کون ہے دیکھو یہ کون ہے؟'' دو لڑکیاں شاہ جہاں بیگم کے قریب پہنچ گئیں۔

''ارے شاہ جہاں خالہ آپ یہ تو واقعی آپ ہی ہیں۔ آپ یہاں...... آپ یہاں......'' دونوں لڑکیاں متحیر انداز میں بولیں۔ لیکن شاہ جہاں بیگم کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

وہ چکرائی ہوئی نگاہوں سے پورے ماحول کو دیکھ رہی تھیں اور ان کے لیے کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ پورے بدن میں تشنج سا پیدا ہو گیا تھا اسی وقت ایک آواز ابھری۔

''بھئی کون ہیں یہ؟ ہمیں تو بتاؤ روشن تارا۔''

''ارے اسے نہیں پہچانتے آپ؟ شاہ جہانی ہے۔ اپنے ہی شہر کی۔ اپنی ہی بستی کی شاہ جہاں بیگم ارے بڑا نام تھا اس کا۔ بڑے چرچے تھے۔ شاہ جہاں ممتاز اور نور جہاں کہاں ہیں؟'' روشن تارا نے بڑی اپنائیت سے کہا لیکن شاہ جہاں بیگم کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

''اے بوا ایسے کیوں کھڑی ہو آؤ ادھر بیٹھو تمہیں طاہر علی شیخ کی کوٹھی میں دیکھ کر ہمیں زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ شیخ صاحب ایسے ہی شوقین ہیں۔ جس پر دل آ جائے لاکھوں لٹا دیتے ہیں۔ اے میں کہتی ہوں رات کو تم نے مجرے میں حصہ کیوں نہیں لیا؟''

''روشن تارا میں نے تم سے پوچھا کون ہیں یہ؟ کیا بات ہے؟''

''میں نے بتایا تو ہے شیخ جی بن کیوں رہے ہیں آپ؟ اداکاری کیوں کر رہے ہیں؟

آپ کا اپنا شوق ہے جسے چاہیں گھر میں ڈالیں۔ جسے چاہیں بازار میں رہنے دیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے مگر یہ اداکاری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''بکواس کیے جا رہی ہو۔ میں پوچھتا ہوں میں کون ہے یہ؟''

''تو کیا واقعی آپ انہیں نہیں جانتے؟''

''بوا تم ادھر آؤ' کون ہو تم اور یہ روشن تارا تمہیں کیسے جانتی ہے؟'' شاہ جہاں بیگم اب بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ بھاگ جانے کو جی چاہ رہا تھا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے پاؤں نہیں اٹھیں گے۔ وہ سب عجیب سی حالت میں کھڑی ہوئی تھیں روشن تارا نے کہا۔

''یہ کیا تماشا ہے بھئی ہماری سمجھ میں تو نہیں آ رہا۔ طاہر علی اگر آپ نے شاہ جہانی بیگم اور ان کی بیٹیوں کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے تو بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی تقدیر ہوتی ہے اور شاہ جہانی تم بھی سنو ہمارے پیشے میں ایسی روایتیں نہیں چلتیں بہنا' تم خوش رہو ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم کہاں ہو' کس کے پاس ہو؟ ذرا بچیوں سے تو ملاؤ بچیاں کہاں ہیں؟''

''بوا تم نے سنا نہیں میں کہتا ہوں ادھر آؤ۔'' طاہر علی نے کسی قدر غراتے ہوئے انداز میں کہا اور شاہ جہاں بیگم چونک پڑیں۔ انہوں نے طاہر علی کو دیکھا اور پھر نہ جانے کیسے ان کے قدموں نے ان کا ساتھ دے دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلیں پھر بے تحاشہ اپنی رہائش گاہ کی جانب چل پڑیں تھوڑی دیر بعد وہ اندر داخل ہو گئی تھیں۔ یہاں صرف سلطانہ تھی۔ جو اپنی بچی کا لباس تبدیل کر رہی تھی۔ شاہ جہاں بیگم جس حال میں اندر داخل ہوئی تھیں اسے دیکھ کر سلطانہ چونک پڑی۔ شاہ جہاں بیگم کا پورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ اندر آتے ہی وہ پلنگ پر گر پڑیں اور سلطانہ جلدی سے بچی کو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا ہوا اگی؟ خیر تو ہے؟ طبیعت کیسی ہے؟ پانی لاؤں؟ ابھی پانی لاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے دوڑی اور ایک گلاس میں پانی بھر کے لے آئی پھر شاہ جہاں بیگم کے قریب بیٹھ گئی۔

شاہ جہاں بیگم کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ چہرے کی کیفیت بگڑی ہوئی تھی۔

''امی...... امی کیا ہوا؟ خیر تو ہے کچھ بتایئے تو سہی کچھ طبیعت بگڑ گئی ہے اچانک؟ اٹھیے اٹھیے پانی پی لیجیے۔'' شاہ جہاں بیگم نے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سلطانہ نے انہیں سہارا دے کر بٹھا دیا۔ شاہ جہاں بیگم ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے سلطانہ کو دیکھا اور بھنچے بھنچے لہجے میں بولیں۔

''سلطانہ بیٹی سلطانہ بیٹی پھر طوفان آ گیا...... پھر طوفان آ گیا۔ سلطانہ بیٹی۔''

''کیسا طوفان امی؟ کیا ہوا؟ کچھ بتایئے تو سہی۔ خدارا کچھ بتایئے میں پریشان ہو رہی ہوں۔''

''ہم پھر برباد ہو گئے۔ سلطانہ ہم پھر برباد ہو گئے۔ ہم پھر لٹ گئے ایک بار پھر ہمیں لٹنا پڑ رہا ہے۔ ہماری...... ہماری...... میری۔'' شاہ جہاں بیگم کی آواز بلند ہو گئی۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے تھے۔ ایک عجیب سی ہیجانی کیفیت ان پر طاری تھی۔

''امی آپ کو میری قسم آپ کو کرن کی قسم سچ بتایئے ہوا کیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟''

''جو کچھ ہوا ہے بیٹی بہت جلد سامنے آنے والا ہے۔ بہت جلد سامنے آ جائے گا۔'' شاہ جہاں بیگم نے کہا۔

''آپ بتائیں گی نہیں مجھے؟''

''بتاؤں گی...... بتاؤں گی۔'' شاہ جہاں بیگم گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔ کافی دیر تک وہ خود کو سنبھالنے میں کوشاں رہیں۔ نور جہاں اور ممتاز بے چاری بدستور باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ دوپہر کے کھانے کی تیاریاں بھی کرنی تھیں۔ ابھی کچھ مہمان موجود تھے اور بیگم صاحبہ کی طرف سے اس سلسلے میں ہدایات مل چکی تھیں۔ شاہ جہاں بیگم کافی دیر کے بعد خود کو سنبھال پائیں اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگیں۔

''میں...... میں صبح کا ناشتہ لے کر صاحب کے کمرے میں گئی تھی۔''

''رات کو یہاں مجرا ہوا تھا۔''

''ہاں ہوا تھا۔ آوازیں صاف تو آ رہی تھیں۔''

''اس مجرے میں...... اس مجرے میں جو طوائفیں شریک ہوئی تھیں۔''

''اوہ اچھا پھر......؟''

''وہ...... وہ میری جاننے والی ہیں۔ روشن تارا میرے کوٹھے کے بالکل سامنے والے کوٹھے میں رہتی تھیں۔ وہ بھی یہاں پہنچ گئی اور اس کی بیٹیاں یہیں تھیں۔ روشن تارا نے مجھے پہچان لیا اور...... اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں یہاں کیسے ہوں؟ اس نے نور جہاں اور ممتاز کے بارے میں بھی پوچھا۔ طاہر علی شیخ کو میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اب وہ حیران کہ میں کون ہوں؟ مجھ سے پوچھنے لگے۔ کچھ ناراض بھی ہوئے اور میں وہاں سے بھاگ آئی۔ یہ ہو گیا سلطانہ۔ یہ ہو گیا۔ ہمارا راز ایک بار پھر کھل گیا۔'' شاہ جہاں بیگم نے اسکے الفاظ میں یہ داستان سنا دی اور سلطانہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شاہ جہاں بیگم کو دیکھتی رہی۔ کافی دیر اسی طرح سکوت میں گزر گئی۔ شاہ جہاں بیگم بہ مشکل تمام خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو سکی تھیں لیکن انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور پلنگ کی پچھلی دیوار سے ٹک گئیں۔ سلطانہ ان کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے۔ وہ شاہ جہاں بیگم کو دل سے چاہنے لگی تھی اور ان کا وقار سلطانہ کی نگاہوں میں تھا بلاشبہ شاہ جہاں بیگم کا تعلق اس بازار سے تھا لیکن کتنے نیک جذبے ان کے سینے میں پروان چڑھ رہے تھے۔ انہوں نے عیش وعشرت کی زندگی ترک کر کے پیارے پاکستان کا نام اونچا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ چاہا تھا کہ اس پاک وطن میں وہ اپنے اس گندے پیشے کو دوبارہ نہ جاری کریں اور اس کے لیے انہوں نے کن کن تکالیف کا سامنا کیا۔ یہ بات سلطانہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ ایسی باوقار' ایسی عورت کو کسی بھی طرح ہلکا سمجھنا گناہ عظیم تھا۔ سلطانہ دیر تک سوچتی رہی اور پھر شاہ جہاں بیگم سے بولی۔

''تو پھر آپ اتنی پریشان کیوں ہیں امی؟''

شاہ جہاں بیگم نے آنکھیں کھول کر سلطانہ کو دیکھا اور پھر رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

''اب کیا ہو گا؟''

''اس سے پہلے کیا ہوتا رہا ہے؟'' سلطانہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھئے امی بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کا ہماری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وقت ہمارے لیے فیصلے کرتا ہے اور ہم وقت کے فیصلوں کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ امی اگر وقت نہ چاہتا وقت کی چاہت کو ہم کبھی نہیں ٹال سکتے اور اب بھی نہیں ٹالیں گے۔"

"کہاں دربدر مارے مارے پھرتے رہیں گے؟ تو خود بتا سلطانہ کتنا عرصہ ہوا ہمیں یہاں آئے ہوئے اب دل کو یہ قرار آنے لگا تھا کہ کم از کم عزت سے سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا ہے۔ ہائے کہاں جائیں گے ہم ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس سب کچھ ہے امی، برا وقت ٹل گیا ہے اور اب وقت سے جنگ کرنا ہوگی۔ سمجھیں، امی آج سے ہم وقت کے ساتھ اعلان جنگ کرتے ہیں۔" سلطانہ کے لہجے میں ایک ایسی تمتماہٹ تھی کہ شاہ جہاں بیگم کو اپنا دل اندر سے سنبھلتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں سمجھی نہیں سلطانہ۔"

"وقت سے جنگ کی جائے گی امی ہم دیکھتے ہیں زمانہ کس قدر پیتا ہے ہمیں؟ اور اب پسنے والوں میں نہیں پینے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔ دیکھئے ایک عرض کرنا چاہتی ہوں آپ سے اگر آپ قبول کریں تو۔"

"سلطانہ...... سلطانہ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔"

"آپ اپنی جو کیفیت جو چاہیں بنا لیں لیکن میں بالکل مطمئن ہوں امی میں جانتی ہوں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"کرنا کیا ہے آخر؟"

"بہت مختصر وقت میں آپ کو میں یہ بتا دوں گی کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟" سلطانہ نے اتنے ٹھوس اور مضبوط لہجے میں کہا کہ شاہ جہاں بیگم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"اے اللہ اے اللہ ہمیں سہارا دے۔ مالک ہمیں سہارا دے۔" شاہ جہاں بیگم

کراہتے ہوئے بولیں۔ سلطانہ گہری نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

"مہمان کیا دوپہر کو بھی رہیں گے؟"

"پتا نہیں۔"

"آپ خود کو سنبھالیں گی نہیں؟"

"میرا دل الٹا جا رہا ہے سلطانہ اب کیا ہوگا بیٹی۔" شاہ جہاں بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

"پہلے بھی کہہ چکی ہوں امی اب وہ سب کچھ نہیں ہوگا جو ہوتا رہا ہے۔ اب اس سے مختلف ہوگا۔ بہت مختلف ہوگا۔"

"اب میں کیا کروں؟"

"لیجئے کرن کو سنبھالیے میں کچن میں جا رہی ہوں۔ آپ یہاں آرام کریں۔" سلطانہ نے کہا اور کرن کو شاہ جہاں بیگم کی گود میں دے کر باہر نکل آئی۔ مہمان جا رہے تھے اور طاہر علی شیخ انہیں رخصت کر رہے تھے۔ سلطانہ کچن میں آ گئی۔ نور جہاں اور ممتاز اپنے کاموں میں مصروف تھیں اور انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔

"بیگم صاحبہ نے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ کہا؟"

"نہیں، وہ بیمار ہیں۔"

"کیسے پتا چلا؟"

"میں ناشتہ دینے گئی تھی۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔" سلطانہ ان کے ساتھ کام میں مصروف ہو گئی۔

"امی کہاں ہیں؟"

"کرن کے پاس ہیں۔" سلطانہ نے مختصراً کہا۔ پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ باورچی خانے کے سارے کام ہو گئے تھے۔ سلطانہ کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور اسے بہت انتظار کرنا پڑا۔ ایک ملازم اندر آیا تھا۔

"شاہ جہاں آپا کہاں ہیں؟"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔"

"اکیلی ہیں؟"

"نہیں صاحب بھی ہیں۔"

"ابھی آ رہی ہیں تم جاؤ۔" سلطانہ نے کہا وہ سمجھ گئی تھی کہ طوفان قریب ہو گیا ہے اور اب اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس نے ممتاز اور نور جہاں سے کہا کہ وہ یہیں رہیں اور خود اپنی رہائش گاہ میں چلی گئی۔ شاہ جہاں بیگم چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں۔

"آیئے امی۔"

"کہاں؟ کہاں؟" شاہ جہاں بیگم کی خوف زدہ آواز ابھری۔

"بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔" سلطانہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"تو کیا...... تو کیا......؟"

"ہاں صاحب بھی ان کے کمرے میں ہیں۔ ملازم آیا تھا آپ اٹھیے۔" سلطانہ کا لہجہ خونخوار تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے اسے دیکھا پھر بولیں۔

"کیا تمہیں بھی بلایا ہے؟"

"آپ آیئے امی جو میں کہہ رہی ہوں وہ کریں۔" سلطانہ نے کہا اور شاہ جہاں بیگم کپکپاتی ہوئی اٹھ گئیں۔ سلطانہ نے کرن کو ان کی گود سے لے لیا پھر بولی۔

"آپ خوفزدہ ہیں۔"

"ہاں...... ہاں سلطانہ میں خوفزدہ ہوں۔"

"ایک سوال کر سکتی ہوں۔ آپ سے امی آپ نے نیکیوں کے نام پر اس بری زندگی کو چھوڑا ہے' کیا آپ کو اعتماد نہیں ہے اس ذات باری پر جس نے اب تک ہمیں سنبھالا دیا ہے۔ کیا آپ اس کی کرم نوازیوں سے منہ موڑ رہی ہیں۔"

"نہیں سلطانہ نہیں مگر اب کیا ہوگا؟"

"آپ آیئے جو کچھ بات کرنی ہوگی میں کروں گی۔ ان لوگوں سے آپ بات نہ

کریں۔"

"نہیں سلطانہ چلو میں چل رہی ہوں ٹھیک ہے جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔"

شاہ جہاں بیگم کے اندر نہ جانے کس جذبے کے تحت ایک قوت سی ابھر آئی اور انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ چہرہ درست کیا۔ سر پر دوپٹہ جمایا اور پھر سلطانہ کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ راستے میں انہوں نے کہا۔

"اگر تمہیں نہیں بلایا تو تم نہ جاؤ سلطانہ۔"

"آپ چلتی رہیے۔" سلطانہ نے پھر اسی انداز میں کہا اور چند لمحات کے بعد دونوں بیگم صاحبہ کے کمرے پر پہنچ گئیں شاہ جہاں بیگم نے ہلکی سی دستک دی اور بیگم صاحبہ کی آواز ابھری۔

"آ جاؤ۔" شاہ جہاں بیگم کے ساتھ ساتھ ہی سلطانہ بھی اندر داخل ہو گئی تھی کرن اس کی آغوش میں تھی۔ طاہر علی شیخ ایک نشست پر بیٹھے ہوئے تھے اور بیگم صاحبہ پلنگ پر تھیں۔ ان کا چہرہ ہونق ہو رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شاہ جہاں بیگم کو دیکھ رہی تھیں۔ طاہر علی شیخ سرد لہجے میں بولے۔

"آپ کا نام شاہ جہاں ہے بوا؟"

"جی صاحب۔" شاہ جہاں بیگم نے جواب دیا۔

"آپ روشن تارا کو جانتی ہیں؟"

"جی جانتی ہوں۔"

"کیسے؟"

"جس جگہ وہ اپنا کاروبار کرتی تھی وہیں میرا بھی کوٹھا تھا۔" شاہ جہاں بیگم نے جواب دیا اور بیگم فرخ شیخ جیسے نڈھال ہو گئیں۔ طاہر علی شیخ نے ایک نگاہ ان کی طرف دیکھا پھر شاہ جہاں بیگم سے بولے۔

"اس گھر میں آپ کوٹھا بنانے آئی ہیں؟"

"بیگم سے سوال کیا ہے میں نے وہ کہتی ہیں کہ آپ نے انہیں یہ بات نہیں بتائی کہ

آپ کا تعلق کوٹھے سے ہے۔"

"وہ سچ کہتی ہیں۔ میرا تعلق کوٹھے سے ہے نہیں تھا۔" شاہ جہاں بیگم نے جواب دیا۔

"اور یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"محنت مزدوری کر کے زندگی کو بہتر راستوں کی طرف لانا چاہتی ہوں۔"

"کیا آپ کا تعلق کسی شریف خاندان سے ہے۔ میرا مطلب آپ خاندانی طوائف نہیں ہیں؟"

"نہیں' میں خاندانی طوائف ہوں' میری ماں بھی طوائف تھی اور نانی بھی طوائف تھی۔"

"اور آپ ان طوائفوں کے خاندان میں شریف زادی پیدا ہوئی ہیں اگر شرافت کا ایسا ہی مرض ہو گیا تھا آپ کو تو آپ نے اپنی ابتداء شرافت سے کیوں نہیں کی؟"

"مجھے شرافت کا مرض نہیں تھا صاحب بلکہ جب میں نے اس پاک سرزمین پاکستان پر قدم رکھے' لٹے ہوئے قافلے دیکھے' خانماں برباد دیکھے' گھروں کو دیکھا جن کا نام و نشان نہیں رہ گیا تھا' گھر والوں کو دیکھا جو لاوارث رہ گئے تھے تو معاً میرے دل میں خیال ابھرا کہ اس سرزمین پاک پر میں اپنی فطرت کو کیوں نہ دھو ڈالوں۔ میں نے دل میں سوچا صاحب کہ اگر محنت مزدوری کی زندگی میرا خاندانی پس منظر چھپا دے تو کیوں نہ اپنے آپ کو بھی شریفوں میں شمار کرنا شروع کر دوں اور صاحب میں اپنی اس شرافت کا بھرپور مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ اپنے سارے گناہوں کو دھونا چاہتی تھی۔"

"شاہ جہاں بیگم آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ ایک دلچسپ کہانی تو ہو سکتی ہے حقیقت اور سچائی نہیں۔"

"صاحب میں آپ سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی' آپ کے گھر میں ہوں آپ کی ملازمہ ہوں آپ کو اس حیثیت سے سب کچھ کہنے کا اختیار ہے۔ میں نے صرف اپنے جذبوں کا اظہار کیا ہے' میں یہی چاہتی تھی جو میں نے آپ سے کہا۔"

"اور اس کے لیے آپ ایک شریف گھرانے میں آ گھسیں۔"

"اس شریف گھرانے میں مجھے کافی دن ہو گئے صاحب آپ بیگم صاحبہ سے معلوم کر سکتے ہیں کہ میں نے کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں کی۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے شاہ جہاں بیگم شریف اور خاندانی گھرانوں میں طوائفوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا؟"

"جی صاحب یہ بات مجھے معلوم ہے لیکن اب ذرا سی ڈھارس بندھ گئی ہے کیونکہ روشن تارا ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں موجود تھی۔" شاہ جہاں بیگم نے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب یہ ہے صاحب کہ شریف گھرانوں میں طوائفوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا لیکن انہیں اپنے گھروں میں بلا کر بری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔" شاہ جہاں بیگم نے جرأت کر کے کہا۔

"تمہیں اس گھر پر تنقید کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"نہیں صاحب یہ پہلے اور آخری الفاظ تھے جو آپ کی بات کے جواب میں' میں نے کہے' میں یہاں محنت مزدوری کی تلاش میں آئی تھی اور محنت مزدوری کر رہی ہوں۔ اس کی مجھے تنخواہ ملتی ہے اگر آپ مجھے یہاں پسند نہیں کریں گے تو میں یہاں نہیں رہوں گی۔ ظاہر ہے میری ایک ضرورت تھی جو میں نے پوری کرنا چاہی آپ اگر اس سے انکار کرتے ہیں تو ظاہر ہے میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ بیگم صاحبہ اس بات کی گواہ ہیں کہ انہیں میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ باقی آپ فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔"

"تمہیں جس قدر چرب زبان ہونا چاہیے اتنی ہی چرب زبان ہو شاہ جہاں بیگم' بہر طور تم خود سمجھ دار ہو میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ ایک طوائف میرے گھر میں رہے۔ خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو تم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہ جگہ چھوڑ دو۔"

"بہتر صاحب معمولی سی بات ہے البتہ بیگم صاحبہ ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔"

"کیا؟"

"بیگم صاحبہ یہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے یہ طوائف زادی نہیں ہے، مجھے کیمپ میں ملی تھی اور بے سہارا تھی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کرلیا اگر اس کے لیے کوئی جگہ نکال سکتی ہیں تو ضرور نکالیے یہ بے خانماں تنہا رہ جائے گی۔ میری زندگی تو میرے گناہوں کی سزا ہے لیکن اس کا گناہ کوئی نہیں ہے بیگم صاحبہ۔" سلطانہ نے چونک کر شاہ جہاں بیگم کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"کمال ہے امی آپ سارے سچ کے ساتھ ایک جھوٹ کیوں بول رہی ہیں، نہیں بیگم صاحبہ میں انہی کی بیٹی ہوں اور یہ جو کچھ کہہ رہی ہیں شاید صرف اس لیے کہہ رہی ہیں کہ آپ لوگ میرے اوپر ترس کھائیں۔ بہر طور ہم نے آپ کا فیصلہ سن لیا چوبیس گھنٹے کا یہ احسان ہم آپ سے ضرور لیں گے صاحب اور اس کے لیے آپ کا پیشگی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ اپنی نگرانی میں ہمیں یہاں سے نکال دیجیے تاکہ یہ احساس بھی آپ کے ذہن سے ختم ہوجائے کہ ہم آپ کو کوئی نقصان دے کر جارہے ہیں۔" طاہر علی صاحب نے گہری نگاہوں سے سلطانہ کو دیکھا اور پھر بولے۔

"ٹھیک ہے تم لوگ یہاں سے جانے کی تیاریاں کرو اس سے زیادہ میں تم سے اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" اس تمام گفتگو کے دوران بیگم صاحبہ خاموش بیٹھی رہی تھیں۔ انکے چہرے سے حزن وملال ظاہر ہو رہا تھا اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ان حالات میں ان کا اپنا ردعمل کیا ہے۔

"چلو امی چوبیس گھنٹے کا یہ احسان ہم ضرور قبول کریں گے۔ کیونکہ ہمارے حالات اس کے متقاضی ہیں۔" سلطانہ نے شاہ جہاں بیگم کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آئی۔ شاہ جہاں بیگم کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اپنے رہائشی حصے میں پہنچ کر سلطانہ نے کہا۔

"آپ نے اس وقت بھی مجھ سے انحراف کیا ہے امی، یہاں سے ساتھ نکلیں گے لیکن اس کے بعد میں آپ کی جان چھوڑ دوں گی۔ میں نے بارہا یہ بات محسوس کی کہ آپ میرے ساتھ یہ احسان کرتو چکی ہیں کہ آپ نے مجھے خود میں شریک کرلیا لیکن اب اسے نبھانے سے قاصر ہیں۔"

"سلطانہ۔" شاہ جہاں بیگم کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

"نہیں امی کتنی بار ذلیل کریں گی، کتنی بار یہ احساس دلائیں گی کہ میں آپ کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئی۔ آپ نے ہر بار مجھے ٹھوکر مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہی سوچا کہ یہ صرف آپ کے خلوص پر مبنی ہے لیکن معاف کیجیے گا امی اب مجھے یہ احساس ہوگیا کہ آپ دو ہی بیٹیوں کے بوجھ سے پریشان ہیں اور مزید دو کا بوجھ نہیں برداشت کرنا چاہتیں، فکر نہ کریں، یہاں سے نکلنے کے بعد میں خود کہیں اپنے لیے سر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرلوں گی، آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔"

سلطانہ میری بچی نہیں، خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے، میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ کب تک اپنے ساتھ تیری تقدیر پھوڑتی رہوں گی۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو، تو شاید مجھ سے زیادہ پرسکون ہوتی۔"

"مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ میں جانتی ہوں آپ کو جو کچھ کرنا ہے وہ آپ سوچیے۔" سلطانہ نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا اور شاہ جہاں بیگم اس کی صورت دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

"سلطانہ میری مجبوری پر یقین نہیں کیا تم نے؟"

"آپ مجبور نہیں ہیں امی یا اگر ہیں تو ٹھیک ہے میں آپ کی مجبوری قبول کیے لیتی ہوں۔"

"تم ہم سے الگ ہوجاؤ گی؟"

"آپ نے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ آپ کا کیا خیال تھا کہ میں آپ کے یہاں سے نکالے جانے کے بعد ان لوگوں کی رعایتیں حاصل کرلیتی؟"

"نہیں سلطانہ، بس میں تمہارے لیے کوئی بہتر جگہ چاہتی ہوں۔ دراصل بیٹی میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اب میں کیا کروں گی تھک گئی ہوں سلطانہ تھک گئی ہوں۔"

"میں نے عرض کیا نا امی اب آپ اپنے طور پر آزاد ہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے

کہ میں اپنے طور پر رہوں گی۔"

"اور......اور مجھے چھوڑ دو گی۔"

"وہ کروں گی جو آپ چاہتی ہیں۔"

"نہیں سلطانہ نہیں خدا کے لیے یقین کرلو مجھ پر خدا کے لیے مجھ برباد پر یقین کرلو۔"

"تو پھر سنیئے امی جو کچھ میں کہوں گی وہ کرنا پڑیگا آپ کو اور قسم کھاتی ہوں کرن کی' اپنی زندگی کی' اپنے خدا کی اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو میں آپ کا ساتھ خاموشی سے چھوڑ دوں گی چاہے اس کے بعد نتیجہ کچھ بھی ہو۔"

"نہیں نہیں میں تمہاری بات مانوں گی سلطانہ میں تمہاری بات بالکل مانوں گی کہو کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"کچھ نہیں بس اب تیار ہو جایئے ممتاز اور نور جہاں کو بلا لیجئے ان سے کہیے کہ وہ یہاں رہیں کھانے پینے کا مسئلہ ہے تو میرا خیال ہے اس میں کوئی مشکل ابھی فی الحال ہمیں نہیں ہوگی۔ چوبیس گھنٹے کے اس وقفے سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"اور تم کیا کرو گی؟"

"چلیں گے ابھی ذرا کام سے چلیں گے۔" سلطانہ نے کہا اور شاہ جہاں بیگم ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہیں۔ سلطانہ خود ہی کچن میں گئی اور ممتاز اور نور جہاں کو بلا لائی ویسے بھی وہ اپنا کام ختم کر چکی تھیں اور بیگم صاحبہ کی طرف سے ابھی کوئی نئی ہدایت نہیں ملی تھی۔ سلطانہ نے راستے میں ممتاز اور نور جہاں سے کہا کہ طاہر علی شیخ صاحب کو یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ ہم لوگ کون ہیں اور انہوں نے یہاں سے نکل جانے کا حکم دیا ہے۔ نور جہاں اور ممتاز دھک سے رہ گئی تھیں۔ سلطانہ نے انہیں تسلیاں دیتے ہوئے کہا۔

"اور اب نور جہاں ممتاز میں نے ساری باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لی ہے میں بہت جلد تم لوگوں کو ایک بہتر مقام دوں گی تم بالکل فکر مت کرنا۔"

"جی سلطانہ مگر......مگر۔"

"کچھ نہیں آؤ تم کرن کو سنبھالے رکھنا ہم ذرا جا رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"بتادوں گی بھئی بعد میں بتادوں گی۔" سلطانہ نے کہا اور رہائشی حصے میں داخل ہوگئی پھر وہ تیار ہونے لگی نور جہاں نے کرن کو سنبھال لیا تھا اور شاہ جہاں بیگم سلطانہ کی تیاریاں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے شاہ جہاں کو بھی تیار ہونے کے لیے کہا اور اس کے بعد دونوں باہر نکل آئیں شاہ جہاں بیگم بار بار اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے لیکن سلطانہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ چلتی رہی اور پھر اس نے ایک راہگیر سے کسی بس کے بارے میں پوچھا راہگیر نے اسے جواب دے دیا تھا۔

شاہ جہاں بیگم کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی۔ اب وہ بالکل خاموشی سے سلطانہ کی ہدایات پر عمل کر رہی تھیں۔ پھر سلطانہ جس بس میں چڑھی اسے بھی شاہ جہاں بیگم نے عجیب سے نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ بس اسٹاپ پر اتر گئیں جہاں سے بیرکوں کو راستہ جاتا تھا۔

"سلطانہ ادھر تو......شاہ جہاں بیگم کی سسکی سی ابھری۔

"ہاں امی ہم بیرکوں میں جا رہے ہیں۔"

"وہاں؟"

"قمرو ہوگا یہی نا؟"

"ہاں......ہاں۔" شاہ جہاں بیگم نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے وہیں لے چلیں امی۔" سلطانہ نے کہا کہ شاہ جہاں بیگم نے آنکھیں بند کرلیں۔ ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال وہ بیرک پر پہنچ گئی تھیں اور سلطانہ نے قمرو کی بیرک پر پہنچ کر سانس لی۔ پھر اس نے آواز دی۔

"قمرالدین صاحب ہیں؟"

"قسم اللہ کی قمرالدین تو ہم ہی ہیں۔ اندر سے ایک بڑبڑاہٹ سنائی دی اور پھر قمرو باہر نکل آیا۔ اس نے ان دونوں کی صورتیں دیکھیں اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔" اے قسم اللہ کی بچاؤ ارے باپ رے۔"

"آپ ہمیں پہچانتے ہیں قمرالدین صاحب۔" سلطانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مم..... میٹھی چھری بن کر مارو گی۔ ابے میں کوئی اکیلا ہوں۔"

قمرو کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ بار بار مشتبہ نگاہوں سے شاہ جہاں بیگم اور سلطانہ کو دیکھنے لگتا تھا۔ یہ بات دل میں چور بنی ہوئی تھی کہ اس نے نوشہ میاں کے کہنے سے ان لوگوں پر الزام لگا کر انہیں یہاں سے نکلوا دیا تھا۔ نوشہ میاں کا مقصد جو کچھ بھی ہو قمرو تو ان لڑکیوں پر اپنا تسلط جمانا چاہتا تھا اور نوشہ میاں کے جال میں آ گیا تھا۔ اب یہ سوچ رہا تھا کہ دونوں کہیں اس سے انتقام لینے تو نہیں آئیں؟ لیکن فطرتاً اوباش طبع تھا۔ اس لیے سلطانہ کی میٹھی میٹھی باتوں میں آ کر انہیں اندر آنے کی دعوت بھی دے چکا تھا۔ شاہ جہاں بیگم' سلطانہ کے ساتھ اندر آ کر بیٹھ گئیں اور قمرو ہونقوں کے سے انداز میں ایک گوشے میں کھڑا انہیں گھورتا رہا۔

"قمرو صاحب آپ تو اس طرح پریشان نظر آ رہے ہیں جیسے آپ کی اس کھولی میں ڈاکو گھس آئے ہوں۔ یہ اماں تو بڑا ناز کرتی تھیں آپ پر اور کہتی تھیں کہ قمرو میرے بیٹوں کی طرح سے ہے۔ حالانکہ اس دن آپ ہی نے ہمیں ذلیل کر کے یہاں سے نکلوایا تھا۔"

"اے اللہ قسم وہ تو سالے نوشہ میاں تھے۔ میرا دل تو بعد میں دکھتا ہی رہا تھا۔" قمرو نے کہا۔

"خیر چھوڑیئے آپ بلاوجہ ہم سے ناراض ہو گئے تھے۔ لیکن ہم آپ سے ناراض نہیں ہوئے۔ یہاں سے چلے تو گئے اور ٹھکانہ بھی مل گیا ہمیں مگر سب ہی آپ کو یاد کرتے رہے۔ اچھے پڑوسی بھی نعمت ہوتے ہیں اور آپ جیسا مخلص آدمی۔ واقعی قمرو صاحب بڑا دل دکھتا رہا ہے۔ ان دنوں میں نے تو اماں سے بارہا کہا کہ اماں واپس کھولی میں چلتے ہیں۔ قمرو صاحب سے معافی مانگ لیں گے اور ان سے کہیں گے کہ ہمیں ہماری کھولی آباد کرنے دیں کیا فائدہ ہم بدنصیبوں کو یہاں سے نکالنے کا؟"

"اب تم ہمیں رلا رہی ہو قسم اللہ کی۔ رو پڑوں گا دھائیں دھائیں کر کے۔" سلطانہ نے بمشکل تمام اپنی ہنسی برداشت کی تھی۔ یہ دھائیں دھائیں کر کے رونا پہلی بار سنا تھا۔

"نہیں قمرو صاحب یہ ایک ٹھوس سچائی ہے۔ انسان اپنوں ہی میں جی سکتا ہے۔ یہاں سے ہم ایک ایسی جگہ چلے گئے جو ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ وہاں بڑے لوگ تھے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم سب غلام بن گئے ہوں۔ سخت اذیت اور کرب کے عالم میں زندگی گزر رہی تھی۔ میں نے اماں کو مجبور کیا کہ چلو قمرو کچھ بھی ہو اپنے ہی ہیں ناراض ہو گئے ہیں تو منا لیں گے۔ وہی ہمارے لیے کچھ کر سکیں گے۔"

"ابے جان دے دوں گا اللہ قسم۔ مجال ہے کسی کی جو تم کو یہاں رہنے سے روک سکے۔ برابر کی کھولی پر اپنا ہی قبضہ ہے اماں تم فکر مت کرو' قمرو کو بیٹا سمجھا ہے تو بیٹا بن کر دکھا دے گا۔ میں ابھی تمہاری کھولی خالی کرائے دیتا ہوں۔ سب لوگ آ جاؤ دیکھ لوں گا ان سسروں کو جو تمہارے یہاں رہنے کی مخالفت کرتے ہیں۔" قمرو جوش میں آ گیا تھا۔ سلطانہ نے اسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں قمرو اس طرح تو تمہاری بھی بے عزتی ہوگی۔ تم نے تو خیر کسی کے کہنے میں آ کر ہماری عزت اتار دی لیکن تمہاری عزت ہم اپنے سر پر رکھیں گے۔ کل تم نے ہم پر الزام لگا کر ہمیں یہاں سے نکلوایا تھا۔ تو اب کس منہ سے کہہ سکو گے کہ ہم اچھے لوگ ہیں۔"

"یہ کام میرا ہے سلطانہ بی بی' تم بالکل فکر مت کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ بس آ جاؤ اپنی کھولی میں۔"

"خیر قمرو میاں یہ تو جو کچھ ہوا ہے خیر ہوا ہی ہے۔ ہم اب وہاں نہیں رہنا چاہتے ہیں جہاں رہ رہے ہیں۔ فی الحال تمہاری کھولی میں قیام کرتے ہیں اور اس کے بعد کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

"بعد کی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔ اچھا یہ بتاؤ کیا کھلاؤں پلاؤں تم لوگوں کو۔ ٹھہرو میں کچھ لے کر آتا ہوں۔"

"ارے نہیں' نہیں قمرو صاحب کھانے پینے کی حاجت نہیں ہے۔ مہمان نوازی کرنی ہے تو پھر ہم سب کی باقاعدہ دعوت کیجئے گا لیکن اس وقت نہیں۔"

"ضرور کروں گا ارے جان لڑا دوں گا تم لوگوں کے لیے' قمرو جیسا دوست تم کو ملنا

مشکل ہے۔ اماں معاف کردو اپنے قمرو کو جو کچھ کیا ہے اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ اللہ قسم بس ایک بار معاف کردو۔"

شاہ جہاں بیگم کے تو بات ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سلطانہ نے جو چکر چلایا تھا۔ وہ ان کی عقل سے باہر تھا۔ آخر قمرو جیسے گھٹیا انسان سے وہ کیا کام لینا چاہتی تھی؟ لیکن سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں ملا تھا؟ سلطانہ نے انہیں اپنا محکوم بنالیا تھا اور وہ اس سے تعاون کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کا موقع ملتا تب ناں۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سلطانہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اماں جی آپ یوں کیجئے کہ ممتاز اور نور جہاں کو بھی برقع اوڑھا کر یہاں لے آیئے۔ میں یہیں قمرو صاحب کے پاس ہوں۔" شاہ جہاں بیگم نے گھبرا کر سلطانہ کی صورت دیکھی تو سلطانہ نے کہا۔

"ہاں امی اب ہمارا وہاں رہنا مناسب نہیں ہے؟"

"لیکن......لیکن......"

"آپ نے وعدہ کیا ہے کہ جو کچھ میں کروں گی آپ مجھے کرنے دیں گی۔" سلطانہ نے کہا اور شاہ جہاں بیگم نے گردن ہلا دی پھر اوپری اوپری سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہے کیا تم میرے ساتھ نہیں چل سکتیں؟"

"نہیں میں یہیں ہوں۔" سلطانہ نے کہا قمرو کی تو باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد شاہ جہاں بیگم ہانپتی کانپتی وہاں سے رخصت ہوگئیں۔ سلطانہ نے مسکراتی نگاہوں سے قمرو کو دیکھا اور قمرو نے بھی بھاڑ سا منہ پھاڑ دیا۔

"آپ بہت دلچسپ انسان ہیں قمرو صاحب۔"

"ارے نہیں کیوں مارے دے رہی ہو؟ میں کہاں؟ میں تو بالکل وہ ہوں......وہ میں ......میرا مطلب ہے پٹھا۔"

"جی......جی میں سمجھ رہی ہوں۔" سلطانہ نے آہستہ سے کہا۔

"بڑی غلطی ہوگئی مگر آپ لوگوں نے بھی تو بہت سختی کی تھی میرے ساتھ۔ میں تو دل

وجان سے آپ پر لٹو ہو رہا تھا مگر آپ توجہ ہی نہیں دیتی تھیں۔"

"آپ تھوڑے سے بے وقوف بھی ہیں قمرو صاحب۔"

"ارے......ارے کیوں......کیوں......؟"

"بس کیا کہا جائے آپ سے۔ آپ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں ممتاز کو دیکھا ہے آپ نے؟"

"اللہ قسم اچھی طرح دیکھا ہے۔"

"بس یوں سمجھ لیں ہمارے یہاں واپس آنے میں اس کا ہاتھ ہے۔"

"کک......کیسے؟"

"دیوانی ہو رہی تھی اس دن سے کہہ رہی تھی کہ ہم نے اس پر ظلم کیا ہے۔"

"وہ......وہ کیوں؟" قمرو نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ آپ بے وقوف ہیں۔ ایک لڑکی کے دل کا حال بھی نہیں سمجھ سکے آپ یہاں سے جانے کے بعد ایک منٹ بھی دل نہیں لگا اس کا۔ دن رات روتی ہی رہی۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو میں نے تو کوشش کر کے ایک بار پھر یہاں تک پہنچا دیا ہے اب باقی کام آپ کا ہے۔"

"ارے توبہ کتنی غلطی ہوئی مجھ سے مم......مگر میں بھی تو ناتجربہ کار ہوں۔ بالکل ہی وہی ہوں۔ وہی جو ابھی میں نے کہا تھا۔"

"ہاں......ہاں میں سمجھ رہی ہوں۔" سلطانہ نے پھر کہا اور قمرو افسردگی سے گردن ہلانے لگا پھر بولا۔

"بڑی غلطی ہوگئی خیر کوئی بات نہیں ہے۔ کھولی صاف کر دیتا ہوں آپ کی ابھی تک میں نے کسی کو اس میں نہیں آنے دیا۔"

"رہنے دیں تھوڑا سا وقت تو گزارنا ہی ہے آپ ہی کی کھولی میں گزار لیں گے۔ آپ وہاں سو جایا کریں اور سنیں بے صبری اچھی چیز نہیں ہوتی۔ ہر گرم چیز کو ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے۔ آپ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے اماں پریشان ہو جائیں۔"

''اے بی ذرا سمجھا دو مجھے واقعی اب تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں بے وقوف ہوں۔ ذرا تھوڑی سی رہنمائی کر دو میری تا کہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاؤں۔''

''وعدہ کرتے ہیں قمرو صاحب جو کچھ میں کہوں گی وہی کریں گے؟''

''اے قسم اللہ کی گولی مار دینا اگر تمہاری بات سے ذرا بھی ہٹ جاؤں۔''

''ہوں تو پھر سب سے پہلے اماں پر اپنا اعتماد قائم کیجئے۔ اماں کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ آپ ان کی بیٹیوں کے لیے نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔''

''اے برخوردار بن جاؤں گا۔ اللہ قسم' خدمت کروں گا اتنی۔ پاؤں بھی دباؤں گا رات کو۔''

''ارے نہیں..... نہیں اماں کے پیروں میں بالکل بھی درد نہیں ہوتا۔ بس آپ ذرا نیاز مندی سے رہیے۔ ابتداء میں کوئی ایسی حرکت نہ کیجئے گا جس سے اماں کو شبہ ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے بالکل نہیں کروں گا۔'' قمرو نے زور زور سے گردن ہلاتے ہوئے کہا اور سلطانہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ پھر چند لمحات کے بعد اس نے کہا۔

''اور وہ آپ کے نوشہ میاں کہاں ہیں؟''

''زندہ ہیں سالے ٹھیک ہیں۔'' قمرو نے جواب دیا۔

''ذرا ان سے بھی تو ملاقات کرائیے۔'' سلطانہ بولی اور قمرو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''طنز کر رہی ہو اللہ قسم۔''

''ارے نہیں قمرو میاں اس میں طنز کی کیا بات ہے؟ میں تو پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں نے آپ لوگوں سے انحراف نہیں کیا تھا۔ بس آپ ہی نے ذرا جلد بازی کر ڈالی۔ نوشہ میاں سے ملاقات کرائیے ہماری۔ ذرا ان سے بھی کچھ باتیں کرنا ہیں۔ کہاں رہتے ہیں آج کل؟ ملاقات ہو رہی ہے؟''

''ہاں ملتے رہتے ہیں۔ جگی ہوٹل میں روز شام کو ضرور موجود ہوتے ہیں۔ آج ہی شام کو ملاقات کرا دوں گا۔''

''ہاں ضرور..... ضرور۔'' سلطانہ نے کہا اور قمرو میاں پھر بولے۔

''اب تو کچھ لے آؤں تمہارے لیے۔''

''رہنے دیں قمرو میاں باتیں کریں آپ کی گفتگو بہت اچھی لگتی ہے مجھے۔'' سلطانہ نے کہا اور قمرو میاں پانی پانی ہو گئے۔ کافی دیر تک وہ سلطانہ سے باتیں کرتے رہے تھے۔ بار بار چونک کر وہ سلطانہ کا چہرہ دیکھنے لگتے۔ غالباً اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ گڑبڑ کہاں ہے؟ لیکن بہ ظاہر کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔

◇◇◇

پروفیسر حشمت اللہ شمشو کو اندر لے گئے۔ مکان کی ظاہری شان بتا رہی تھی کہ پروفیسر صاحب گانٹھ کے پورے ہیں اور پر مسرت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خاصے وسیع و عریض مکان میں کچھ ویرانی ویرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ہر چیز سے دولت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ پروفیسر صاحب برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ خوبصورت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر انہوں نے شمشو سے بیٹھنے کے لیے کہا اور شمشو اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔

''چچا جان مم..... میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب بیگم صاحبہ نظر آ رہی ہیں۔''

''بیگم صاحبہ کا کوئی وجود نہیں ہے اس لیے کہ میں نے شادی ہی نہیں کی'

''اس گھر میں دو ملازم ہیں اور کبیر اللہ ہے۔''

''کیا ہے؟''

''کبیر اللہ۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟'' شمشو نے پوچھا۔

''میرا بھانجا ہے۔ بہن اور بہنوئی دنیا میں نہ رہے۔ فسادات میں ہلاک ہو گئے۔ بھانجا میرے ساتھ ہے۔ نہایت نکما' نکھٹو اور بدمزاج۔ تمہیں بس اسے برداشت کرنا ہوگا۔ باقی تمہارا کام زیادہ تر لیبارٹری ہی میں رہے گا۔''

"آپ نے کہا تھا پروفیسر صاحب کہ مجھے لیبارٹری دکھائیں گے؟"

"ہاں پہلے تم یہ بتاؤ کہ کام کے سلسلے میں تمہارا نظریہ کیا ہے؟"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے بھائی جی مجھے کام ملا ہی کہاں ہے؟"

"تو پھر یوں سمجھ لو کہ میری اس لیبارٹری میں کسی بھی وقت تمہیں کام کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔ کبھی میرا موڈ رات میں کام کرنے کے لیے بن جاتا ہے۔ کبھی صبح ہی صبح کام شروع کر دیتا ہوں اور کبھی دوپہر کو، میں تمہیں جس وقت طلب کروں گا تم حاضر ہو جاؤ گے۔ کبھی کوئی خاص ضرورت ہو تو بتا دینا۔ لیبارٹری میں تمہیں یونیفارم دیا جائے گا اور ویسے بھی تمہارا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے تمہیں الاؤنس دیا جائے گا کیونکہ میری لیبارٹری کے اسسٹنٹ کو ذرا ڈیل ڈریس ہونا چاہیے۔"

"اے قسم اللہ کی تم نے تو جان نکال لی اپنی بھائی صاحب مم...... میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب پچاس روپے ایڈوانس نکال کر دکھاؤ۔" شمشو نے کہا اور پروفیسر حشمت اللہ نے پچاس روپے اس کے حوالے کر دیئے۔ شمشو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پیسے لیتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور پھر دل پروفیسر حشمت اللہ کے لیے بری طرح پگھل گیا۔

پروفیسر حشمت اللہ تو سچا ہی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اتنی بڑی نوکری مل گئی تھی۔ پورے ایک سو کا تصور کبھی ابا جان نے بھی نہ کیا ہوگا۔ شمشو کا دل چاہا کہ صوفے سے چھلانگ لگا کر باہر نکل جائے اور یہ خوشخبری اماں کو دے دے لیکن صبر کیا البتہ اب وہ ذرا سعادت مندی سے گفتگو کر رہا تھا۔ دو سو روپے جیب میں رکھنے کے بعد اس نے ذرا گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"پپ...... پروفیسر صاحب میں آپ کا غلام ہوں، بس یوں سمجھ لیجیے کہ کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی آپ کو مجھ سے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں اور تم میرے غلام نہیں بلکہ دوست بنو کیا سمجھے، میں ملازموں کے ساتھ برے سلوک کا عادی نہیں ہوں۔ اب آؤ تمہیں لیبارٹری دکھا دوں۔"

پروفیسر حشمت اللہ اٹھ گیا شمشو اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس بار پروفیسر عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ یہاں ایک تہہ خانہ بنا ہوا تھا۔ اس نے تہہ خانے کی چھ سیڑھیاں طے کیں

اور اس کے بعد وسیع و عریض تہہ خانے میں روشنی کر دی۔ شمشو یہاں کا ماحول دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ طرح طرح کی مشینیں، بھٹیاں یہاں نصب تھیں۔ دیواروں میں بہت سی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب و غریب سماں تھا جو شمشو نے ایک آدھ بار کسی فلم میں دیکھا تھا اور اس کے علاوہ اسے کبھی یہ منظر کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس لیبارٹری کو دیکھتا رہا اور پھر پروفیسر نے آہستہ سے اس سے کہا۔

"آؤ میں تمہیں اس لیبارٹری کے بارے میں تفصیلات بتاؤں۔ سائنس بچپن ہی سے میرا شوق ہے۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو گیا تھا کہ بالآخر میں ایک بڑا سائنسدان بن جاؤں گا۔ اس لیبارٹری میں، میں نے بہت سے فارمولے ایجاد کیے ہیں۔ بس تھوڑی بہت کسر رہ جاتی ہے ان میں ورنہ میں اس وقت چوٹی کے سائنسدانوں میں شمار ہوتا۔ فی الحال میں ایک نظریے پر کام کر رہا ہوں اور تمہیں بھی اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہوگی۔ جانتے ہو نظریہ کیا ہے؟"

"مم...... میں کیا جاؤں؟" شمشو نے گھبرا کر کہا۔

"میں سونا بنانا چاہتا ہوں۔"

"کک...... کیا؟"

"ہاں گولڈ کنگ، میں چاہتا ہوں کہ میں سونا تیار کروں اور اتنا تیار کر لوں کہ میرے مقابلے پر کوئی شخص نہ رہے۔ میں اپنے آپ کو گولڈ کنگ بنانا چاہتا ہوں۔"

"اوہ گولڈ کنگ اچھا نام ہے۔ کسی انگریزی فلم کا چل سکتا ہے۔"

"نہیں یہ نام صرف میرے لیے ہے۔ صرف میرے لیے اور تم دیکھنا ایک دن میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ قبر میں فلاسفورس سے تیار ہونے والی بوتل کی تلاش اسی سونا بنانے کے سلسلے میں تھی بس تھوڑی سی کسر رہ جاتی ہے ورنہ یوں سمجھ لو کہ کام ہو گیا۔"

"تت...... تم سونا بنا لو گے تو پھر اس کا کیا کرو گے؟"

"اسے فروخت کروں گا۔ دنیا بھر میں فروخت کروں گا۔ اس ملک میں دوسرے ممالک میں اور جہاں بھی موقع لگ سکا اس کے بعد میرے پاس دولت کے انبار ہوں گے میں

ایک سونے کا کمرہ بناؤں گا جس کی دیواریں تک سونے کی ہوں گی۔''

''اے قسم اللہ کی یہ تو بالکل کسی فلم کا منظر ہو جائے گا۔''

''پھر فلم؟'' پروفیسر حشمت اللہ نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''نن..... نہیں قسم اللہ کی غلطی ہوگئی۔'' شمشو نے کہا۔ پچاس روپے اس کی جیب میں پُھدک رہے تھے اور یہ لیبارٹری بھی اس کے لیے انتہائی عجیب تھی پھر اس نے کہا۔

''تت..... تو مجھے اس لیبارٹری میں کیا کرنا ہوگا؟''

''تجربات دنیا کے عظیم تجربات' ہم فارمولے تلاش کریں گے ہر قسم کے فارمولے جس کی مدد سے ہم بہت کچھ کما سکیں اور تم نے اس سلسلے میں میری مدد کی تو یوں سمجھ لو کہ وہ فارمولا تمہارے ہی نام سے منسوب کر دیا جائے گا اور تم بھی سائنسدانوں میں شمار ہونے لگو گے۔''

''اے لو مزہ آ جائے گا۔ ابا جان سمجھتے تھے کہ وہ ہی لاٹ صاحب ہیں۔ اب دیکھیں ذرا شمشو کے رنگ۔''

''شمشو یوں سمجھ لو میں تمہیں بہت کچھ بنا دوں گا۔ بشرطیکہ تم نے مجھ سے تعاون کیا۔''

قدموں میں سو جاؤں گا میں آپ کے پروفیسر صاحب پروا نہ کریں آپ نے میری زندگی بنا دی۔''

''چلو اب اس لیبارٹری سے باہر چلتے ہیں' کھانا کھایا تم نے؟''

''اب کھانا تو نہیں کھاؤں گا جی۔''

''تو پھر چلو میں تمہیں چائے پلواتا ہوں۔'' پچاس روپے جیب میں تھے بھلا اس سے زیادہ شمشو کے لیے کیا کیا جا سکتا تھا؟ بہر طور جب وہ وہاں سے واپس چلا تو اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اماں کو یہ خوش خبری کیسے سنائے؟ بہر طور گھر میں داخل ہوا۔ سینہ اکڑا ہوا تھا لیکن نصرت بیگ کو دیکھ کر یہ سینہ خود بہ خود ڈھیلا پڑ گیا۔ نصرت بیگ سے اس کی جان نکلتی تھی۔ نصرت بیگ نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔

''آج جلدی کیسے آ گئے؟''

''بس آ گیا ابا جی تمہارے لیے ایک خوش خبری لایا ہوں۔''

''ہوں کیا خوش خبری ہے؟ فرما دیجئے۔'' نصرت بیگ نے کہا۔

''ابا جی یوں سمجھ لیں مجھے خزانہ مل گیا۔'' شمشو نے کہا اور نصرت بیگ اسے گھورنے لگے۔

''خزانے کے لیے تمہارا دماغ ابھی تک خراب ہے۔ کوئی چکر پھر چلا ڈالا۔ اب کے اگر کوئی حرکت کی اور ان کی چھت پر پائے گئے تو یوں سمجھ لو سب سے پہلے تمہاری ٹانگیں توڑنے والا میں ہوؤں گا۔''

''نہیں ابا جی وہ خزانہ نہیں دوسرا خزانہ ملا ہے مجھے۔ اماں سمجھاؤ ابا کو مگر ٹھہرو تمہاری سمجھ میں ایسے نہیں آئے گا۔''

''ایک منٹ۔'' شمشو نے کہا اور جیب سے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر ابا جی کے قدموں میں رکھ دیئے۔ نصرت صاحب نے روپے دیکھے اور بری طرح چونک پڑے۔

''کہاں سے لائے یہ؟'' انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تمہارے خیال میں کہاں سے لا سکتا ہوں ابا؟''

''بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں بیٹے' انسان کو برے راستوں پر پڑتے ہوئے کوئی دیر نہیں ہوتی۔ لیکن میرے سامنے ذرا سچ ہی بولنا چونکہ جھوٹ پکڑنے کے بعد میرا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔'' شمشو نے عجیب سے انداز میں گردن ہلائی اور اکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نوکری مل گئی ہے ابا جی اور آپ تحقیقات کر سکتے ہیں آپ نے تو ہمیشہ ہی مار پیٹ کر کے ہی مجھے جھکانے کی کوشش کی ہے لیکن پھونکوں سے چراغ بجھایا نہ جائے گا سمجھے پیارے ابا جان۔''

''کچھ گرم چیز کھا گئے ہو۔ ٹھنڈک پہنچاؤں بدن میں۔''

''اے دیکھ لو اماں یہ ابا جی تو کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ نوکری ملی ہے سنبھالو پچاس روپے' مہینے کی پہلی تاریخ کو سو روپے لا کر دوں گا۔''

''ایں۔'' بیگم صاحبہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں

لیکن نصرت بیگ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کہاں نوکری ملی ہے؟"

"ہمارے محلے کے آخری سرے پر پروفیسر حشمت اللہ رہتے ہیں ان کی کوٹھی میں نوکری ملی ہے۔"

"کیا کام کرنا ہوگا؟"

"بس وہ لیب..... لیب..... لیب..... کرنا ہوگا۔"

"کیا کرنا ہوگا؟"

"ابا جان کیوں کان کھا رہے ہیں۔ سیکرٹری بنا ہوں ان کا۔"

"تم.....؟" نصرت نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں۔ کیوں آپ کا خیال ہے میں کسی کا سیکریٹری نہیں بن سکتا؟"

"حشمت اللہ سے بات کیے بغیر یقین نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو بات کر لیجیے گا جب آپ کا دل چاہے۔ اماں کل سے ڈیوٹی پر جانا ہوگا او سنو میری ڈیوٹی کسی بھی وقت لگ سکتی ہے۔ صبح شام دوپہر رات چنانچہ میرے لیے ہر وقت کھانا تیار ہونا چاہیے۔ یہ پچاس روپے ایڈوانس رکھ لینا اور لباس وغیرہ بھی ملے گا اور وہاں لیب میں ...... میرا مطلب ہے کیا ہوتی ہے وہ لیبوٗرٹری میں کام کرنے کے لیے یونیفارم بھی' کیا سمجھیں؟"

"اے اللہ تیرا شکر ہے اگر تو سچ کہہ رہا ہے تو یوں سمجھ لے میری دعا پوری ہوگئی۔ آج ہی نذر کراؤں گی۔" بیگم صاحبہ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ نصرت بیگ البتہ بار بار مشتبہ نگاہوں سے شمشو کو دیکھنے لگتے تھے۔

◇◇◇

قمرو نے جگی ہوٹل میں بالآخر نوشہ میاں کو پالیا۔ نوشہ میاں ان دنوں قمرو میاں سے کچھ بددل ہوگئے تھے اور بات اسی وقت سے بگڑ گئی تھی۔ جب شاہ جہانی بیگم غائب ہوگئی

تھیں۔ اس وقت بھی نوشہ میاں نے قمرو کو دیکھ کر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور خاموش بیٹھے رہے لیکن قمرو مسکراتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"چائے کو بھی نہ پوچھو گے نوشہ میاں؟"

"نہیں..... نہیں چائے پی لو۔" نوشہ میاں نے اخلاقاً کہا۔ قریب آیا تو قمرو میاں بول پڑے۔

"ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ نوشہ میاں ہم نے تمہاری سونے کی چڑیاں پھر سے پکڑ لی ہیں۔"

"کک..... کہاں؟ کہاں ہیں وہ کیسی ہیں؟"

"جیسی تھیں ویسی ہی ہیں' بالکل ٹھیک ہیں۔"

"مگر یار اب ذرا جلدی سے یہ تو بتا دو کہ ہیں کہاں؟"

"ہماری کھولی ہیں۔"

"ایں۔" نوشہ میاں اچھل پڑے۔

"ہاں وہیں پر ہیں۔ سب کی سب پہنچ گئی ہیں۔"

"ابے کیسے؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟"

"ملائی والی چائے پی لیں تو بتا دیں گے۔"

"اٹھو قمرو میاں جلدی چلو' تمہیں ولیو کی قسم تم نے تو میرا پتا پانی کر دیا ہے۔" نوشہ میاں ہانپتے کانپتے ان کے ساتھ چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بیرکوں کے علاقے میں داخل ہوگئے اور پھر قمرو نے اپنی بیرک کے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

"اماں نوشہ میاں آ گئے ہیں۔ ہم اندر آ رہے ہیں۔" اور چند ہی لمحات کے بعد وہ دونوں اندر داخل ہوگئے۔ شاہ جہانی بیگم نے نوشہ میاں کو دیکھا اور چہرہ لٹکا لیا۔ نوشہ میاں نے باری باری ممتاز' نور جہاں اور سلطانہ کو دیکھا۔ سلطانہ کی گود میں ننھی سی بچی دیکھ کر انہوں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی تھی۔ سلطانہ انہیں دیکھ کر مسکرا دی'

"کیسے ہیں نوشہ میاں؟" اس نے سوال کیا اور نوشہ میاں ایک بار پھر چونک

پڑے۔ سلطانہ تو پہلی بار ہی مخاطب ہوئی تھی ان سے۔ ویسے بھی سلطانہ ان کے لیے اجنبی تھی۔ نور جہاں اور ممتاز کو تو خیر بچپن ہی سے جانتے تھے لیکن یہ حسین لڑکی انہوں نے شاہ جہاں بیگم کے ساتھ پہلی مرتبہ ہی دیکھی تھی۔

"ٹھیک ہے بی بی تم سناؤ۔"

"ہم بھی ٹھیک ہیں نوشہ میاں آپ نے تو ہماری خوب کرکری کی۔ بڑے عیش کرا دیئے آپ نے ہمیں۔"

"لو بی بی الزام مجھ پر ہی آتا ہے قسم ولیوں کی تم نہیں جانتیں میری شاہ جہاں بیگم سے کیسی یاداللہ تھی۔ شاہ جہاں نے تو آنکھوں پر ٹھیکرے رکھ لیے مگر میں نے ہمیشہ ان کی بہتری کے بارے میں سوچا یہ دوسری بات ہے کہ بعض بدنصیبوں کا اچھا سوچا ہوا بھی برا بن جاتا ہے۔ شاہ جہاں بیگم نے میری کبھی نہ مانی۔"

"اب چھوڑو ان شکوہ شکایت کو نوشہ میاں ہم نے تو تمہیں خاص طور سے بلوالیا۔"

"مہربانی نے آپ کی۔ بی کیا نام ہے آپ کا؟"

"سلطانہ۔"

"سلطانہ بی بی آپ میرے لیے اجنبی ہیں لیکن شاہ جہاں بیگم سے پوچھ لیجئے مجھ سے بڑا وفادار انہیں زمین پر نہیں ملے گا۔ قسم ولیوں کی۔"

نوشہ میاں آپ سے کچھ گفتگو کرنا ہے ذرا تنہائی میں۔"

"ہاں......ہاں ضرور مگر تنہائی؟"

"برابر والی کھولی میں چلتے ہیں۔"

"آیئے نوشہ میاں نے کہا اور سلطانہ نے کرن کو شاہ جہاں بیگم کی گود میں دے دیا۔ شاہ جہاں بیگم پتھر کے بت کی مانند ساکت تھیں نور جہاں اور ممتاز بھی خاموشی سے سلطانہ کی کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ سلطانہ نوشہ میاں کے ساتھ برابر کی کھولی میں داخل ہوگئی۔ جس میں وہ پہلے کبھی رہتی تھیں۔ یہاں زمین پر بس ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ سلطانہ اطمینان سے چادر پر بیٹھ گئی اور نوشہ میاں سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ نوشہ میاں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئے تھے۔ سلطانہ

کہنے لگی۔

"بات دراصل یہ ہے نوشہ میاں کہ شاہ جہاں بیگم پر پاکستان آنے کے بعد وطن پرستی کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ وطن پرستی بے شک اپنی جگہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے لیکن بھوک سب سے بڑی حقیقت۔ چنانچہ اس کا توازن قائم کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ باقی سارے بھوت بھوک کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ کم از کم میرا یہی نظریہ ہے اور میں نے اس نظریئے پر شاہ جہاں بیگم کو قابل کرنے کی کوشش کی۔ شاہ جہاں بیگم خود تو نہ مانی لیکن میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ اب جو کچھ بھی کرنا ہے مجھے کرنے دیا جائے اور اس وعدے کے تحت میں یہاں واپس آئی اور قمرو کے ذریعے تمہیں تلاش کرایا۔"

"قسم ولیوں کی آپ نے ایسا کام کیا ہے کہ آپ کو پھولوں میں تول دیا جائے۔"

"تو پھر کب تول رہے ہیں ہمیں پھولوں میں؟" سلطانہ نے کہا۔

"دیکھو سلطانہ بیگم میں نے ایک بات کہی تھی۔ شاہ جہاں بیگم سے 'وہ عورت ہیں' دو جوان بیٹیوں کی ماں ہیں۔ تم ان کی کون ہو یہ تو میں نہیں جانتا لیکن بہر طور تم بھی انہی کے ساتھ دیکھی گئی ہو۔ آج تک کیا تم نے اس ماحول میں اپنے لیے کوئی ایسی جگہ تلاش کی جہاں تمہیں عزت کی روٹی مل سکے۔ ہم آج بھی اس بات کے لیے تیار ہیں کہ شاہ جہاں بیگم بس ایک اشارہ کر دیں ہم ان کے لیے اچھے سے اچھا کوٹھا مہیا کر دیں گے یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

"کیسے؟ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے نوشہ میاں۔"

"اس کی ذمہ داری آپ لوگوں کی نہیں ہے جب نوشہ نے ایک پیش کش کی ہے تو وہ اسے نبھانا بھی جانتا ہے۔" "سوچ لو نوشہ میاں ہم آپ کو ایک پائی بھی نہ دے سکیں گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں سلطانہ بی بی مجھے ایک پائی کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ میں آپ لوگوں کو ٹھکانا مہیا کیے دیتا ہوں۔ وہاں سارے انتظامات کر دوں گا اور جب آپ لوگ کمانا شروع کریں تو آہستہ آہستہ رقم ادا کر دیں۔ یہ کام اگر نوشہ میاں پر اعتبار ہو تو ان کے سپرد کر دیا جائے۔"

"تو پھر نوشہ میاں میں یہ کام آپ کے سپرد کر دیتی ہوں۔"

نوشہ میاں اچھل پڑے۔ انہوں نے حیرت بھری نگاہوں سے سلطانہ کو دیکھا اور بولے۔

''بی بی اتنی بڑی بات کر رہی ہو کہ یقین نہیں آتا۔''

''اگر یقین کرنے کا کوئی ذریعہ ہے تو آپ مجھے وہ بتا دیں تا کہ میں آپ کو یقین دلا دوں۔''

''نہیں...... نہیں آپ کی بات پر تو یقین کرنا ہی پڑے گا۔ مگر شاہ جہاں بیگم سے ایک بار کہلوا دیں تو......''

''نہیں شاہ جہاں بیگم یہ بات آپ سے کبھی نہیں کہیں گی۔ سنیے نوشہ میاں میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ شاہ جہاں بیگم نور جہاں اور ممتاز کو وہاں لے جاؤں گی جہاں آپ ہمارے لیے ٹھکانہ بنائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ ٹھکانے کا ایک معیار ہونا چاہیے۔''

''ارے اس کی تو فکر ہی نہ کریں۔ شاہ جہاں بیگم کو ہی ماحول مہیا نہ کر دوں تو نوشہ کے بجائے گدھا کہہ دینا۔ بولو کتنا ٹائم دیتی ہو؟''

''یہ تو آپ پر منحصر ہے نوشہ میاں۔''

''تین دن، قسم ولیوں کی۔ صرف تین دن میں وہ کر دکھاؤں گا کہ الہ دین کے چراغ کا جن بھی نہ کر کے دکھا سکے۔''

''تو پھر آپ تیاریاں کیجیے میرا آپ سے وعدہ۔''

''سلطانہ بی بی ایک بار پھر سوچ لو اگر بعد میں بات سے بدلیں تو پھر نوشہ میاں کا کباڑہ ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ ہم مریں گے تو تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''ٹھیک ہے نوشہ میاں آپ انتظام کریں۔ میں نے اچھی طرح سوچنے کے بعد ہی آپ سے بات کہی ہے۔''

''تو پھر ہمیں ابھی اجازت دو کام کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ تین دن تم نے ہمیں دیئے ہیں بس ان تین دنوں میں ہم پورا کر دکھائیں گے۔ ایک آدھ دن بڑھ جائے تو مجبوری سمجھنا لیکن تمہیں رپورٹ ضرور دیں گے۔''

''ٹھیک ہے نوشہ میاں آپ جا سکتے ہیں۔'' نوشہ میاں سلطانہ کے ساتھ باہر نکلے تھے اور پھر قمرو کی کھولی میں اندر نہیں آئے تھے بلکہ انہوں نے وہیں سے قمرو کو آواز دے لی تھی۔ قمرو باہر پہنچا تو نوشہ میاں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''قمرو اب یوں سمجھ لو تمہاری اور ہماری تقدیر بدل گئی۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ تو تجھے چند روز کے بعد ہی بتاؤں گا میرے دوست۔'' نوشہ میاں نے جواب دیا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے۔ قمرو ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا۔

◇◇◇

شمشو نے ڈیوٹی پر جانا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے دن صبح کو وہ پروفیسر حشمت اللہ کی رہائش گاہ میں پہنچا تو پروفیسر نے بڑے خشک انداز میں اس کا استقبال کیا۔ اس کا تعارف اپنے دونوں ملازموں سے کرایا اورا کے بعد اسے لیبارٹری میں لے گئے۔

لیبارٹری میں شاید کام شروع تھا۔ پروفیسر ایک مشین کے پاس پہنچ گیا اور اس نے شمشو سے بھٹی جلانے کے کہا۔ شمشو نے بھٹی جلا دی اور پروفیسر ایک اور بھٹی پر مصروف ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ چیزیں ا بڑے سے برتن میں ڈالیں۔

''تم نے پدی کا تیل ھا ہے کبھی؟''

''پپ...... پدی ہی نہ دیکھی چچا جان مم...... میرا مطلب ہے پروفیسر پدی کا تیل کہاں سے دیکھا ہے؟''

''اوہ بہت کچھ دیکھنا ہیں اس دنیا میں صاحبزادے خیر...... خیر کوئی بات نہیں یہ پدی کا تیل نکل رہا ہے۔''

''اس کا شوربہ مم...... میرا مطلب ہے لوگ کہتے ہیں چہ...... پدی...... چو پدی کا شوربہ۔''

''لوگ بے وقوف ہیں اس طرح وہ پدی کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ پدی اوہ چھوڑو

تمہیں بھلا ان باتوں سے کیا سروکار ہوگا۔"

پدی کا یہ تیل اگر صرف چند قطرے ہمیں دستیاب ہو جائے تو ہمارے لیے بہت کار آمد ہوگا۔"

"مگر پروفیسر صاحب یہ پدی آپ پکڑ کہاں سے لائے؟" جواب میں پروفیسر حشمت آہستہ سے ہنسا تھا پھر اس نے کہا۔

"کام کرو، فضول کاموں میں سر نہیں کھپاتے۔"

"شمشو تقریباً چار بجے تک پروفیسر حشمت اللہ کے ساتھ رہا۔ دوپہر کو اسے بہترین کھانا پیش کیا گیا۔ شام کو چار بجے پروفیسر حشمت اللہ نے کہا۔

"تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا لباس نہیں ہے؟"

"بس چھوڑیں پروفیسر صاحب بات پھر ابا جان تک آ جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی حالت کا رونا روتے رہتے ہیں۔"

"ہوں آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کبیر اللہ کے کچھ لباس دیتا ہوں۔ تمہارے بدن پر درست آئیں گے۔" پھر انہوں نے واقعی شمشو کو کچھ لباس دیئے تھے۔ ایسے لباس جو شمشو نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ لباس ہاتھ میں لیتے ہوئے انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسے پکڑواؤ گے کیا؟ لوگ پوچھیں گے کہ یہ کپڑے کہاں سے آئے تو کیا جواب دوں گا؟ پہلے ابا جان ہی کھوپڑی پر طبلہ بجائیں گے؟"

"جو کوئی تم سے اس سلسلے میں سوال کرے اسے میرا حوالہ دے سکتے ہو۔ تم میرے سیکریٹری ہو۔ لیب اسسٹنٹ ہو۔ کل یہی لباس پہن کر آنا۔" اور پھر واقعی یہ لباس شمشو کے لیے مصیبت بنے رہے تھے۔ نہ صرف بیگم صاحبہ بلکہ نصرت بیگ صاحب بھی سخت پریشان رہے تھے اور انہوں نے اس سلسلے میں کافی تشویش کا اظہار کیا تھا بیگم صاحب نے جل کر نصرت بیگ سے کہا۔

"تم تو بچے کو پہنتے اوڑھتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ اگر ایسا ہی کچھ شبہ ہے تو جاؤ پروفیسر

حشمت اللہ کا گھر کتنی دور ہے۔" نصرت بیگ پہلو بدل کر خاموش ہو گئے تھے۔ رات بھر یہ لباس شمشو کی نگاہوں میں ناچتا رہا اور صبح ساڑھے چھ بجے ہی جاگ کر اس نے غسل کیا پھر اس لباس کو اہتمام سے پہننے لگا۔ شہزادہ ہی بن گیا تھا اور اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب پہننے اوڑھنے کا معاملہ ہے۔ آدمی کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ بہرطور اس روپ میں پروفیسر حشمت اللہ کی رہائش گاہ میں داخل ہوا۔ آج پروفیسر حشمت اللہ کا موڈ بالکل مختلف تھا۔ ویسے اس دوران صرف کبیر اللہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پہلے دن ملازم اس سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ پروفیسر حشمت اللہ نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

"مسٹر شمشاد بیگ آیئے...... بیٹھ جایئے۔ آج میرا لیبارٹری میں کام کرنے کو موڈ نہیں ہے۔ کل کی کوششوں سے کچھ بھی نہ حاصل ہو سکا لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ بیٹھ جایئے آج میرے ذہن میں ماضی طوفان کی طرح امڈ رہا ہے۔" شمشاد بیگ خاموشی سے پروفیسر کے سامنے بیٹھ گیا۔ پروفیسر نے ایک سرد آہ بھر کر صوفے کی پشت گاہ سے گردن ٹکالی تھی۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ شمشو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج کی یہ ڈیوٹی کس طرح انجام دینی ہے۔ چند لمحات کے بعد خود پروفیسر حشمت اللہ ہی نے کہا۔

"تم بور تو نہیں ہو رہے؟"

"نہیں پروفیسر صاحب مگر آج کیا کرنا ہوگا؟"

"آج کچھ نہیں کرنا ہوگا۔ میرے سامنے بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔ مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں سوالات کرو۔"

"اور ڈیوٹی ختم؟" شمشو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"نہیں پروفیسر، بس ایک پچاس روپے چاہیے تھے دراصل وہ......"

"کچھ نہیں...... کچھ نہیں لو یہ ایک پچاس کا نوٹ رکھ لو۔ میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ جب بھی کچھ ضرورت ہو مجھ سے بے تکلفی سے بیان کر دینا۔" شمشو نے پچاس کا نوٹ لے

کر جیب میں رکھ لیا۔اس کے سینے میں گرمی دوڑ رہی تھی۔ پچاس روپے پہلے دن ملے تھے۔ پچاس روپے آج بھلا پروفیسر کی محبت جس قدر اس کے دل میں نہ بڑھ جاتی کم تھا۔اسے پروفیسر کے ماضی سے پوری پوری دلچسپی ہوگئی۔ پروفیسر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''میں اس دنیا کا سب سے بدنصیب انسان ہوں۔''

''اے نہیں چچا جان میرا مطلب ہے پروفیسر سب سے بدنصیب انسان میں ہوں۔''شمشو نے کہا۔

''تم؟'' پروفیسر نے بھوئیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

''تو اور کیا ابا نے سارے کبوتر اڑا دیئے' آپ یقین نہیں کریں گے کہ میرے دل پر کتنی چھریاں چلتی ہیں۔''

''اوہ بے وقوف آدمی تم جتنے کبوتر چاہو خرید لینا۔ میرا مطلب ہے میں تمہیں اس کے لیے رقم دے سکتا ہوں۔اپنی بدنصیبی کا رونا میرے سامنے نہ رو۔مجھ سے زیادہ بدنصیب نہیں ہوسکتے تم۔''

''چلو ٹھیک ہے تم زیادہ بدنصیب ہوگے۔''شمشو نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔

''میری زندگی کا آغاز بڑی بے کسی کے عالم میں ہوا تھا۔''

''ٹیاؤں ٹیاؤں کر کے روتے ہوگے۔''شمشو نے کہا۔

''ہاں ساری زندگی ہی میں ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا رہا ہوں' بالکل کسی کتے کے پلے کی مانند' محبت سے محروم دنیا کے تمام جذبوں سے ناآشنا۔میرے دل میں بھی یہ خواہش رہی کہ کوئی مجھے چاہے' مجھ سے محبت کرے لیکن اس روئے زمین پر وہ ناپید تھے جو مجھے پیار کرتے۔''

''کمال ہے اماں نہیں تھی تمہاری؟''شمشو نے سوال کیا۔

''ہوگی کبھی جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ نہیں تھی۔کرم فرماؤں کے رحم و کرم پر تھا اور اسی طرح میری پرورش ہوئی پتا نہیں وہ کون تھا جس نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا اور پتا نہیں وہ کون تھے جو اچھے نمبروں سے مجھے پاس کرتے چلے گئے۔میری زندگی ایک ویرانے میں کھڑے ہوئے تنہا درخت کی مانند تھی اور پھر اس تنہائی میں ایک اضافہ ہوا اور میں نے سوچا

کہ شاید زندگی کی خوشیاں میری جھولی میں آ پڑی ہیں۔''

''وہ کون تھا؟''شمشو نے دلچسپی سے سوال کیا اور پروفیسر اس کی صورت دیکھتا رہا پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اٹھو آؤ۔''

''کک...... کہاں؟ لیبائی میں؟''

''لیبائی کیا؟''

''میرا مطلب ہے وہی۔''

''اوہ بے وقوف آدمی تم اسے تجربہ گاہ کہہ لیا کرو۔ میں اس کے نام کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔''

''تجربہ گاہ...... تجربہ گاہ یہ آسان لفظ ہے تو وہاں چل رہے ہو پپ پیارے بھائی؟''

''مم میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب۔''

''نہیں آؤ میں تمہیں اپنے پرائیویٹ کمرے میں لیے چل رہا ہوں۔''شمشو نے کوئی جواب نہیں دیا نوکری تو نوکری ہی ہوتی ہے۔لیکن یہ پروفیسر کافی دلچسپ آدمی معلوم ہوتا تھا۔تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر ایک کمرے میں پہنچ گیا۔اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور روشنی جلائی۔یہاں بھی عمدہ قسم کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔اس نے اسے ایک سیٹھی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور خود ایک الماری کی جانب بڑھ گیا۔الماری سے اس نے کوئی چیز نکالی اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا شمشو کے سامنے آ بیٹھا۔تصویروں کا البم تھا۔جسے پروفیسر نے کھول لیا اور پھر وہ البم کے پہلے صفحے پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھتا رہا۔اس کے بعد اس نے یہ تصویر شمشو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے دیکھو۔'' تصویر کسی لڑکی کی تھی۔دوپٹہ دانتوں میں لیے مسکرا رہی تھی۔آنکھیں زیادہ نظر آ رہی تھیں۔باقی خدوخال دوپٹے میں چھپ گئے تھے لیکن بہرطور ایک نوجوان لڑکی تھی۔پرانے طرز کا لباس پہنے ہوئے۔شمشو اسے دیکھ کر ہنس پڑا اور پروفیسر نے

غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں تم ہنسے کیوں؟''

''کک کچھ نہیں بس ایسے ہی یہ کون ہے؟''

پروفیسر نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ البم اس کے ہاتھ سے لے لیا اور تصویر کو دیکھتا رہا پھر اس نے البم واپس شمشو کی جانب بڑھا دیا اور ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

''اس کا نام ترنم ہے۔میری تنہائیوں کی پہلی رفیق' میں تمہیں اس کے بارے میں تفصیل نہیں بتاؤں گا بس یوں سمجھو کہ یہ باد بہاری کے ایک جھونکے کی مانند میری زندگی میں آئی اور اس نے میرے پورے وجود کو معطر کر دیا پھر یہ اسی طرح واپس چلی گئی جس طرح باد سموم کا جھونکا۔ساری کائنات زہر آلود کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔میں اس کی یاد میں تڑپتا رہ گیا۔''

''کہاں چلی گئی تھیں؟''شمشو نے پوچھا۔

''اس کی شادی ہو گئی تھی اور پھر شادی کے تین سال کے بعد جب یہ میرے سامنے آئی تو اس کی گود میں ایک کتیا کا پلا دبلا ہوا تھا۔اس نے پلے کو ہوا میں اچھال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ جاؤ بیٹا ماموں کے پاس جاؤ۔میں نے دونوں کو جوتے مار کر باہر نکلوایا تھا اور تم خود سمجھ سکتے ہو کہ میری ذہنی کیفیت کیا ہوئی ہو گی آہ...... آہ......''

''مم......مگر پروفیسر آپ نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی؟''شمشاد بیگ نے درد مندی سے پوچھا لیکن پروفیسر کی بھوئیں چڑھ گئیں۔وہ انگلی اٹھا کر بولا۔

''دیکھو تمہیں میرے ذاتی معاملات کریدنے کی اجازت نہیں ہے۔پہلی غلطی معاف کر رہا ہوں۔دوسری معاف نہیں کروں گا۔''شمشاد بیگ سنبھل گیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پہلا معاملہ ذاتی تھا یا دوسرا ذاتی ہے۔بہر طور نوکری سر انجام دے رہا تھا۔جیسے پروفیسر کہتا ویسے ہی درست تھا چنانچہ سنبھل کر خاموش بیٹھ گیا۔پروفیسر نے ایک بار پھر صوفے کی پشت گاہ سے گردن ٹکالی تھی۔البم اس کی گود میں رکھا ہوا تھا۔چند لمحات کے بعد وہ سیدھا ہوا اور اس نے البم کا دوسرا صفحہ الٹ دیا۔

''اسے دیکھو''شمشاد بیگ نے البم اٹھا لیا۔دوسری تصویر بھی ایک لڑکی ہی کی تھی

جو پہلی لڑکی سے کسی قدر جدید لباس میں نظر آ رہی تھی اور اس کا پورا چہرہ بھی نمایاں تھا۔شمشاد بیگ نے سوالیہ نگاہوں سے پروفیسر کی جانب دیکھا تو پروفیسر مسکراتا ہوا بولا۔

''یہ ناہید ہے۔''

''بب......بڑی خوشی ہوئی اس سے مل کر۔''شمشاد بیگ نے کھیسیں نکالتے ہوئے کہا اور پروفیسر ایک بار پھر بگڑ گیا۔

''تمہیں کیوں خوشی ہوئی؟''

''جی سب آپ کی خوشی میں خوش ہیں ہم تو وہ جو کہتے ہیں کہ......''

''کچھ نہیں بس' خاموش بیٹھو تمہیں اس سے مل کر خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس نے میری خوشیاں لوٹ لیں۔''

''وہ کیسے پروفیسر؟''شمشاد بیگ نے پوچھا۔

''آہ! یہ بہار کی وہ نوشگفتہ کلی تھی جو بہار کی آمد کے ساتھ ساتھ کھلتی ہے اور خزاں بن کر رخصت ہو جاتی ہے۔اس نے ...... اس نے میرے ہوش وحواس پر بجلیاں گرائی تھیں اور میں......میں اس کے لیے دیوانہ ہو گیا تھا۔آہ کاش نہر کھودنے کا دور ہوتا تو میں اس دور کا فرہاد کہلاتا اگر دور لیلیٰ مجنوں کا ہوتا تو میں دشت میں خاک چھانتا نظر آتا۔کتنا چاہا تھا میں نے اسے۔کتنا چاہا تھا لیکن ......لیکن یہ بھی مجھ سے جدا ہو گئی۔میں اپنے سینے کے کون کون سے زخم دکھاؤں تمہیں' تیسرا صفحہ الٹو۔''پروفیسر نے کہا اور شمشو نے ہاتھ میں پکڑے البم کا تیسرا صفحہ الٹ دیا۔اس صفحے پر ایک نئی تصویر تھی اور پروفیسر اس تصویر کے لیے بھی آہیں بھرنے لگا۔شمشاد بیگ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پروفیسر درحقیقت ان میں سے کون سے چہرے کا عاشق تھا۔ہر نئے چہرے کے بعد وہ ایک دردناک کہانی سناتا اور یوں محسوس ہوتا کہ اس کی محبت یہاں ختم ہو گئی ہو لیکن صفحہ الٹتے ہی نیا چہرہ سامنے آ جاتا تھا اور پروفیسر اس کے لیے آہیں بھرنے لگتا تھا۔شمشاد بیگ نے گردن ہلائی ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔

''بیٹا مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ لیب اسسٹنٹ کی نوکری اتنی سخت ہوتی ہے خیر کوئی بات نہیں' ڈھائی سو روپے سے تو کٹ گئے ہو۔اگر اس طرح کٹتے رہو تو ایک سو بیس عشق کی

داستانیں سنا سکتے ہو۔'' لیکن یہ بات اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں رکھی تھی اور پروفیسر کے کانوں تک نہیں پہنچنے دی تھی یہاں تک کہ البم کا آخری صفحہ ختم ہو گیا اور شمشاد بیگ نے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو ان میں سے کوئی بھی میری چچی نہیں بن سکی؟''

''کیا؟'' پروفیسر دہاڑا۔

''م...... میرا مطلب ہے پروفیسرنی...... پروفیسرنی۔'' شمشاد بیگ جلدی سے بولا۔

''نہیں۔''

''مگر پروفیسر آپ نے آخری عشق کس سے کیا؟ میرا مطلب ہے یہ سب تو چلی گئیں۔''

''آخری اور حقیقی' دراصل مجھے ان تمام خواتین کے سلسلے میں غلط فہمیاں ہوئی تھیں اور یہ ایک سچائی بھی تھی ڈیئر شمشو کہ میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چاہا تھا۔ چاہتیں دیوانگی کی حدود میں لے جاتی ہیں اور انسان موت وزیست میں سے ایک کا انتخاب کر لیتا ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنی حقیقی چاہت دکھاؤں۔''

''بیڑا غرق' ابھی حقیقی چاہتوں کا سیکشن باقی رہ گیا ہے؟'' شمشو نے دل ہی دل میں سوچا لیکن بہر طور پروفیسر کے ساتھ اٹھ کر چل پڑا تھا۔ اس بار پروفیسر اسے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ یہ کمرہ ایک خواب گاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور خواب گاہ میں صرف ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ بہت بڑی تصویر جو شیشے کے فریم میں آویزاں تھی لیکن یہ تصویر ان تمام تصویروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ پروفیسر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتا رہا اور اس کے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ شمشاد بیگ خاموشی سے پروفیسر کی صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ خود بھی ایک سمت کھڑا ہوا تھا۔ یہ عجیب وغریب نوکری اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن بری بھی کیا تھی؟ دو دن میں ڈھائی سو کما لیے تھے اگر دو چار مہینے بھی چل جائے تو عیش ہو جائیں گے پھر اباجان اسے نکما اور نکھٹو ہونے کا طعنہ نہیں دے سکیں گے اور پھر حرج بھی کیا ہے بھاگ دوڑ

سے بھی بچت۔ بس الٹی سیدھی کہانیاں سنتے رہو۔ پڈی کا تیل نکالتے رہو اور بات ختم پروفیسر کافی دیر کے بعد چونکا تھا۔ اس نے شمشو کی طرف دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

''یہ تصویر اس وقت کی ہے جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔''

''دوسری بار کی بھی کوئی تصویر ہے؟'' شمشو نے سوال کیا۔

''ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔'' پروفیسر ایک بار پھر ایک الماری کی جانب بڑھ گیا اور شمشاد بیگ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اب اس الماری سے بھی تصویروں کا کوئی البم برآمد ہوگا اور پروفیسر اپنے بہت سے آخری عشق کی داستانیں سنائے گا۔ شمشاد بیگ نے پشت سے پروفیسر کو دیکھا اور پھر غصیلے انداز میں دل ہی دل میں سوچا۔

''ٹھیک ہے بیٹا تم سنالو مجھے اپنے عشق کی ایک سو بیس داستانیں۔ اگر ایک سو چالیس نہ سنائیں تو میرا نام بھی شمشاد بیگ نہیں ہے۔'' پروفیسر تھوڑی دیر کے بعد واپس پلٹا اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت البم دبا ہوا تھا۔ وہ شمشاد بیگ کے قریب آ بیٹھا اور اس نے البم کا پہلا صفحہ کھول دیا۔ جس پر یہی تصویر لگی ہوئی تھی جو دیوار پر آویزاں تھی۔

''ان کا نام کوثر جہاں ہے' کوثر جہاں ایک بہت ہی اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی خاتون تھیں اور ہمارا گھر ان کے گھر کے عین سامنے تھا۔''

''یہ تو مثنوی زہر عشق ہو گئی۔''

''بالکل مصنوعی نہیں تھا۔ حقیقی زہر عشق ہے یہ کیا سمجھے؟'' پروفیسر نے بگڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہاں چچا میاں م...... میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب میں مثنوی کہہ رہا تھا مصنوعی نہیں۔''

''اوہ اچھا...... اچھا تو یہ کوثر...... جسے میں ہمیشہ آب کوثر کہتا تھا پہلی بار کمپنی باغ میں مجھے نظر آئی۔ موسم بہار کا آغاز تھا۔ آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار زمین تک پہنچ رہی تھی۔ ہواؤں کے بھیگے ہوئے جھونکے بدن میں نہ جانے کیسی کیفیات پیدا کر رہے تھے۔''

''ایک منٹ پروفیسر صاحب' ایک منٹ آپ کے ہر عشق کا آغاز موسم بہار کے

پہلے جھونکے ہی سے ہوتا ہے۔اس کی کیا وجہ ہے؟ کبھی سردیوں میں آپ کو کوئی عشق نہیں ہوا؟ یا گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں کوئی حسینہ آپ کو نظر نہیں آئی؟'' پروفیسر نے سنجیدہ نگاہوں سے شمشو کو دیکھا اور بولے۔

''او بے وقوف انسان سردیوں کی کڑکڑاتی صبح اور شامیں عشق کرنے کے لیے موزوں کہاں ہوتی ہیں۔اس وقت تو انسان اپنی ہی مصیبت کا شکار ہوتا ہے اور پھر گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ ارے باپ رے پسینہ سر سے بہتا ہے تو ایڑی تک پہنچ جاتا ہے۔ایسے اوقات میں اگر کوئی حسینہ نظر بھی آ جائے تو انسان کسی سائے کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔وہاں سے عشق کا آغاز کیسے ہو سکتا ہے؟''

''نہیں چچا میاں پروفیسر، عشق تو سنا ہے کہ سولی پر بھی ہوتا ہے۔''

''غلط سنا ہے تم نے سیکریٹری۔سولی کا محاورہ نیند کے لیے ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اے تم نے کیا بکواس شروع کر دی۔تم سیکریٹری ہو یا میرے چچا؟ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں غور سے سنو۔میں تمہیں بتا رہا تھا کہ موسم بہار کا پہلا جھونکا۔خبردار اب درمیان میں دخل مت دینا۔''

''نہیں دوں گا مم......مگر وہ ایک پچاس روپے ہوں گے پاس؟''

''ہاں ہیں لو یہ رکھ لو اور خاموش بیٹھو۔'' پروفیسر نے پچاس کا نوٹ نکال کر شمشو کے سامنے پھینک دیا اور اس کے بعد بھلا شمشو کی زبان کیسے کھل سکتی تھی۔پروفیسر نے کہا کہ کوثر جہاں سے اس کے عشق کا آغاز کمپنی باغ میں ایک بہاروں بھری صبح میں ہوا اور اس کے بعد کوثر جہاں سے اس کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔پروفیسر اس کے ساتھ ساتھ ہی ہر ملاقات کی ایک تصویر دکھاتا جا رہا تھا۔شمشو سے بولے بغیر نہ رہا گیا۔

''اے چچ......چا میرا مطلب ہے پروفیسر کیا آپ فوراً کیا آپ فوٹوگرافر کو ساتھ لیے پھرتے تھے؟''

''کیا مطلب؟''

''یہ ہر موقع کی ایک تصویر۔''

''اور مجھے فوٹوگرافی کا شوق جنون کی حد تک تھا۔اس وقت یہی میرا محبوب مشغلہ تھا اور کیمرہ۔یہ کیمرہ شاید پورے شہر میں سب سے شاندار کیمرہ تھا۔جس سے میں اس محبوبہ عالم کی تصاویر بنایا کرتا تھا۔میں نے تم سے پہلے ہی کہا ہے کہ بیچ میں دخل نہ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''اب نہیں دوں گا۔'' شمشاد بیگ نے کہا۔

''بالآخر میرا رشتہ کوثر جہاں کے لیے گیا اور ان کے ناہنجار والد صاحب نے صاف گوئی سے انکار کر دیا جب کہ ان کی بیٹی نے صاف صاف ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ شادی کرے گی تو صرف پروفیسر حشمت اللہ سے۔نتیجہ یہ نکلا کہ نہ انہوں نے شادی کی اور نہ ہم نے اور یہ ان کی آخری تصویر ہے۔'' پروفیسر نے تقریباً ایک چالیس سالہ خاتون کی تصویر شمشاد بیگ کے سامنے کر دی اور شمشاد حیرت سے اچھل پڑا۔

''ب......بوڑھی ہو گئیں۔''

''ہاں وہ بوڑھی ہو گئیں۔انہوں نے بھی شادی نہ کی اور میں نے بھی نہ کی۔''

''مگر چچا؟'' پروفیسر غرایا۔

''معاف کیجئے گا پروفیسر صاحب میرا مطلب ہے کوثر جہاں کے والد صاحب اتنے عرصے زندہ رہے؟''

''نہیں کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا لیکن کوثر جہاں نے کہا کہ جب ان کے سرپرست ہی نہ رہے تو پھر کیا فائدہ شادی کرنے کا۔''

''کمال ہے عجیب ٹریجڈی ہے۔میرا خیال ہے یہ منظر نہیں چلے گا۔فلم کا منظر بدلنا چاہیے۔''

''فلم۔'' پروفیسر غرایا۔

''نن......نہیں ب......بالکل نہیں......قطعی نہیں۔''

شمشاد بیگ جلدی سے بولا اور پروفیسر مغموم انداز میں اس تصویر کو دیکھتا رہا۔شمشاد

بیگ نے بھی کئی مرتبہ اس تصویر کو دیکھا۔ بڑھاپے میں بھی کافی حسین تصویر تھی۔ بہرطور آج کا دن عشق عاشقی کی نذر ہو گیا اور اس کے بعد پروفیسر نے اس سے پوچھا۔

''میاں شمشاد تم کبھی اس دشت کی سیاحی کو نہیں نکلے؟''

''مم...... میں سمجھا نہیں پروفیسر؟''

''میرا مطلب ہے تم نے کبھی عشق نہیں کیا؟''

''عشق......کل بتاؤں گا چچا میاں...... پروفیسر' کل اس سلسلے میں آپ کو تفصیلات بتاؤں گا۔''

''ہاں' ہاں ضرور یہ داستانیں ہی تو جوان رکھتی ہیں ورنہ زندگی میں اور کیا رکھا ہے؟''

شمشو نے آج کی ڈیوٹی انجام دی اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔

◇◇◇

قمرو خوشی سے اچھلا اچھلا پھر رہا تھا۔ اس نے بساط بھر تمام چیزیں ان لوگوں کے لیے مہیا کر دی تھیں۔ خوشی کے تین خزانے اس کی کھولی میں جمع ہو گئے تھے۔ اسے چاروں طرف روشنی ہی روشنی محسوس ہو رہی تھی لیکن سلطانہ نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے قمرو کو سمجھا بجھا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ قمرو میاں عورت شرافت سے سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ اگر تمہیں کسی کا دل جیتنا ہے تو اپنی شرافت سے جیتو' ممتاز تمہاری طرف مائل ہے لیکن اگر تم نے ابتداء کر دی تو پھر بات ہی کیا رہی؟ مرد کی مردانگی تو اس میں ہے کہ عورت خود ہی اس کے قدموں میں آ پڑے اور بات قمرو میاں کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اب وہ اپنی مردانگی کے مظاہرے کر رہے تھے جو فی الحال صرف کھانے پینے کی اشیاء جمع کرنے پر مشتمل تھے۔

شاہ جہاں بیگم پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطانہ کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ سلطانہ کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''سلطانہ میرا دل ہمیشہ روتا رہے گا۔''

''بے مقصد۔ بے کار رونا بھی اچھا نہیں ہوتا امی جب ہمارے تمام راستے بند

ہو چکے ہیں تو پھر جو کچھ ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں بہت ٹھوس ثابت ہوں گی' مجھ پر جو بیت رہی تھی وہ بیت چکی ہے اور آنے والے وقت میں آپ دیکھیں گی کہ میں آپ کو کیا کر کے دکھاتی ہوں۔

چنانچہ خدارا اب مجھ سے انحراف نہ کریں اور اب اپنے اوپر سے یہ دہری سنجیدگی کی چادر اتار دیں۔ میرا ساتھ دیں امی۔ میں آپ کے سہارے ہی یہ سب کچھ کر سکتی ہوں۔''

شاہ جہاں بیگم گہری گہری سانسیں لیتی رہیں اور پھر بولیں۔

''یہ نوشہ میاں کم بخت کہاں سے یہ سب کچھ کرے گا۔ ہمارے پاس تو کچھ نہیں۔''

''نوشہ اگر کچھ نہ کر سکا تو پھر میں خود اس سلسلے میں آگے بڑھ کر کام کروں گی۔''

''بچی خدا سے ڈر جو کچھ دیکھا نہیں ہے اس کے لیے اتنے اعتماد سے مت بول تو دیکھے گی کہ تیرا دل روئے گا۔''

''نہیں روئے گا آپ اطمینان رکھیں۔'' بہرطور سلطانہ نے شاہ جہاں بیگم کو کافی حد تک اپنا ہم خیال بنا لیا اور اس کے بعد دوسرے دن کا آغاز ہو گیا۔ قمرو میاں کی لن ترانیاں جاری تھیں۔ واری صدقے ہوئے جا رہے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے کھانے پینے کا بندوبست کر رہے تھے۔ نکھٹو اور حرام خور تھے۔ یقینی طور پر قرض ادھار سے یہ خاطر مدارات ہو رہی ہو گی۔ عجب بے وقوف انسان تھا' پاس پلے کچھ تھا نہیں اور ہوا میں اڑا اڑا پھر رہا تھا۔ بہرطور دن پر سکون گزرا۔ دوسرا پھر تیسرا دن گزرا نوشہ میاں نے اس دوران شکل نہیں دکھائی تھی اور شاہ جہاں بیگم اب ایک اور ہی انداز میں سوچ رہی تھیں۔ یہ کم بخت نوشہ میاں ہی تھا جس نے کئی جگہ ان کے راستے کاٹے تھے اور انہیں دہشت کا شکار کر دیا تھا۔ اگر نوشہ میاں واپس نہ آئے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ جو وعدے اس نے کیے تھے اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس کے بعد سلطانہ ان کی ایک نہیں چلنے دے گی وہ کچھ نہ کچھ کر کے رہے گی۔ اب تک وہ کم از کم اس بات پر دل سے راضی نہیں ہوئی تھیں کہ کوٹھا آباد کر لیا جائے لیکن ان کا سوچا درست ثابت نہ ہو سکا کیونکہ چوتھے دن نوشہ میاں سینہ تانے ہوئے آ گیا تھا۔

''قسم ولیوں کی زندگی میں اتنا بڑا کوئی کارنامہ انجام دیا نہیں۔ کیا کرنا پڑا ہے' ہمیں

شاہ جہاں بیگم بس تیاریاں کرلو اب وہیں جا کر دم لیں گے۔"

"بندوبست ہو گیا نوشہ میاں۔"

"کیسے نہ ہوتا' پوری عمر اس دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ بڑے بڑے گُر سیکھے ہیں نوشہ میاں نے تم تو بھول گئیں شاہ جہاں بیگم' نوشہ میاں کو کیا کچھ نہیں کر دکھایا۔ بڑے بڑوں کے پتے پانی کر دیئے۔ ارے ہاں ایک اتنا سا کام نہ ہوتا مگر بی بی دنیا کے کام ایک دوسرے ہی سے چلتے ہیں جو کچھ ہم نے کیا ہے اس کے صلے میں بھی بہت کچھ دینا پڑے گا۔ چلو بی تیاریاں کرلو۔ اے سلطانہ بی بی تم ذرا سب سے سمجھدار ہو ان لوگوں کو سنبھالو۔ جلدی کرو۔ قمرو میاں کہاں گئے؟"

"باہر گئے ہیں۔"

"آ جائے گا بھوتنی والا وہ بھی بس حلق کی ہڈی ہے۔ نگلی جائے نہ اگلی جائے' پھنس گئی ہے سسری۔ قسم ولیوں کی۔" نوشہ میاں یہ شور مچا رہے تھے کہ قمرو بھی پہنچ گیا اور بالآخر نوشہ میاں کو قمرو کا سہارا بھی لینا پڑا۔

"میاں قمرو اب تمہیں بھی یہ کھولی چھوڑنا پڑے گی۔"

"تو کس کے باپ کی جاگیر ہے۔ ایک نہ ایک دن تو چھوڑنی ہی تھی مگر تم سناؤ نوشہ میاں اتنے دن غائب رہے میں تو حیران ہو رہا تھا۔"

"اب پریشان ہو جاؤ' جلدی کرو سامان بھی لے جانا ہے تھوڑا بہت۔"

"کون سا سامان؟"

"ابے یہی شاہ جہاں بیگم کا۔"

"ہمارے پاس تو کوئی خاص سامان نہیں ہے نوشہ میاں۔"

"شاہ جہاں بیگم اشارہ کر کے دیکھو جو چاہو گی پہنچ جائے گا۔ دو دن سے کوٹھے کی آرائش میں لگا ہوا ہوں۔ تمہارے شایان شان نہ ہو تو نوشہ میاں نام نہیں۔"

بالآخر تیاریاں ہو گئیں اور یہ لوگ چل پڑے۔ شاہ جہاں بیگم کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ پھر جب اس بازار میں پہنچیں تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ ڈھول' ہارمونیم اور طبلے

کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گھنگروؤں کی جھنکار تھی۔ جس ماحول سے نکلی تھیں اور جس ماحول کو دنیا سمجھا تھا وہ سب کچھ چھن گیا تھا اور جو تھا وہی دوبارہ سامنے آ گیا تھا۔ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھیں اندر پہنچ گئیں۔ سامنے پہلے ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی اس کے بعد بڑا ہال کمرہ جو واقعی نہایت نفاست سے آراستہ تھا۔ یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ پہلے سے آباد کوئی کوٹھا نہیں ہے۔ اس کمرے کے تین دروازے تھے۔ تینوں دروازوں کے دوسری طرف ایک راہداری جو گول شکل میں تھی گھلتی تھی۔ راہداری کے دوسرے سرے پر چار کمرے بنے ہوئے تھے جن میں وسیع وعریض بالکونیاں تھیں بالکونیوں کے دوسری طرف ایک عظیم الشان بازار پھیلا ہوا تھا۔ چاروں طرف رونقوں کا راج تھا اور دیکھنے کے لیے بہت کچھ نگاہوں کے سامنے۔ شاہ جہاں بیگم شدت حیرت سے گنگ ہو گئیں۔ نوشہ میاں یہ کر دکھائیں گے۔ یہ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بہر طور نوشہ میاں ایک ایک کمرہ دکھاتے رہے تمام سامان دکھایا اور اس کے بعد کہنے لگے۔

"اب بتاؤ شاہ جہاں بیگم کس چیز کی کمی ہے؟"

"یہ جگہ تو بہت خوبصورت ہے۔" ممتاز نے کہا۔

"چپ ہو جاؤ ممتاز۔" شاہ جہاں بیگم درد بھرے لہجے میں بولیں۔

"نہیں اماں کیوں چپ کرا رہی ہیں آپ اسے؟ ممتاز تمہیں کون سا کمرہ پسند ہے؟" "اپنی پسند کا کمرہ لے لو۔"

"میں تو درمیان والا لوں گی سلطانہ باجی۔" ممتاز نے کہا۔

"ٹھیک اور کونے والا کمرہ اماں تمہارا' ممتاز کے برابر والا میرا اور اس کے بعد نور جہاں کا بھئی واہ نوشہ میاں تم نے تو کمال کر دکھایا۔ بڑی عمدہ جگہ ہے۔"

"اور ہم ڈیوڑھی میں پڑے رہیں گے؟ کیوں بھئی قمرو کیا خیال ہے تیرا؟"

"قسم اللہ کی ہم نے تو ایسے گھر کے بارے میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ تو بڑی بڑھیا جگہ ہے ارے وہ دیکھو سامنے کون ناچتا ہوا نظر آ رہا ہے۔"

"ابے چپ تجھے چاروں طرف یہاں ایسے ہی مناظر نظر آئیں گے۔ ابھی سے رال نہ ٹپکا۔"

"اب استاد نوشہ تم تو ابھی سے اپنے استاد بن گئے۔آج سے ہم تمہارے قدم دھو دھو کر پئیں گے۔"

"پی لینا بیٹا' پی لینا ویسے قدم بھی خود ہی دھو لینا۔ پیر بڑے میلے ہو گئے ہیں میرے۔" نوشہ میاں نے اپنی جانب سے مذاق کیا۔سلطانہ بہ غور چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔اس نے آہستہ سے کہا۔

"ابھی تو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوگی' نوشہ میاں چھت میں جھاڑ فانوس نہیں ہیں اور ابھی ایسی چند چیزیں اور ہیں جن کی ضرورت پیش آئے گی۔"

"بی بی آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا۔"

"خیر چھوڑو ان باتوں کو جگہ بہت اچھی ہے اور ہمیں پسند ہے لیکن نوشہ میاں یہ تو بتاؤ کہ اس کے لیے تم نے پگڑی وغیرہ کا بندوبست کہاں سے کیا؟"

"بی بی سب کچھ ادھار کیا ہے۔آہستہ آہستہ کر کے چکا دیں گے۔ کچھ تھوڑا سا سود ادا کرنا پڑے گا۔ یہاں ویسے ہماری مدد کئی لوگوں نے کی ہے۔"

"مثلاً کس کس نے؟" شاہ جہاں بیگم نے سوال کیا اور نوشہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔انہوں نے داہنے سمت اشارہ کر کے کہا۔

"اس کوٹھے پر نواب جان ہیں اور ان کے برابر والے کوٹھے پر چاندنی بیگم پیچھے ذرا تھوڑے فاصلے پر روشن تارا کا کوٹھا ہے سب سے زیادہ مدد نواب جان نے کی ہے۔میں نے انہیں بتایا تھا کہ شاہ جہاں بیگم بھی یہاں موجود ہیں تو دیوانی ہو گئیں۔کہنے لگیں کہ مجھے شاہ جہاں بیگم سے ملوا دو مگر ہم بھی حرفوں کے بنے ہوئے ہیں۔قسم ولیوں کی ہم نے ہوا بھی نہ لگنے دی شاہ جہاں بیگم کہ تمہاری سوچ کیا ہے اور تمہارا انداز کیا ہے۔"

"ہیں نواب جان یہاں ہے۔"

"بالکل برابر میں' زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ابھی تھوڑی دیر کے بعد پہنچنے ہی والی ہوں گی بس ذرا انہیں پتا چل جائے کہ تم یہاں آ گئی ہو۔انہوں نے ہی ہمیں سود پر پیسہ دلوایا ہے۔"

"نوشہ میاں تم......تم میری جان کے پیچھے ہی لگے رہے۔"

"کیسے چھوڑ دیتے شاہ جہاں بیگم ساری عمر کا ساتھ ہے اور تم جانتی ہو ہمیں' قسم ولیوں کی کیا کیا جوڑ توڑ کرنا پڑے تمہارے لیے لیکن شاہ جہاں بیگم تم جیسوں کو یہی جگہ راس آ سکتی ہے۔نکل کر ساری کوششیں کر لی ہوں گی۔ دیکھ لیا ہو گا زمانے کو؟"

"ہاں میاں سچ ہی کہتے ہو۔" شاہ جہاں بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ابھی کچھ اور بھی انتظامات کرنے ہیں۔ذرا بازار سے کچھ خریداری وغیرہ کر لیں۔ پٹاری چاہیے اور دوسری بہت سی چیزیں' ابھی سجالو' ابھی کوئی جلدی نہیں ہے کام کی۔" شاہ جہاں بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔نوشہ میاں کہنے لگے۔

"تو ہم نواب جان کو اطلاع دے دیں۔"

"ذرا ٹھہرو نوشہ میاں ابھی اتنی جلدی بھی مت کرو یہ قمرو میاں یہاں کیا کریں گے؟" شاہ جہاں بیگم نے پوچھا۔

"لو بی اماں ہم کیا کریں گے؟ تمہارے غلام ہیں تمہارے قدموں میں رہیں گے بھلا بیرکوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ یہاں تو رنگ ہی نئے ہیں۔"

"ہوں! خیر قمرو میاں اب جب تم ہمیں کھینچ کھانچ کر یہاں لے ہی آئے ہو تو پھر ہم بھی پرانی یادیں ہی تازہ کریں گے۔باتیں کرنی ہوں گی تم سے بہت سی کیا سمجھے۔"

"سب کچھ سمجھ لیا قسم اللہ کی۔ پرا ہی مت پروا اماں۔"

"اماں نہیں اب تو شاہ جہاں بیگم ہی کہو قمرو میاں اس کوٹھے پر کوئی کسی کی ماں اور بہن نہیں ہوتی کیا سمجھے۔"

"ہیں اے نوشہ میاں کیا کہہ رہی ہیں یہ اماں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں قمرو میاں۔ تمہیں یہاں کے آداب سکھانا ہوں گے۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں شاہ جہاں بیگم' چلو ذرا میرے ساتھ باہر آ جاؤ۔" نوشہ میاں نے کہا اور قمرو میاں حیرانی سے پلٹ کر باہر نکل گئے۔شاہ جہاں بیگم نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سلطانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سنا تم نے سلطانہ یہ کوٹھوں کی زبان ہے اور اب ہمیں یہاں یہی زبان استعمال کرنا

ہو گی۔ محبتوں کے تمام رشتے ہمارے سینوں میں زندہ ہیں لیکن یہاں رہ کر محبتوں کے انداز ذرا بدل جاتے ہیں تم ان سب چیزوں کو ذرا دیر سے سیکھو گی۔"

"لیکن سیکھ لوں گی امی آپ بالکل فکر نہ کریں۔" سلطانہ نے اسی پر اعتماد لہجے میں کہا پھر بولی۔

"یہاں اور بھی بہت سی چیزوں کا بندوبست کرنا ہوگا۔ میں نے...... میں نے۔"

"ہاں...... ہاں بولو رک کیوں گئیں؟"

"بالکل کسی برے انداز میں نہیں رکی' میں نے واقعی اس سے پہلے کوٹھا نہیں دیکھا لیکن اس کے بارے میں کہانیاں سن چکی ہوں۔ دیکھو اماں یہاں دوسرے لوگوں کا کوئی بھی مقصد ہو لیکن ہم ایک نظریہ لے کر آئے ہیں اور ہم اس نظریئے سے اختلاف کبھی نہیں کریں گے۔ میں تمہیں اپنے عزم کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ یہاں ہم بھی کسی کا رونا نہیں روئیں گے بلکہ صاحب اقتدار بن کر جئیں گے۔ چنانچہ اپنے اوپر سے کھولت کا لبادہ اتار دو۔ ممتاز اور نور جہاں تم لوگ ان تمام چیزوں سے واقف ہو چلو ذرا ہاتھ پاؤں ہلاؤ کام کرو میں تمہیں ہدایت دیتی ہوں۔" سلطانہ نے کہا اور اس کے بعد وہ گھر کو سنوارنے کی کارروائی کرتی رہی۔

شاہ جہاں بیگم کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو وہ اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے ایک طوائف کے کوٹھے پر مصروف عمل دیکھ رہی تھیں۔ نہ جانے کس قسم کی طوائف تھیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر ان کے دل میں خوشی کا ایک دیا بھی روشن نہ ہوا تھا بلکہ سینے میں دکھ ہی دکھ تھا۔ نوشہ میاں واپس ہوئے تو ان کے ساتھ تین چار افراد موجود تھے۔ جنہوں نے شاہ جہاں بیگم کو دیکھتے ہی خوشیوں بھری قلقاریاں لگائیں اور نوشہ میاں سے بولے۔

"ارے نوشہ کمال کر دیا' واللہ تم نے تو آنکھیں روشن کر دیں۔ شاہ جہاں بیگم پہچانیے کیسے حالات سے گزرنے کے بعد مل رہے ہیں۔ خدا سے دعائیں مانگتے تھے کہ ہمیں ایک بار صرف ایک بار شاہ جہاں بیگم سے ملا دے۔" آنے والے طرح طرح کی بولیاں بولنے لگے۔ ان میں چھٹن میاں سارنگی نواز تھے۔ کلن خان طبلہ نواز' چاند میاں اور استاد للن تھے۔ یہ سارے کے سارے وہ لوگ تھے جن کا تعلق شاہ جہاں بیگم سے رہ چکا تھا اور جو ان کے غم خوار

تھے۔ ایک بار پھر سب کے سب جمع ہو گئے تھے۔ نوشہ میاں نے واقعی جو کچھ کہا تھا کر دکھایا تھا۔ شاہ جہاں بیگم کو یونہی محسوس ہو رہا تھا جیسے پرانا دور واپس آ گیا ہو۔ بس باقی تو سب ٹھیک ٹھاک تھا تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا تھا اس سے انحراف ممکن نہ رہا تھا لیکن سلطانہ کے رویئے کو دیکھ کر بھی ان کے دل پر دہشت سوار ہو جاتی تھی۔ ایک پاکباز لڑکی کس طرح غلاظت میں ملوث ہو رہی تھی۔ ان کا دل بس اسی احساس سے داغدار ہو جاتا تھا۔ نوشہ میاں نے باقی کسر بھی پوری کر دی۔ رات ہو گئی تھی اور کوٹھے جاگ اٹھے تھے۔ ان کی طرف کوئی ملنے نہ آیا لیکن رات گزرنے کے بعد دوسری صبح نواب بیگم کی آمد ہوئی۔ وہ شاہ جہاں بیگم کی بہن بنی ہوئی تھیں اور پرانے دور میں ان کی پڑوسن بھی تھیں۔ بلاشبہ نواب جان شاہ جہاں بیگم پر جان ہی دیتی تھیں۔ اندر آتے ہی لپٹ گئیں اور زار و قطار رونے لگیں۔ شکوے شکایت ہونے لگے۔ گزری ہوئی داستانیں دہرائی جانے لگیں پھر چاندنی بیگم بھی اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ آ گئیں اور زمانے بھر کی باتیں ہونے لگیں۔ سلطانہ کے بارے میں ابھی تک کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ کوٹھوں پر تو آنے جانے والے آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ بہر طور اس سلسلے میں کسی نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ البتہ بہت سی نگاہیں سلطانہ کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ جن میں چاندنی بیگم کی نگاہیں سرفہرست تھیں۔ ملنے جلنے والیوں کا تانتا دوپہر تک بندھا رہا۔ اس کے بعد ان لوگوں کے اپنے کاروبار کا آغاز ہو جاتا تھا اور اس کے لیے کوٹھے سنوارنے پڑتے تھے۔ بہر حال کوٹھے کا یہ پہلا دن سلطانہ کے لیے ایک نیا دن تھا اور وہ عجیب سی سنسنی کا شکار تھی لیکن وہ بڑے اعتماد اور بڑی پامردی سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہی تھی اور اپنے آپ کو اس ماحول میں رنگنے کے لیے تیار تھی۔ مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کے ذہن میں گندگی کا کوئی تصور ہو بلکہ جو عزم اس کے سینے میں پل رہا تھا اس کے لیے استقامت انتہائی ضروری تھی اور وہ اسی پیمانے پر کام کر کے اپنے عزم کی تکمیل چاہتی تھی۔

◇◇◇

"قسم اللہ کی یقین کرو میں بھی کبیرہ اللہ ہوں۔"

’’تم قسم کھاتے ہو یا میری نقل اتار رہے ہو؟‘‘

’’نہیں ہرگز نہیں۔ ویسے پیار سے تم کب پھنسے؟‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’ماموں جان ایسے ہی سیکریٹری پھانستے ہیں اور پھر ان کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔‘‘

’’کک..... کیوں؟‘‘

’’تمہیں کتنے دن ہو گئے یہاں؟ اس کے بعد میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔‘‘

’’کافی ہو گئے۔‘‘

’’خیر کافی نہیں ہوئے ہوں گے۔ درپہ بارہ یا چودہ پندرہ اثرات تو کچھ مہینوں کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔‘‘

’’کیا ہوتا ہے؟‘‘ شمشو نے کسی قدر خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

’’نہیں یہ غیبت ہو گی اور میں غیبت نہیں کرنا چاہتا۔ چلو ٹھیک ہے' تم اس گھر کے سیکریٹری ہو۔ اب تمہیں میری بھی کچھ ذمہ داری سنبھالنی ہو گی۔‘‘

’’مگر تم ہو کہاں کبیر اللہ؟‘‘

’’سیکریٹری کس انداز میں گفتگو کر رہے ہو؟ میں تمہارے مالک کا بھانجا ہوں۔‘‘

’’اور میں مالک کی آنکھوں کا تارا۔‘‘

’’ہوں ابتداء میں تمام سیکریٹری پروفیسر حشمت اللہ کی آنکھوں کا تارا ہوتے ہیں۔ اصل کام تو ذرا بعد میں ہی شروع ہوتا ہے۔‘‘

’’ارے کیوں مجھے خوفزدہ کر رہے ہو غریب آدمی ہوں۔ بڑی مشکل سے نوکری ملی ہے۔‘‘

’’جاری رکھو۔ جاری رکھو۔ تین مہینے تک کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اصل خطرات تین مہینے کے بعد شروع ہوں گے۔‘‘ کبیر اللہ نے کہا اور شمشاد بیگ واقعی پریشان ہو گیا۔ پھر کبیر اللہ اٹھتا ہوا بولا۔

’’میں ذرا لباس وغیرہ تبدیل کر لوں۔ اس کے بعد ذرا کھل کر گفتگو کریں گے۔‘‘

وہ لباس تبدیل کرنے چلا گیا اور شمشاد بیگ پریشانی کے انداز میں دیر تک سوچتا رہا۔ کبیر اللہ واپس آ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

’’میں چائے کے لیے کہہ آیا ہوں چائے پیو گے؟‘‘

’’پی لوں گا۔‘‘ شمشاد بیگ نے کہا۔

’’تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔‘‘ کبیر اللہ بولا۔

’’بھائی کبیر اللہ تم نے بات ہی ایسی کہہ دی ہے۔ بڑی مشکل کے بعد یہ نوکری ملی ہے اور بہت اچھی نوکری ہے مگر تین مہینے کے بعد کیا خطرات پیش آ سکتے ہیں یہ بتا دو۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ کبیر اللہ زیر لب مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔

’’ہم سے دوستی کرو گے تو سارے خطرات خود بہ خود ٹل جائیں گے بہت سے امراض کا علاج ہیں ہم۔‘‘

’’تو پیارے بھائی دوستی کر لو ناں۔‘‘

’’دوستی کے لیے بہت سے امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے۔ دوست تم ہو کیا چیز؟‘‘

’’قسم اللہ کی بس یوں سمجھ لو میں بھی ماں باپ کا ستایا ہوا ہوں۔‘‘

’’آہ! اس کائنات میں ہر شخص کسی نہ کسی کا ستایا ہوا ہے۔ میرے ماں باپ مجھے ان ماموں جان کے سپرد کر کے اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ کسی یتیم خانے میں چلا جاتا۔‘‘

’’ابے عیش کی زندگی گزار رہے ہو اور کیا چاہیے؟‘‘

’’عیش ٹھیک ہے' ٹھیک ہے بیٹا کچھ دن کے بعد تمہارے بھی عیش ہو جائیں گے پروا مت کرو۔‘‘

’’تم مجھے پھر ڈرا رہے ہو بھائی کبیر اللہ۔ آخر کچھ تو بتاؤ۔‘‘

’’ابے میں کیا بتاؤں؟ جو کچھ ہو گا سامنے آ جائے گا۔‘‘ کبیر اللہ نے کہا اور شمشو کی صورت دیکھتا رہا۔ کبیر اللہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"ماموں جان تمہیں اپنے عشق کی داستانیں سنا چکے ہیں؟"

"ہاں اور بہت ہی چالاک آدمی ہیں۔"

"وہ تو ہیں مگر کہاں تک؟ ان کے عشق کی کونسی منزل سے واقف ہو چکے ہو تم؟"

"کوثر جہاں۔" شمشو نے جواب دیا۔

"گویا اینڈ ہوگیا۔ خیر یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ایک ایک عشق کے سلسلے میں کتنے کتنے عرصے گھماتے ہیں۔ جانتے ہو ماموں جان نے کتنے عشق کیے ہیں؟

"نہیں۔"

"ایک سو اکہتر۔"

"ابے نہیں۔"

"قسم کھا رہا ہوں اگر درمیان میں سے کچھ کمی کر دی ہے تو بعد میں جو عشق انہیں یاد آتے رہیں گے ان کی تفصیلات تمہیں سننا پڑیں گی۔"

"انہوں نے آج تک میرے عشق کی داستان مجھ سے نہیں سنی۔ خیر میں بھی دیکھوں گا چچا میاں کہاں تک بھاگتے ہیں؟" شمشو نے گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر کبیر اللہ کو دیکھ کر بولا۔

"مگر تم کرتے کیا ہو؟"

"کیا کروں؟ اس دنیا میں کرنے کے لیے ہے ہی کیا؟ ویسے میں فطری طور پر ایک مہم جو انسان ہوں۔ خطرات سے کھیلنا میری عادت ہے۔ خطرات میں کودنا پڑنا میری ہابی۔"

"واہ کس قسم کی وہ کرتے ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ وہی جو ابھی تم نے کہا مہم جوئی' مہم جوئی۔"

"ہاں قدیم نوادرات اور خزانے میرا سبجیکٹ ہیں۔" کبیر اللہ نے کہا اور دفعتاً ہی شمشو کے بدن میں جھری جھری سی دوڑ گئی۔ خزانے کا نام ایک بار پھر اس کے سامنے آیا تھا۔ بہت سی باتیں زبان پر آتے آتے رہ گئیں۔ عقل نے ساتھ دیا تو فوراً ہی کبیر اللہ سے خزانے کا ذکر نہ چھیڑ دیا۔ ورنہ جی تو یہی چاہتا تھا کہ ایک ساتھی مل جانے سے ایک بار پھر خزانے کا ذکر شروع ہو جائے۔ لیکن اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا۔ پہلے کبیر اللہ کی شخصیت سے واقف ہو جانا

ضروری تھا۔

"تو پیارے بھائی کوئی خزانہ ملا تمہیں؟"

"کمال کرتے ہو یار اگر خزانہ مل جاتا تو ایسی بے کسی کی زندگی گزارتا؟"

"بے کسی کی؟"

"ہاں ماموں جان ویسے تو دوسروں کے معاملے میں بڑے فیاض آدمی ہیں لیکن میرے سلسلے میں انہوں نے اپنے دل کے سارے دروازے بند کر لیے ہیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بڑی مشکل سے چوری چکاری کر کے تھوڑی سی رقم حاصل کر لیتا ہوں۔ پچھلے دنوں ان کے دستخط بنانے کی کوشش کی تھی عین موقع پر پکڑ لیا گیا اور تین گھنٹے تک مرغا بنا رہنا پڑا۔ دستخط تو خیر صحیح نہیں بن سکے اور پھر کام بھی خطرناک تھا۔ لیکن دوسرے ذرائع سے بالآخر کام چل ہی جاتا ہے۔"

"وہ تمہیں کچھ نہیں دیتے؟"

"دینے کے نام سے ڈنڈا اٹھا لیتے ہیں۔" کبیر اللہ نے جواب دیا اور پھر دفعتاً ہی شمشو کے قدموں میں آ بیٹھا۔

"پیارے بھائی تم ہی اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرو۔"

"اس وقت میں مالک کا بھانجا نہیں سوالی ہوں' شمشاد بیگ صرف ایک سوالی۔ بڑے مشکل حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟"

"کمال ہے یار قسم اللہ کی اپنی مدد بڑی مشکل سے شروع ہے۔ ابا جان کے بارے میں تم نہیں جانتے میں تو کہتا ہوں تمہارے ابا جان نہیں ہیں۔ اس لیے تم سے زیادہ خوش قسمت اور کوئی نہیں ہے۔" کبیر اللہ اٹھ کر واپس اپنی جگہ جا بیٹھا اور مغموم لہجے میں بولا۔

"ابا جان نہیں ہیں مگر سوا ابا جانوں کے ابا جان یہ ماموں جان ہیں۔"

"بظاہر تو پروفیسر بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"ہاں بیٹا تھوڑے دن بعد پوچھوں گا کتنے اچھے آدمی ہیں؟" کبیر اللہ نے جواب

دیا۔شمشو پھر موقع پر آ گیا۔

"تو اس تمام مہم جوئی پر تمہیں کوئی خزانہ نہیں ملا؟"

"خزانے ہوتے کہاں ہیں یار صرف قصے کہانیاں ہوتے ہیں ان کے۔"

"اور اگر کوئی اصل خزانہ تمہارے سامنے آ جائے تو؟"

"تو میں اس کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا۔ یہ جان نا تو اس کسی خزانے کے حصول کے سلسلے میں کام آ جائے تو اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں ہوگی۔ ماموں جان نے تو ابتداء ہی سے میری زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ نہ جانے کیا کیا بنانے پر تل گئے تھے۔ پہلے کہنے لگے کہ کامرس پڑھ لو۔ میں نے سوچا کہ دو اور دو چار بھی کوئی پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔ پھر انجینئر بنانے پر تل گئے اور اس کے بعد نہ جانے کیا کیا؟ میں بھی بس بھاگا بھاگا پھرتا ہوں۔ مگر ابھی پچھلے دنوں ایک مہم کے سلسلے میں گیا تھا۔ بری طرح ناکام ہو کر واپس آیا ہوں۔"

"تو آخر تم بننا کیا چاہتے ہو؟"

"دولہا۔" کبیر اللہ نے چھٹ سے جواب دیا اور شمشو اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

"صرف دولہا۔"

"تو اور کیا؟ زندگی چاند سی بیوی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب ماموں جان نے تمہیں سیکریٹری کے علاوہ بھی کچھ اور بنایا ہے؟"

"ہاں وہ اسسٹنٹ' اسسٹنٹ۔"

"لیبارٹری میں کام کرنا پڑتا ہوگا بیٹا؟"

"ہاں آج ہی حلوہ بنا دیا۔"

"حلوہ؟" کبیر اللہ نے چونک کر پوچھا اور شمشو حلوے کی کہانی سنانے لگا۔ کبیر اللہ قہقہے لگا لگا کر ہنستا رہا۔ اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا تھا۔ بہ مشکل تمام وہ بولا۔

"اگر تم نے واقعی حلوہ بنا دیا تھا تو اس کا مقصد ہے کہ تمہارے ستارے واقعی بہت اچھے ہیں۔ ماموں جان اب تمہارے بارے میں سوچیں گے۔ ویسے ماموں جان کے بارے میں ایک بات تمہیں بتا دوں۔ وہ اپنے آپ کبھی کسی ملازم کو نہیں نکالتے۔ وہ خود ہی ان سے

جان چھڑا کر بھاگ جاتا ہے۔ اتنا ہی عاجز کرتے ہیں وہ ملازموں کو۔"

"ہوں مگر کبیر اللہ تم نے واقعی پروفیسر صاحب کے حالات درست کر دیئے ہوں گے؟"

"وہ کیسے؟"

"مطلب یہ کہ کچھ کر کے ہی نہ دیا انہیں؟"

"میں نے بھی بڑی مشکل سے لیبارٹری سے پیچھا چھڑایا تھا۔ دراصل ماموں جان سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ کچھ بھی نہیں جانتے لیکن انہیں سائنسدان بننے کا شوق ہے۔ کسی حکیم نے کوئی نسخہ بنا لیا بس اس کی جان کو لگ گئے۔ اب کئی سال سے کیمیا بنانے کے چکر میں ہیں اور ہر بار بس تھوڑا سا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کیمیا کے نسخے بہت سے جمع کر رکھے ہیں حالانکہ ان میں کوئی بھی کام کی چیز نہیں ہے۔ بس لوگ بے وقوف بنا کر کچھ نہ کچھ اینٹھ لیتے ہیں اور ماموں جان ہیں کہ اپنی آبائی دولت لٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ نہ جانے میرا کیا بنے گا شمشو۔"

"کچھ نہیں بنے گا کبیر اللہ بھائی۔ میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تم بھی میری مدد کرو۔"

"تو پھر ہم امداد باہمی کے طور پر ایک دوسرے کی مدد کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔"

"تو ملاؤ ہاتھ۔" کبیر اللہ نے بڑی گرمجوشی سے شمشو سے ہاتھ ملایا تھا پھر شمشو نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ کبیر اللہ تم نے بھی عشق کیا ہے؟"

"دیکھ بکواس مت کرو شمشو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ماموں جان کی عشق کی داستانیں سن سن کر اتنی عبرت ہوئی ہے مجھے کہ میں نے ہمیشہ کے لیے عشق سے توبہ کر لی ہے۔"

"تو پھر شادی کیسے کرو گے؟"

"کیوں شادی کرنے کے لیے عشق ضروری ہے؟"

"سنا تو یہی ہے آج تک۔"

"ارے چھوڑو ماموں جان مجھے عشق کرنے دیں گے؟"

اس دوران شمشو کبیر اللہ سے بھی واقف ہو چکا تھا اور اس وقت وہ کبیر اللہ کے ساتھ

ڈرائنگ روم میں بیٹھا گپیں ہانک رہا تھا۔

''اب یہ بتاؤ تم اپنی دوسری مہم پر کب جا رہے ہو کبیر اللہ؟''

''ابھی تو کوئی پروگرام نہیں ہے مگر یہ سوال کیوں کیا تم نے؟''

''لگتا ہے ہماری تمہاری خوب گاڑی چھنے گی۔''

''بہت اچھی بات ہے بشرطیکہ میری مالی مدد کر سکو یا کرا سکو۔''

''اس سلسلے میں کوئی وعدہ تو نہیں کر سکتا لیکن تمہاری سفارش ضرور کر دوں گا۔''

''سفارش۔'' کبیر اللہ اچھل کر بولا۔ ''کبھی نہیں مانیں گے وہ۔''

''خیر یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔'' آنے والے وقت نے جو کچھ بتایا وہ شمشو کے سامنے ہی بتایا۔ پروفیسر حشمت اللہ واپس آ گئے تھے اور کبیر اللہ کی شکل دیکھتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔

''تو کہاں مر گیا تھا؟ کہاں سے آ رہا ہے؟''

''مر گیا ہوتا ماموں جان تو یہاں کیسے پہنچتا؟''

''روحیں بھی آ سکتی ہیں۔''

''آپ مجھے ہاتھ لگا کر دیکھ لیں بالکل زندہ ہوں۔''

''اگر زندہ ہو بیٹے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یاد ہے کتنے دن کے بعد آئے ہو؟''

''بس ماموں جان تھوڑی سی کسر رہ گئی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر تھوڑی سی مشکل حل ہو جاتی تو آج ایک بہت بڑا خزانہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔''

''کیا ہوا تھا؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے ماموں جان، بڑی دردناک۔ بڑی ہولناک، بڑی خوفناک اور بڑی غمناک۔''

''ہوں ناک کا استعمال اتنا زیادہ مت کیا کرو بیٹے کسی دن ناک ہی غائب ہو جائے گی۔'' حشمت اللہ نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ کبیر اللہ نے شمشو کو دیکھ کر آنکھ ماری تھی۔ گویا کام بن گیا۔ بہر طور یہ کبیر اللہ بھی مزے کی چیز تھی اور شمشو واقعی اس دن اپنے گھر کی طرف

آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کبیر اللہ سے اس کی اچھی دوستی رہے گی۔ کام کا آدمی ثابت ہوا تو پھر خزانے کے سلسلے میں اسے رازدار بنا لیا جائے گا۔ خود بھی خزانوں کا شوقین ہے۔ ایک بار پھر شمشو کی آنکھوں میں خزانے کی چمک لہرانے لگی تھی۔

◇◇◇

کوٹھا آباد ہو چکا تھا۔ ممتاز اور نور جہاں نے پیروں میں گھنگھرو باندھے تو دولت برس پڑی۔ دوسری طرف سلطانہ بھی ریاض کر رہی تھی۔ اس کے لیے استاد کو مقرر کر دیا گیا تھا۔ جو شاہ جہاں بیگم کے پرانے شناسا تھے۔ استاد دلدار خان اپنی اس ہونہار شاگرد پر فدا ہو گئے تھے اور بار ہا انہوں نے شاہ جہاں بیگم سے کہا تھا۔

''یوں لگتا ہے شاہ جہاں بیگم کہ تم نے ہمیں ہمارا امتحان لینے کے لیے مقرر کیا ہے۔''

''کیوں دلدار میاں ایسی کیا بات ہے؟''

''گائیکی کے لیے ایسے فن معلوم ہیں اسے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ ہم کیا سکھا رہے ہیں۔ اسے وہ خود ہمیں سکھا رہی ہے۔''

''اللہ جانے یہ لڑکی ہے کیا چیز؟ شاہ جہاں بیگم ٹھنڈا سانس بھر کر کہتی تھیں۔ ابتداء میں تو وہ نور جہاں اور ممتاز کے پیروں میں کھنکتے گھنگھرو دیکھ کر روتی رہی تھیں۔ یہاں داخل ہونے کے بعد ان کے دل میں نہ جانے کیا کیا آرزوئیں پیدا ہوئی تھیں؟ پتا نہیں کس قسم کی کوٹھے والی تھیں کہ کوٹھے والیوں کے سے انداز ہی نہ تھے۔ وہ تو دولت اور فن کی پرستار ہوتی ہیں لیکن یہ شرافت اور نیکیوں کے جھولوں میں جھولنا چاہتی تھیں اور بیٹیوں کو سنہرے مستقبل کے بجائے تاریک مستقبل دینے کی خواہاں تھیں۔ ایسے تنگ و تاریک گھر جس میں شوہر ہوتا ہے۔ بچے ہوتے ہیں۔ سلطانہ کے سہارے انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی ایسی ہی زندگی دینے کے خواب دیکھے تھے لیکن سلطانہ بھی سچائی پر تھی۔ شرافت کے راستے اپنانے کے کون کون سے جتن نہ کیے تھے ان لوگوں نے لیکن ہر جگہ سے مایوسی ہوئی تھی اور سلطانہ اگر فیصلہ نہ کرتی تو آنے والے وقت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا کہ کیا کہانیاں سناتا۔ قدم قدم پر نوشہ میاں اور قمرو جیسے

آدمی ملتے تھے جو پاس پلے سے تو کچھ خرچ نہ کرتے لیکن آبروؤں کے دشمن بنے رہتے اور آبروؤں کے ان دشمنوں سے شاہ جہاں بیگم کا جنگ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا اندازہ انہیں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب جس مقام پر تھیں وہ ایک طاقتور جگہ تھی اور یہاں رہ کر انہوں نے اپنے تمام بدلے چکا لیے تھے۔ نوشہ میاں اور قمرو سے۔ دونوں کے کتے کی در کردی تھی۔ قمرو کو تو ایک مہینے کے اندر ہی نکال باہر کیا تھا اور نوشہ میاں سے اس سلسلہ میں سوال بھی کیا تھا کہ یہ مردود آخر ہے کس مرض کی دوا؟ بلاوجہ ڈیوڑھی میں پڑا روٹیاں توڑتا رہتا ہے۔ میں کہتی ہوں تم لوگ اس سے کام کیا لیتے ہو؟ رشتے نبھا رہے ہو تو اپنے گھر جا کر نبھاؤ یہاں وہی کرنا ہوگا تمہیں جو کرتے رہے ہو۔

''اے بی قسم ولیوں کی تم نے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔

''شکر کرو نوشہ میاں آنکھیں ہی پھیری ہیں۔ تمہاری گردن پر چھری نہ پھیر دی۔ کیا سوچا تھا میں نے۔ تم نے کیا کر دکھایا۔''

''لو بی قسم ولیوں کی نیکی برباد گناہ لازم۔ ہم نے تو تمہیں وہ مقام دے دیا جو تم تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کیا نہیں کیا تمہارے لیے۔''

''بس ...... بس نوشہ میاں منہ نہ کھلواؤ۔ جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا صلہ تو تمہیں خدا ہی دے گا۔ نہ چاہنے کے باوجود تم ہمیں یہاں لے کر آئے ہم شرافت کی زندگی گزار رہے ہوتے۔''

''اور بھیک مانگ رہی ہوتیں۔ ٹھیک ہے آج کل نیکیوں کا صلہ تو ملتا ہی نہیں۔''

''ملے گا نوشہ میاں' ملے گا۔ تمہیں تو ایسا صلہ ملے گا کہ دیکھنے والے دیکھیں گے۔'' شاہ جہاں بیگم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ بہر طور نوشہ میاں سے گن گن کر بدلے لیے جا رہے تھے۔ ہر وہ اذیت انہیں دی جا رہی تھی جو دی جا سکتی تھی لیکن پھنس گئے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے؟ اپنی تمام صلاحیتیں لٹا چکے تھے کوٹھے کی ادائیگی ہو چکی تھی اور اب کوئی ایسا قرض شاہ جہاں بیگم پر باقی نہیں تھا جس کے لیے نوشہ میاں کا سہارا درکار ہوتا۔ چنانچہ اب تو نوشہ میاں ایک جملہ معترضہ کی مانند یہاں پڑے ہوئے تھے۔ سلطانہ کے اپنے دل میں کیا تھا اس کا کچھ کچھ اندازہ

تو شاہ جہاں بیگم کو ہو چکا تھا جو کچھ بھی آمدنی ہوتی تھی سلطانہ کی نذر کر دی جاتی تھی۔ سلطانہ نے گھر کے تمام اخراجات شاہ جہاں بیگم کو پیش کر دیئے تھے اور کہا تھا کہ صرف وہ رقم اسے دی جائے جو پس انداز کی جا سکتی ہو۔ شاہ جہاں بیگم اس سے پورا پورا تعاون کر رہی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد سلطانہ نے کرن کو ایک ایسے ادارے میں داخل کر دیا جہاں نومولود بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اس کے لیے ایک اچھی خاصی رقم ادا کی جاتی تھی لیکن پرورش کرنے والا ادارہ کچھ اس معیار کا تھا کہ سلطانہ کو بہت زیادہ اعتماد ہو گیا تھا اور کم از کم کرن کے مسئلے سے وہ بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس بات پر شاہ جہاں بیگم نے بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور جس دن سلطانہ نے کرن کو شاہ جہاں بیگم کے ساتھ جا کر ادارے کے منتظمین کے حوالے کیا تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے اچھی خاصی نذر نیاز کرائی تھی۔

''خدا کا شکر ہے میری بچی اس گندی فضا میں پروان نہیں چڑھے گی۔ اس کے کانوں میں گھنگھروؤں اور ہارمونیم کی آواز نہیں گونجے گی۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لیے اور کوئی نہیں ہے۔'' سلطانہ نے مسکراتے ہوئے شاہ جہاں بیگم کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

''اماں میں نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔''

''ہاں بی بی بڑی زیادتیاں کی ہیں تم نے میرے ساتھ۔ یہ کون سی زیادتی کا تذکرہ ہو رہا ہے؟'' شاہ جہاں بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو اماں کیا میری آنکھیں تمہارے دل کی گہرائی نہیں ٹٹول پائیں؟''

''کیا ہے میرے دل کی گہرائیوں میں؟''

''میں جانتی ہوں اماں تمہارے ساتھ نیک جذبے سفر کر رہے تھے اور تم نور جہاں اور ممتاز کے لیے کچھ اور ہی ٹھکانے منتخب کر چکی تھیں لیکن میری وجہ سے تمہیں اپنے ان جذبوں کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔ اماں میں عمر میں تم سے بہت چھوٹی ہوں لیکن ایک بات سمجھ لو کہ میری نگاہوں نے بہت دور تک دیکھا۔ بے شک اس زمین کے ذرے ذرے سے ہمیں پیار ہے لیکن زمین کے بسنے والے ہمارے سینوں میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے لیے باہر کی فضائیں مسموم تھیں اور بجائے اس کے کہ ہم کوڑی کوڑی کے بدلے پامال ہو جاتے۔ ہم نے اپنا

مقام تلاش کیا ہے؟ کہنے والے کچھ بھی کہتے رہیں۔لوگ تو چاند پر خاک اڑاتے ہی رہتے ہیں۔ چاند کبھی میلا ہوتا ہے اماں؟ نور جہاں اور ممتاز بے شک رقص و موسیقی کا کام کرتی ہیں۔اس سے آگے کسی نے بڑھنے کی کوشش کی تو میں اس کے اتنے ٹکڑے کروں گی کہ کوئی ان ٹکڑوں کو گن بھی نہ سکے گا۔ہمیں وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ہم...... ہم اپنا مستقبل تعمیر کررہے ہیں۔تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمارا مستقبل صرف کوٹھا ہے۔کیا سمجھیں اماں؟'' شاہ جہاں بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔انہوں نے کہا۔

''یہ منحوس جگہ ایسی ہے بیٹی کہ یہاں آنے کے بعد انسان عزت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔اب تک تو دوسری جگہ کے لوگ ہم سے واقف تھے لیکن اب یہاں کے لوگ بھی ہمیں اسی شکل میں پہچانیں گے اور تم دیکھو گی کہ تمہارے لیے زندگی کتنی مشکل ہوجاتی ہے۔ مجھے اب نور جہاں اور ممتاز کی تو فکر نہیں ہے جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا وہی ہوا۔میں اصل میں تو تمہارے لیے پریشان ہوں۔تم نے جو اپنے اوپر داغ لگالیا لیکن اب میری تمام دعائیں کرن کے ساتھ ہیں۔خداوند عالم میری بچی کو دنیا کی میلی نگاہوں سے محفوظ رکھے۔''

''ہاں اماں وہ دنیا کی میلی نگاہوں سے محفوظ رہے گی۔آپ اس بات کو دل پر لکھ لیں۔جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ کر کے دکھاؤں گی۔یہ نہ سمجھیں کہ پیٹ بھر روٹی ملی تو میرے سارے عزم سو گئے۔نہیں میرا تو ہر گزرنے والا لمحہ میرے عزم کی مکمل تصویر مجھے دکھاتا ہے۔ بس وقت آہستہ آہستہ اپنے فیصلے کرے گا اور میں وقت سے آگے دوڑ لگانا نہیں چاہتی۔'' شاہ جہاں بیگم خاموش ہوگئیں۔سلطانہ سے اس انداز میں گفتگو کرتے وقت انہیں یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان کے سامنے ایک معصوم سی خوبصورت لڑکی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی دیوار ہے، جس سے نکلنے والا ہر لفظ اپنی جگہ ایک آہنی حیثیت رکھتا ہے اور سلطانہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے وہ اس کی تکمیل کرنا بھی جانتی ہے۔اس کے اپنے مشاغل بے حد پر اسرار تھے۔کرن کی پرورش کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے نظریئے کے مطابق عمل بھی جاری رکھا تھا۔ کوٹھے پر جب اس کی آواز کا جادو جگا تو بہت سوں کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔سبھی چونک پڑے یہ حسین آواز کچھ اس طرح درد میں ڈوبی ہوئی تھی کہ سننے والوں کے دل کی گہرائیوں میں اترتی

اور سلطانہ کی آواز کے اس جادو نے بڑے بڑوں کو اس کا متوالا کردیا۔کچھ پرانے لوگ بھی جو کوٹھوں کے شوقین تھے شاہ جہاں بیگم تک پہنچ گئے تھے اور شاہ جہاں بیگم پھر سے شاہ جہانی بن گئیں تھی لیکن سلطانہ کی شمولیت نے اس کوٹھے کو نئے ہی رنگ دے دیئے تھے اور اب صاحب ذوق اسی سمت کا رخ کرتے تھے اور خاص طور سے سلطانہ کی آواز کے منتظر رہتے تھے۔سلطانہ اس سلسلے میں اپنا کمال فن رکھتی تھی۔اس نے اساتذہ اور نئے شاعروں کے تمام مجموعے منگوالیے تھے اور ان میں سے ایسی ایسی غزلیں نکالی تھیں جو موقع کی مناسبت سے ہوتیں پھر اس نے گائیکی کے انداز میں ایک نیا رنگ پیدا کیا تھا۔شاہ جہاں بیگم تو بعض اوقات خود بھی ششدر رہ جاتیں اور کہتیں۔

''اے سلطانہ خدا کی قسم میں نے ایسی آواز اس سے پہلے کبھی نہیں سنی۔کیا تمہیں بچپن میں بھی موسیقی سے لگاؤ تھا؟'' جواب میں سلطانہ مسکرا دیتی اور کہتی۔

''نہیں امی شاید قدرت نے میری آواز کو اسی لیے یہ حسن بخشا تھا کہ کسی وقت یہ ہم سب کے کام آئے گی۔'' سلطانہ کے ان الفاظ پر شاہ جہاں بیگم ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہوجاتی تھیں۔بہرطور یہاں آنے والوں میں کچھ ایسے افراد بھی شامل ہوگئے تھے جن کے تعلق بڑے بڑے گھرانوں سے تھا اور اس کوٹھے کی دھوم مچتی جارہی تھی۔ابھی تک شاہ جہاں بیگم نے کوئی پرائیویٹ محفل نہیں قبول کی تھی اور کوٹھے پر ہی اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھیں۔کبھی کبھی انہیں بلاوے بھی آجاتے۔ایسے لمحات میں وہ کسی نہ کسی بہانے سے معذرت کرلیتی تھیں۔یوں یہ کاروبار چلتا رہا۔اچھے اچھے لوگ آنے لگے تھے اور دولت بٹورنے کا فن شاہ جہاں بیگم اچھی طرح جانتی تھیں۔ممتاز اور نور جہاں تو اس ماحول کی عادی تھیں چنانچہ انہوں نے بھی اپنے رنگوں میں نئی نئی تبدیلیاں کیں اور یوں سلطانہ کا خواب پورا ہوتا نظر آنے لگا۔سلطانہ نے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جو اس کے لیے معاون ہوسکتے تھے اور پھر ایک دن اس نے اپنے پروگرام کے ایک مرحلے کی تکمیل کرلی۔شہر کے ایک بڑے اچھے علاقے میں اس نے ایک وسیع اور خوبصورت مکان خریدا تھا جو لاکھوں روپے کی مالیت کا تھا اور اس مکان میں بے شمار کمرے وغیرہ تھے۔اس مکان کے سودے کی تکمیل کر کے سلطانہ بے حد خوش نظر آرہی تھی۔وہ دن میں

شاہ جہاں بیگم' نور جہاں اور ممتاز کو وہاں لے گئی اور اس کے بعد اس نے اس کوٹھی کا معائنہ ان لوگوں کو کرایا۔ سلطانہ کے کسی مسئلے میں شاہ جہاں بیگم کوئی دخل نہیں دیتی تھیں۔ انہوں نے کوٹھی کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور بولیں۔

"مگر سلطانہ تم نے یہ شریفوں کے علاقے میں کوٹھی خرید لی ہے؟"

"ماں یہ کوٹھی میرے آپ کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ میرے مقصد کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔ یہاں کافی کمرے ہیں اور ان کمروں میں ایسی بربادلڑکیاں آ کر قیام کریں گی جن کے سہارے چھن چکے ہوں گے۔ ابھی تو یہ میرے مشن کی پہلی سیڑھی ہے۔ میں اس آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے دیکھے گا کیا کیا کچھ کر کے دکھاؤں گی۔"

"لیکن سلطانہ اتنے ذرائع کہاں ہیں ہمارے پاس؟"

"ذرائع تو امی پیدا کرنے سے ہوتے ہیں۔ آپ میرے اس مقصد سے بددل تو نہیں ہیں؟"

"خدا کی قسم سلطانہ میں تو اپنے آپ کو تیرے وجود کا ہی حصہ سمجھتی ہوں۔ جو کچھ تو کر رہی ہے یوں سمجھ لے اس میں میرا رواں رواں شریک ہے۔ بس میں تیرے ذہن کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ میں نہیں جانتی کہ تو کس طرح اور کس انداز میں کیا کرنا چاہتی ہے؟"

"اماں دیکھتی رہو ایک دن ایسا آئے گا جب تم نور جہاں اور ممتاز میرے اس کیے کو داد دو گی۔"

"ہم تو ابھی سے تیرے اس کیے کی داد دیتے ہیں۔ کم از کم تو نے ایک ٹھکانہ تو منتخب کر لیا۔ یقین کرو کوٹھوں پر ایسی بہار دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا واسطہ ایسے برے لوگوں سے بھی نہیں پڑا جو ہمیں پریشان کرتے لیکن سلطانہ یہ آغاز ہے۔ ہمیں ہر مسئلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"اماں تم فکر مت کرو جو کچھ میں کرتی رہوں بس اس میں خاموشی سے میرا ساتھ دیتی رہو۔ میں کبھی کسی مرحلے پر تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔" کوٹھی کی خریداری سے۔ سلطانہ بہت خوش تھی اس نے اس کوٹھی کو سجانا شروع کر دیا اور اب اس کی کافی توجہ یہاں صرف

ہو جاتی۔ کوٹھوں پر جب دن سو رہے ہوتے سلطانہ جاگ رہی ہوتی اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے نکل پڑتی۔ نہ جانے کیا کیا سرگردانیاں کر رہی تھی وہ۔ ایک انوکھا سودا سمایا ہوا تھا اس کے دل میں اور اس دوران ابھی تک اس کے راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں آئی تھی جو اس کے عزم کو کسی طرح زخمی کر دیتی یوں وہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔

◇◇◇

شمشو اور کبیر اللہ کے درمیان گہری دوستی ہو گئی تھی۔ کبیر اللہ مست مولیٰ قسم کا نوجوان تھا۔ ہر چھوٹی سی چیز سے متاثر ہو جانے والا۔ شمشو کی داستان نے اسے بہت متاثر کیا تھا اور اس نے بہت محبت سے شمشو کو گلے لگا کر کہا تھا۔

"فکر مت کرو پیارے شمشو ہم دونوں بھائی بھائی ہیں۔"

شمشو کو ان باتوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ پروفیسر حشمت اللہ جیسا آدمی اسے مل گیا تھا۔ ذرا اس کی تقدیر بدل گئی تھی اور اب اس نے کبوتروں کا نیا ڈربہ بنانا بھی شروع کر دیا تھا۔ کماؤ پوت تھا۔ نصرت بیگ بھی اس کے آڑے نہ آ سکے۔ مہینے کی پوری کی پوری تنخواہ لے جا کر باپ کے ہاتھ پر رکھی تھی اور نصرت بیگ کافی دیر تک ان نوٹوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے رہے تھے پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"شمشو میری ناک نہ کٹوا دینا۔"

"اماں ابا کو سمجھاؤ نوکری چھوڑ کر گھر آ بیٹھوں گا' قسم اللہ کی تب پتا چلے گا۔ میں کہتا ہوں کیا اس صورت میں چوراچکا اٹھائی گیر لگتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا یہ بات نہیں ہے۔ حیرت اس بات پر ہے تم جیسے گدھے کو بھی نوکری دینے والے مل گئے۔ خیر اللہ کی مرضی اللہ پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ تم پر تو کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

"ہنہ' بھروسہ نہیں ہے۔ نہ کرو بھروسہ ان نوٹوں پر تو بھروسہ کر لو۔" شمشو نے اکڑ کر کہا اور نصرت بیگ اسے گھورنے لگے۔

"اب نہیں چلے گی قسم اللہ کی ابا' دن بھر محنت کرتا ہوں پروفیسر کی لیبائی میں۔ میرا

مطلب ہے تجربہ گاہ میں، اس کے بعد خون پسینے کی کمائی لے کر آتا ہوں۔“

”اے میں کہتی ہوں اگر تمہیں اتنا ہی شبہ ہے تو جا کر پروفیسر حشمت اللہ سے مل لو ناں خود معلوم کرلو۔“

”ہاں...... ہاں میں نے کب منع کیا ہے؟ ضرور معلوم کرلو اور میری بے عزتی خراب کردو۔“ شمشو نے کہا۔

اس دن بھی جب وہ صبح ہی صبح اپنی ڈیوٹی پر پہنچا تو کبیر اللہ تو اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں تھا۔ پروفیسر حشمت اللہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تجربہ گاہ میں ہیں۔ چنانچہ شمشو تجربہ گاہ میں داخل ہوگیا۔ پروفیسر حشمت اللہ مغموم بیٹھے ہوئے تھے۔ شمشو کو دیکھ کر انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔ لیبارٹری کی تمام بھٹیاں بجھی ہوئی تھیں۔ سارا سامان تتر بتر پڑا ہوا تھا۔ شمشو نے اس ماحول کو دیکھا۔ پروفیسر کو سلام کیا اور پروفیسر نے انگلی سے اسے اشارہ کردیا۔

”بیٹھو شمشاد بیگ۔“ وہ مضمحل لہجے میں بولے۔

”اماں کیا ہوگیا چچا جان۔ مم میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب؟“ شمشو نے کبھی پروفیسر کا صحیح نام نہیں لیا تھا لیکن آج پروفیسر بگڑنے کے بجائے مغموم نگاہوں سے شمشو کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

”شمشو مجھے اپنے اس تجربے میں ناکامی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے سونا بنانے کا چکر ختم کردیا جائے۔ صحیح نسخہ دستیاب نہیں ہوگا۔“

”پروفیسر صاحب درحقیقت سونا تو انسان کے اپنے بازوؤں میں ہوتا ہے۔ بازوؤں سے محنت کی جائے تو سونا ہی سونا ہے۔ یہ بات کسی بزرگ نے بتائی تھی مجھے۔“ پروفیسر حشمت اللہ مغموم انداز میں گردن ہلاتے رہے پھر بولے۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ مگر میرے بازو اس قابل نہیں ہیں کہ سونا بنا سکیں۔“

”اے تو چچا جان، میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب بناؤ گے کیا اتنے سارے سونے کا؟ کیا نہیں ہے تمہارے پاس؟“ پروفیسر آج عجیب وغریب کیفیت کا شکار تھے۔ شمشو کی بات کا برا نہیں مان رہے تھے۔ مغموم لہجے میں بولے۔

”تم نہیں سمجھو گے شمشو۔ تم نہیں سمجھو گے اس سے میری زندگی کی ایک دیرینہ داستان وابستہ ہے خیر چھوڑو میں تمہاری رائے چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے سونا بنانے کا خیال ترک کر کے لیبارٹری میں کسی نئے پروجیکٹ کی تیاری کی جائے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

”مگر فارمولا، کوئی فارمولا تو ہاتھ لگے۔“

”فارمولا آسمان سے تو نہیں برستے چچا میاں۔ میرا مطلب ہے پروفیسر صاحب، فارمولے تلاش کرنا ہوں گے۔“ پروفیسر نے چونک کر شمشو کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سنسنی کے آثار پھیلتے جارہے تھے پھر انہوں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

واقعی شمشو تم نے مجھے روشنی دکھائی ہے۔ فارمولے آسمان سے نہیں برستے تلاش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ہم یہ فارمولے کہاں تلاش کریں؟“

”سڑکوں پر، گلیوں میں، بازاروں میں۔“

”نہیں یہ چیزیں سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں نہیں ملتیں۔ ہمیں تھوڑا سا تجزیہ کرنا ہوگا۔ آوارہ گردی کرنا ہوگی اور کوئی فارمولا تلاش کرنا ہوگا۔ بہترین آئیڈیا ہے کیا خیال ہے کل سے اس پر کام کیا جائے؟“

”مگر فارمولے کہاں تلاش کیے جائیں پروفیسر صاحب؟“

”میں اس سلسلے میں ایک سروے کروں گا۔ تمہیں بھی کل سے یہی کام کرنا ہے۔“

”سروے کیسے کیا جائے گا؟“

”بس یونہی آوارہ گردی انسانوں کا تجزیہ۔ حالات کا تجزیہ سائنسی تجربہ گاہوں کے آس پاس چکر لگانا ہوں گے۔ شہر گردی کرنا ہوگی۔ یقیناً کوئی نہ کوئی فارمولا ہمارے ہاتھ لگ جائے گا۔“

”سروے...... سروے؟“ شمشاد بیگ نے کہا۔

”ہاں بالکل۔“

”مگر پروفیسر صاحب اس کے لیے تو آپ کو کنوینس الاؤنس بھی دینا پڑے گا آپ کو۔“

"تو پھر کل سے سروے چلو۔"

"ہاں بالکل...... بالکل، ہم لوگ الگ الگ نکلا کریں گے۔" شمشاد بیگ مطمئن ہو گیا اور اس دن کے سروے کی رقم وصول کر کے گھر پہنچ گیا۔ نصرت بیگ اور بیگم صاحبہ تو اب شمشاد بیگ کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ہر طرح سے اس کی خاطر مدارت ہوتی تھی۔ بہرطور دوسرے دن سروے کا پروگرام تھا۔ چنانچہ دوپہر تک وہ مختلف سڑکوں، گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ فارمولے سڑکوں پر پڑے تو نہیں مل جاتے اور پھر وہ تو جانتا بھی نہیں تھا کہ فارمولے ہوتے کیا ہیں؟ ڈھائی بجے کے قریب کوٹھی واپس پہنچا تو پروفیسر واپس نہیں آئے تھے۔

شمشاد بیگ اپنے کام کی انجام دہی کے بعد واپس گھر آ گیا۔ کبوتروں کے ڈربے تیار ہو کر آ گئے تھے اور نصرت بیگ ان پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔

"یہ ڈربے کیوں آئے ہیں؟" انہوں نے شمشاد بیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو ابا قسم اللہ کی بڑے قیمتی ہیں، بہت پیسے خرچ کر کے بنوائے ہیں۔"

"اور اس کے بعد پھر وہی کبوتر بازی شروع ہو جائے گی؟"

"نہیں ابا کبوتروں کو جاسوسی کے لیے استعمال کروں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے آپ یوں سمجھ لو کہ یہ کاروباری کبوتر ہیں۔"

"کاروباری کبوتر۔"

"ہاں جی میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب کا یہی مشورہ تھا۔"

"تو پھر پروفیسر صاحب کبوتر اپنے گھر میں کیوں نہیں پال لیتے؟"

"اماں سمجھاؤ ابا کو یہ تو ہر بات میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ تنخواہ دے رہا ہوں میں تمہیں، لو یہ اوورٹائم بھی رکھو۔" شمشاد نے بیس روپے نکال کر ماں کو دیتے ہوئے کہا۔

"ہیں اوورٹائم بھی شروع ہو گیا؟"

"ہاں کبوتر پالنے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال بھی کرنی ہے اور ان کے ذریعے جاسوسی کرنی ہے۔ کیا سمجھے ابا اب یہ فرسودہ نظام نہیں چلے گا۔ تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے لیکن اپنے

لیے کچھ نہ کر سکو گے۔ میں زمانہ جدید کا ہیرو ہوں قسم اللہ کی، دیکھنا عالیشان محل نہ بنوا دوں تمہارے لیے تو میرا نام بھی شمشاد بیگ عرف شمشو نہیں ہے۔"

"کچھ کھسک گیا ہے۔ عالیشان محل بنوائے گا۔"

"ابا تم میرے سنہرے مستقبل پر لات مار رہے ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم خاموشی سے میری کارکردگی دیکھو۔ ایک دن وہ ہو گا جب میں تمہارا نام فخر سے اونچا کر دوں گا۔"

"ہاں بیٹا اخبار میں تصویر چھپے گی تمہاری۔"

"بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے اخبار میں میری تصویر نہ چھپے تو میرا نام شمشو نہیں ہے۔"

"نہیں...... نہیں مجھے یقین ہے کوئی جرم کرتے پکڑے جاؤ گے سر پر تولیہ ڈالے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنے پولیس کے بیچ کھڑے ہو گے۔" نصرت بیگ نے کہا اور شمشاد کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"دیکھا اماں یہ ہیں منصوبے ابا کے میرے بارے میں۔ اے اماں انہی سے شادی کرنا رہ گئی تھی تمہیں، کوئی اور نہیں مل سکا تھا تمہیں، بھری دنیا میں کوئی ڈھنگ کا ابا لاتیں تو اپنا بھی کام چل جاتا۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔" نصرت بیگ نے پیر سے جوتا نکالا اور شمشو نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔ منہ سے واقعی غلط بات نکل گئی تھی۔

◇◇◇

شاہ جہاں بیگم نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ پرانی تجربہ کار تھیں۔ کوٹھا آباد ہوا تو انہوں نے وہی تمام گر آزمانے شروع کر دیئے جو کوٹھوں کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ کام کے لوگوں کو تاکا گیا اور ان سے شناسائی کی جانے لگی۔ اب شاہ جہاں بیگم کے دوستوں میں بڑے بڑے اعلیٰ عہدیدار بھی تھے۔ پولیس کے افسران بھی تھے اور بے شمار لوگ تھے جو ان کے ضروری مسائل میں ان کا ساتھ دے سکیں۔ یوں کوٹھے کی رونق دوبالا ہوتی چلی گئی۔ کچھ ایسے لوگوں کو بھی مخصوص کر لیا گیا تھا جو بگڑے ہوئے دماغوں

کودرست کریں اوران لوگوں پر اچھے خاصے اخراجات ہوجاتے تھے۔سلطانہ ان کے تجربے سے فائدہ اٹھارہی تھی اور خود بھی تجربہ کار بنتی جارہی تھی۔شام ہوتی تو کوٹھے سج جاتے اور مہمانوں کی آمد شروع ہوجاتی۔اس کوٹھے نے رفتہ رفتہ کافی شہرت حاصل کرلی۔سب سے خاص بات یہ تھی کہ یہاں صرف رقص وموسیقی کے متوالے آتے تھے جس نے ان حدود کو عبور کرنے کی کوشش کی اس سے نہایت متانت اور محبت کے ساتھ معذرت کرلی گئی۔یہ چیز بھی کچھ دن کے بعد خاصی اہمیت اختیار کرگئی تھی اور کوٹھے پر صرف منتخب لوگ آتے جاتے تھے اور ان منتخب لوگوں سے بڑی چابکدستی کے ساتھ دولت گھسیٹی جارہی تھی۔سلطانہ اپنے پروگرام پر قدم بقدم عمل کررہی تھی لیکن ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں ہوا تھا جو سلطانہ کے مقصد سے مطابقت رکھتا ہو۔ویسے اس کے اپنے انتظامات تقریباً مکمل ہوچکے تھے اور اب اسے اپنے کام کا آغاز کا انتظار تھا۔اس شام بھی کوٹھے کی رونق جوں کی توں تھی۔قرب وجوار میں موسیقی کا آغاز ہوچکا تھا۔سب ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔خاص طور سے اس رشتے سے کہ روشن تارا' نواب جان اور چاندنی بیگم ہی کے شہر سے تعلق رکھتی تھیں۔چنانچہ ان چاروں کے کوٹھوں پر ضرورت سے زیادہ ہی یگانگت تھی اور سبھی ایک دوسرے کے کام آتے تھے لیکن سلطانہ کے مقصد کا کوئی پرچار نہیں ہوا تھا اور سلطانہ نے سختی سے اس بات کی ہدایت کردی تھی شاہ جہاں بیگم کو کہ جو کچھ دل میں ہے' اسے دل ہی میں رہنے دیا جائے۔اس سے باہر نکلنا کچھ مناسب نہیں ہے۔کچھ دلچسپ واقعات بھی اس دوران پیش آچکے تھے۔مثلاً ایک دن طاہر علی صاحب یہاں اپنے چند دوستوں کے ساتھ پہنچ گئے اور یہاں آنے کے بعد ان کی حالت کافی غیر ہوگئی۔شاہ جہاں بیگم نے انہیں پہچان لیا تھا اور انہیں بڑے اہتمام کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا۔طاہر علی تھوڑی دیر تک تو شاہ جہاں بیگم کو نہ پہچان پائے لیکن جب انہوں نے پہچانا تو دم بخود رہ گئے۔

''آپ......آپ یہاں؟مم......میرا مطلب ہے......''

''کہیے طاہر علی صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے؟''شاہ جہاں بیگم کا لہجہ آج بدلا ہوا تھا۔

''بخدا آپ تو بالکل ہی تبدیل ہوگئیں۔وہاں اس جگہ آپ اپنے آپ کو برباد کر رہی تھیں۔''

''ہاں خدا آپ کو آباد رکھے طاہر علی صاحب' آپ نے ہمیں پھر سے آباد کردیا۔''

شاہ جہاں بیگم کے الفاظ میں اتنا طنز تھا کہ طاہر علی تلملا کر رہ گئے۔چند لمحات تک کچھ نہ بول سکے پھر کہنے لگے۔

''اور آپ کے ساتھ وہ لڑکیاں جو تھیں؟''

''سب کی سب یہاں اپنے جادو جگا رہی ہیں۔ابھی تھوڑی دیر کے بعد آپ کی ان سے ملاقات ہوگی۔''

''لیکن بہت جلد آپ نے ایک عمدہ مقام بنالیا۔میں تو یہاں تعریف سن کر آیا ہوں۔''

''نوازش ہے آپ کی' آپ جیسے کرم فرماؤں کی محبتیں حاصل رہیں تو ابھی تو یہ نام کچھ اور بڑھے گا۔''طاہر علی کو ایک ایک لفظ اپنے اوپر طنز محسوس ہورہا تھا۔شاہ جہاں بیگم نے کہا تھا کہ آپ جیسے کرم فرماؤں کی وجہ سے یہ کوٹھا آباد ہوگیا۔یہ بات طاہر علی کو ایک بدترین گالی محسوس ہوئی تھی۔لیکن بات جس نفاست سے کہی گئی تھی اس کے برا ماننے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔بہرطور جب تک بیٹھے رہے' بے چین رہے اور پھر بھاگ جانے میں عافیت سمجھی۔اس رات خوب قہقہے لگ رہے تھے۔شاہ جہاں بیگم بھی ان قہقہوں میں شریک تھیں۔انہوں نے کہا تھا کہ اب طاہر علی شاید ہی اس سمت کا رخ کرسکیں۔بہرطور بھی تو لاتعداد ایسے واقعات رونما ہونے تھے اور آج کی شام اسی سلسلے میں ایک اہم واقعے کی رونمائی کا درجہ رکھتی تھی۔اس وقت کئی مہمان آچکے تھے جب ایک صاحب اپنے تین دوستوں کے ہمراہ تشریف لائے' عمدہ لباس میں ملبوس چہرہ مہرہ تروتازہ' شخصیت بھی اچھی خاصی سلطانہ اس دوران یہاں نہیں آئی تھی۔ممتاز اور نور جہاں تھیں اور شاہ جہاں بیگم معمول کے مطابق مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھیں۔آنے والوں کو انہوں نے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن پھر دفعتاً ہی ان کی آنکھیں کھل گئیں۔یادداشت کی بری نہ تھیں۔یہ چہرہ بھی ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔حالانکہ ایک آدھ بار ہی دیکھا تھا لیکن اس انداز سے دیکھا تھا کہ بھولنے کا تصور بھی نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔یہ عارض حسین تھا۔سلطانہ کا منگیتر' وہ نوجوان جس نے سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی غلطی کی تھی اور غلطی کا احساس ہوتے ہی اسے بیگم ارباب کے ہاں چھوڑ گیا تھا۔عارض نے شاہ جہاں بیگم' نور جہاں یا ممتاز کو بالکل نہ پہچانا لیکن جب لوگوں کی فرمائش پر سلطانہ نمودار ہوئی تو عارض کے دل پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطانہ کو دیکھتا رہا۔سلطانہ نے فرشی

آداب کیے اور اپنی جگہ دوزانو بیٹھ گئی۔ اس نے ابھی تک عارض کو نہیں دیکھا تھا۔ شاہ جہاں بیگم سے البتہ برداشت نہ ہوسکا۔ چنانچہ انہوں نے جھک کر سلطانہ کے کان میں عارض کے بارے میں تفصیلات بتائیں اور سلطانہ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو امی اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ یہاں تو سب مہمان ہیں جو بھی آئے۔'' سلطانہ نے عارض کی طرف دیکھنے کوشش نہیں کی تھی۔ شاہ جہاں بیگم ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئیں۔ عارض چہکتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ آیا تھا لیکن اب جیسے اس پر بجلی سی گر پڑی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح سلطانہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جس کا رنگ وروپ حسن و جوانی پہلے سے ہزار گنا نکھر گئی تھی۔ یہ حسن جہاں سوز دیکھ کر عارض کو اپنے دل میں درد محسوس ہونے لگا۔ وہ تو اس کے آنگن کا پھول تھا۔ یہ تو اس کی عزت تھی۔ اس کے گھر کی روشنی جواب یہاں بالاخانے پر جگمگا رہی تھی۔

رات گزرتی رہی۔ تماش بین ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے مگر عارض سر جھکائے کسی بت کی طرح خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ سلطانہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ حتیٰ کہ آخری تماش بین بھی اٹھ کر چلا گیا۔

''اے میاں کیا آپ رات یہیں گزاریں گے؟'' شاہ جہاں بیگم نے ٹھیٹ نائیکاؤں کے انداز میں ہاتھ نچا کر کہا۔ ''میاں ہم سُر تال بیچتے ہیں جسم نہیں۔ محفل تمام ہوئی اب چلتے بنو۔''

''وہ...... وہ سلطانہ۔'' عارض نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں سلطانہ ہمارے کوٹھے کا ہیرا ہے ہیرا۔''

''میں...... میں اسے اس انداز میں نہیں دیکھ سکتا۔'' عارض کا سر ابھی بھی جھکا ہوا تھا۔

''کیوں حالانکہ تم شریف زادے عورت کے اسی رنگ اسی انداز سے مرغوب ہوتے ہو۔ جب اسے تمہارے سہارے کی ضرورت تھی تو تم نے اسے ٹھکرا دیا۔ اب وہ تم جیسے سینکڑوں خاندانی لوگوں کو انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ تو تم گڑگڑانے لگے۔'' شاہ جہاں بیگم آگ اگل رہی تھی۔ جب کہ سلطانہ وہاں سے ہٹ چکی تھی اور اپنے کمرے میں بستر پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی نور جہاں ممتاز بھی آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دلاسہ دے رہی تھیں۔ سلطانہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عارض سے یوں سامنا ہو جائے گا۔

''میں سلطانہ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔'' عارض ایک دم جوش میں آ کر بولا۔ ''وہ کسی حال میں یہاں نہیں رہے گی۔''

''دھیرج میاں...... دھیرج۔'' شاہ جہاں بیگم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''وہ کسی کی رکھیل نہیں بننا چاہتی۔''

''میں اسے رکھیل نہیں بنانا چاہتا وہ ہمارے خاندان کی عزت ہے۔'' عارض رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''تو کیا طوائف کو بیوی بناؤ گے؟''

''بکواس نہ کرو۔ وہ طوائف نہیں۔'' عارض غصے سے سرخ ہوتے ہوئے بولا۔

''میاں طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہاری حویلی نہیں طوائف کا کوٹھا ہے۔''

''میں اسے لے کر جاؤں گا۔'' اسے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔'' عارض کا لہجہ فیصلہ کن تھا اس کے انداز میں نہ جانے کیا کیا بات تھی کہ شاہ جہاں بیگم ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ اس نے غور سے عارض کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر گویا ہوئی۔

''میاں تم اسے یہاں سے لے جا سکتے ہو۔ مگر ہماری ایک شرط ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولی۔

''کیا شرط ہے؟'' عارض چونک کر بولا۔ ''تمہیں رقم چاہیے ہوگی، بولو تم کیا قیمت لگاتی ہو۔ میں تمہیں منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔''

''میاں میں طوائف کے علاوہ ماں بھی ہوں اور ماں کبھی اپنی بیٹیوں کا سودا نہیں کرتی۔ پھر ماں کیا ہوتی ہے یہ میں نے سلطانہ سے ہی سیکھا ہے۔'' شاہ جہاں بیگم جو ایک لمحے قبل تجربہ کار نائکہ کے انداز میں گفتگو کر رہی تھی اچانک رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہہ رہے تھے۔

ہماری شرط پیسہ نہیں، اگر تم سلطانہ کو لے جانا چاہتے ہو تو کل شام پانچ بجے تک باقاعدہ بارات لے کر آؤ اپنے خاندان اور شہر کے شرفاء کے ساتھ اگر تم نہیں آئے تو پھر......''

یہ کہہ کر شاہ جہاں بیگم خاموش ہوگئی۔

''ٹھیک ہے۔'' عارض ایک عزم کے ساتھ بولا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

شاہ جہاں دیر تک وہیں بیٹھی دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک انوکھی مسکراہٹ تھی۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سلطانہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

شاہ جہاں بیگم دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے اٹھیں اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی سلطانہ کے قریب پہنچ گئیں۔

"اماں......" سلطانہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب تم کچھ نہیں بولو گی۔" شاہ جہاں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ "جب تم نے ماں کہا ہے تو مجھے ماں کا فرض ادا کرنے دو اور خاموشی سے جا کر سو جاؤ۔"

دوسرا دن خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ شاہ جہاں بیگم صبح ہی سے غائب تھی۔ دوپہر میں لوٹی تو ٹرک بھر کر سامان اس کے ہمراہ تھا۔ ایک سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی نور جہاں اور ممتاز کو آواز دی اور سوٹ کیس ان کو تھماتے ہوئے تحکمانہ انداز میں انہیں سلطانہ کو تیار کرنے کا کہا۔

"اماں تم......" سلطانہ نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا۔

"بس اب تم کچھ نہیں بولو گی۔ میں نے ہمیشہ تمہاری بات مانی ہے۔ اب صرف میرا حکم چلے گا۔" یہ کہہ کر شاہ جہاں بیگم نے رخ پھیر لیا۔ سلطانہ یہ نہ دیکھ سکی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

ابھی سہ پہر نہیں ڈھلی تھی کہ گلی میں شامیانے بھی لگ گئے اور پھر ٹھیک پانچ بجتے ہی فضا میں بینڈ کی آواز گونج اٹھی۔ نور جہاں اور ممتاز نے سلطانہ کو باقاعدہ دلہن بنا دیا تھا۔ نکاح خواں کو عارض اپنے ہمراہ لایا تھا اور بارات میں شہر کے شرفاء کی بڑی تعداد تھی۔ عارض نے انہیں کیا کہا تھا شاہ جہاں بیگم کو اس سے کوئی غرض نہ تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے نکاح ہوا اور رخصتی کی گھڑی آن پہنچی۔ سلطانہ، ممتاز اور نور جہاں کے گلے لگ کے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ پھر جونہی شاہ جہاں بیگم کمرے میں داخل ہوئی تو سلطانہ چیخ مار کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

"بس بیٹی نہ رو۔ ہماری جدوجہد تیرے سامنے ہے ہم نے عزت کی روٹی کے لیے

کیا کیا نہ پاپڑ بیلے مگر......" یہ کہہ کر شاہ جہاں بیگم کی آواز بھرا گئی۔ "مگر تو کیوں زندگی تباہ کرتی ہے جا بیٹا تیری یہ منزل نہیں۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تیری دی ہوئی روشنی میں ایک بار پھر اس گہری کھائی سے نکلنے کی جدوجہد کروں گی مگر تو اب یہاں سے جا، بہت دور چلی جا۔" یہ کہہ کر شاہ جہاں بیگم بلک بلک کر رو رہی تھی۔

شام ڈھلے بارات رخصت ہو گئی۔ شاہ جہاں بیگم نے بساط سے زیادہ جہیز دیا تھا اور یوں رخصت کیا تھا جیسے واقعی سلطانہ اس کی سگی بیٹی ہو۔

شمشاد بیگ عرف شمشو، پروفیسر صاحب کے خرچ پر اب آوارہ گردی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کبوتروں کا دھندا بھی شروع کر دیا تھا۔ گھر میں رقم دینے کے باعث اب ابا کی ڈانٹ ڈپٹ میں بھی کسی قدر کمی آ گئی تھی۔

اس روز بھی وہ کسی فارمولے کی تلاش میں ناکامی کے بعد کبوتروں کا جوڑا لیے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس نے خلاف توقع مرزا نصرت بیگ کو وقت سے پہلے ہی گھر میں بیٹھے ہوئے دیکھا اس کا ماتھا ٹھنکا مگر یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ ان کا موڈ خوشگوار ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط دبا ہوا تھا۔

"ابا خیریت تو ہے۔ یہ خط کس کا آ گیا؟" شمشو نے چہرے پر سنجیدگی لانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ جب سے اسے پروفیسر کی لیبارٹری میں نوکری ملی تھی اس کی کوشش ہوتی تھی کہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر سنجیدگی ہو۔ یہ الگ بات تھی کہ سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے اس کا چہرہ مزید مضحکہ خیز ہو جاتا تھا۔

"ارے بیٹا تمہارے چچا ریاضت بیگ کا خط ہے کراچی سے۔" اماں نے پیار سے کہا۔

"اچھا آج ان کے پیٹ میں ہماری یاد کا درد کیوں اٹھا ہے؟"

"ابے چپ خبیث۔" شرافت بیگ دہاڑ کر بولے۔ "چل جلدی سے سامان سمیٹنے میں ہاتھ بٹا۔"

"وہ کیوں؟" شمشو حیرت سے بولا

"ارے بیٹا آج ہمیں کراچی جانا ہے تیرے چچا نے کورنگی میں ہمارے لیے پکے کوارٹر کا بندوبست کیا ہے۔" اماں نے خوشی سے بتایا۔

''مگر اماں میری نوکری اور جاسوس کبوتر......''

''بکواس نہیں ۔ بھاڑ میں گئی تیری نوکری اور کبوتر چل تیاری کر۔'' نصرت بیگ چلا کر بولے تھے۔

شمشو کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ نوکری کی تو فکر اسے نہیں تھی مگر کبوتروں اور اپنے عشق کی بربادی کا غم اسے دہلائے دے رہا تھا۔ اماں نے نصرت بیگ کو ایک طرف لے جا کر نہ جانے کان میں کیا کہا کہ وہ سر ہلانے لگے اور پھر بولے۔

''چل اپنے کبوتر بھی ساتھ لے لے۔''

شمشو چونک کر اپنے باپ کو یوں دیکھنے لگا جیسے ان کے سر پر سینگ اگ آئے ہوں۔

کراچی کا ماحول لاہور سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں ہر آدمی بس کام کا کام اور کام کے چکر میں بھاگ رہا تھا۔ کورنگی حکومت نے بھارت سے آئے ہوئے مہاجروں کے لیے آباد کی تھی۔ شہر سے دور یہ آبادی خاصی صاف ستھری تھی۔ نصرت بیگ نے بھی یہاں آتے ہی اپنے آبائی پیشے کو دوبارہ زندہ کر لیا تھا اور گھر کے ایک حصے میں کارخانہ کھول لیا تھا اور شمشو کو بھی سمجھا بجھا کر اس نئے کام پر لگا لیا تھا۔ البتہ کبوتر بازی کی اسے اجازت مل گئی تھی۔

چند ماہ بعد ہی اس کی شادی ریاضت چچا کی بیٹی نیک پروین سے ہو گئی۔ نیک پروین نے گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی نیکی سے شمشو کو خاصا کام کا آدمی بنا دیا تھا۔ مگر کبوتر بازی کا شوق وہ بھی نہ چھڑا سکی تھی۔ البتہ اس نے اسے یکے بعد دیگرے چھ بیٹوں کا باپ ضرور بنا دیا تھا۔

قارئین کرام نصرت بیگ اور اس کی اہلیہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ البتہ آج بھی اگر آپ کا گزر کبھی کورنگی چار نمبر سے ہو تو آپ 80 سالہ استاد شمشو مرزا کو ہوٹل میں یا پلیا پر اپنے شاگردوں کے ہمراہ بیٹھے ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ جو لوگوں کو کبوتر بازی پر لیکچر دے رہا ہوگا۔

رہی بات سلطانہ کی تو وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی البتہ اس کی بیٹی آج ایک بڑے سرمایہ دار کی بیٹی ہے اور نور جہاں اور ممتاز نے بھی شوبز چھوڑ کر بڑے زمینداروں اور سیاستدانوں کو اپنے دام میں پھانس لیا تھا۔ آج ممتاز کا ایک داماد قومی اسمبلی کا ایک رکن ہے جب کہ نور جہاں کا داماد ٹیلی ویژن کا ایک نامی گرامی پروڈیوسر ہے مگر ہم ان کا نام آپ کو نہیں بتا سکتے۔

◇◇◇